ضرورتِ توحید

☆ اس عنوان کے دو جزو ہیں "ضرورت اور توحید"۔ یہاں "ضرورت" سے انسان احتیاج مراد ہے اور "توحید" سے توحید خداوندی۔ گویا ہمیں اس وقت یہ سمجھنا ہے کہ انسان وحدانیت خداوندی کو تسلیم کرنے کا محتاج ہے۔

☆ توضیح عنوان کے بعد بحث کے دو بنیادی نکتے متعین ہو کر ہمارے سامنے آ گئے۔

بحث کے دو بنیادی نکتے

۱☆ انسان اور اس کی احتیاج

۲☆ خدائے قدوس اور اس کی وحدانیت

پہلا بنیادی نکتہ

☆ ان دونوں بنیادی نکتوں کو ذہن نشین کرنے کے بعد اصل مقصد بخوبی واضح ہو سکے گا۔ اجزاء بحث کی ترتیب کے لحاظ سے ہم اپنی گفتگو کا آغاز جزو اول سے کرتے ہیں۔

انسان

☆ اس وقت ہمارے سامنے انسان کی حقیقت اور ماہیت نہیں بلکہ اس کا ایسا واضح تصور لانا مقصود ہے جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ہماری بحث کا بنیادی نقطہ قرار پا سکے اور وہ یہ کہ انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے "جسم اور روح"۔

جسم

☆ جسم مرکب ہے اور اس کے اجزاء عناصر اربعہ ہیں۔ اسلئے عالم اسباب میں وہ اپنی ورثی اور بقا کیلئے عناصر اور ان کے مرکبات کا ہی محتاج ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ امر محتاجِ بیاں نہیں کہ انسان کی تمام حاجات بدنیہ عالم عناصر و موالید میں منحصر ہیں لیکن روح بسیط ہے اور اس کا تعلق براہِ راست بارگاہِ قدس سے ہے۔ لہٰذا اس کی حاجات کا مرکز بھی بارگاہِ قدس ہی ہو سکتی ہے۔ اب ان حاجات پر غور کیجئے۔

روح

☆ روح کی سب سے پہلی اور بنیادی حاجت قربِ خداوندی اور وصول الی اللہ ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے مظاہر میں سب اعلیٰ مظہر ہے اور اس کی اصل فطرت میں خدا کی معرفت کا جوہر لطیف موجود ہے۔

جوہر انس

☆ عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح و نفوس بنی آدم کو جمع کر کے فرمایا "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" (کیا میں تمہارا رب نہیں؟) سب نے جواب دیا "بَلٰی" (کیوں نہیں تو ضرور ہمارا رب ہے) ہر ایک کا بلا تامل اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ معرفت الٰہیہ کا جوہر مقدس بلا استثنا ہر ایک کے اندر موجود تھا۔ ادنیٰ تامل سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ یہی جوہر ارواح بنی آدم میں انس کا مبداء ہے جس کی وجہ سے انسان کو انسان کہا جاتا ہے۔

مقالات کاظمی جلد 1	صفحہ نمبر
ضرورت توحید	1
ضرورت نبوت	11
میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم	15
وما ارسلنک الا رحمتہ للعلمین	49
اسری اور معراج	53
ختم نبوت	116
تعارف حدیث	121
جامع الترمذی	139
اسلام اور عیسائیت	155
اسلام اور اشتراکیت	163
سائنس و مذہب	170
قرآن اور آسمان	175
سنہری زندگی	183
تعلیم میں دینی مدارس کا حصہ اور انکہ افادیت	191
فتوی حنفی	195
اسلامی معاشرے میں طلبہ کا کردار	198
فلسفہ قرآنی	206
کتاب التراویح	223

تلاشِ رب

☆ اللہ تعالیٰ کی محبت اورانس کے اس لطیف جذبہ کو لئے ہوئے جب روحِ انسانی اس بارگاہِ قدس سے اس عالم اجسام میں آئی تو اس کا وہ جذبہ ابھرا اوراس نے اسی کو تلاش کیا جس کی ربوبیت کا اقرار کر کے آئی تھی۔

جذبہ

☆ جذبہ محبت ایسی چیز ہے کہ جب تک لقاء محبوب نہ ہو محب کو اطمینان نہیں ہونے دیتا۔ جس طرح بھوک پیاس کی حالت میں کھانا اور پانی ملے بغیر آدمی کو چین نہیں آتا اسی طرح روحِ انسانی کو بھی بارگاہِ ربوبیت میں رسائی کے سوا کسی حال میں سکون نہیں ملتا۔ روحِ انسانی اسی عالم میں دیوانہ وار خالق کائنات کی تلاش میں اٹھی۔ مگر افسوس! ارواحِ سعداء کے سوا ہر روح نے ٹھوکر کھائی اور ذریعہ تلاش غلط ہونے کی وجہ سے رب تعالیٰ سے قریب ہونے کے بجائے دور ہوتی چلی گئی۔

مظاہر کائنات کی پرستش

☆ یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ تغیرات عالم کے پیش نظر ایک مؤثر کے وجود کو تسلیم کرنے پر ایک دہریہ بھی مجبور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجود کائنات کے ساتھ ہر فرد بشر کا ایک طبعی تعلق ہے اور یہی تعلق اس کی فطرت میں تلاشِ حق کے تقاضے کا اصل منشاء ہے۔ اسی کو پورا کرنے کے لئے لوگوں نے مظاہر کائنات کی پرستش کی لیکن جس طرح سراب سے آپ کا تقاضا پورا ہونا ناممکن ہے اسی طرح مظاہر کائنات کی پرستش سے خالق کائنات کی معرفت کے مقتضائے طبعی کی تکمیل ممکن نہیں لہٰذا جس خدائے قدوس نے ہمارے جسمانی تقاضوں اورضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جسمانی اسباب مہیا کئے تھے اسی نے روحانی حاجات ومقتضیات کی تکمیل کے لئے روحانی اسباب کا ایک زبردست اور مضبوط نظام قائم کیا جس کا نام سلسلۂ نبوت ورسالت ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر اختتام پذیر ہوا۔

دوسرا بنیادی نکتہ

☆ اس بیان سے ہماری بحث کا پہلا بنیادی نکتہ ناظرین کرام کے ذہن نشین ہو گیا ہوگا۔ اب ہم دوسرے نکتے کی طرف آتے ہیں اوراس کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے اختصار کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام سے قبل لوگوں کے عقائد وجودِ باری اور توحید خداوندی کے بارے میں کیا تھے؟

مسئلہ توحید میں مختلف گروہ

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہماری نظر دہریوں پر پڑتی ہے جو وجودِ خالق کے منکر تھے لیکن دہر کو موثر مانتے تھے۔ قرآن مجید نے ان کے قول کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ" (جاثیہ) چونکہ وجودِ خالق کا انکار جزا وسزا کے انکار کو مستلزم ہے اسلئے یہ گروہ وجودِ خالق کے ساتھ جزا وسزا کا بھی منکر تھا۔

دھریوں کے بعد دوسرے چار گروہ

☆ دوسرا گروہ وہ تھا جو وجودِ خالق کو مانتا تھا لیکن بعث ونشور کا منکر تھا۔ اس کا ذکر بھی قرآن مجید کی متعدد آیات میں وارد ہے۔ یہ سب لوگ نبوت اور رسالت کے منکر تھے۔ ان میں ایک گروہ ایسا بھی پایا جاتا تھا جو فرشتوں اور جنات کے وجود کا قائل تھا اور ایک گروہ انکی پرستش کرتا تھا۔ ایک گروہ وہ جوان کا منکر تھا اور بتوں کی پرستش کرتا تھا۔ عرب کے طاقتور قبائل اصنام پرست تھے۔ ان میں بعض لوگ بت پرستی میں اتنے راسخ تھے کہ صرف حضر میں نہیں بلکہ سفر میں بھی اپنے باطل معبودوں کو ساتھ رکھتے اور ان کی پوجا کرتے تھے۔

مشرکین کا عقیدہ

☆ مشرکین جو امورِ عظام میں اللہ تعالیٰ کو متصرف مانتے تھے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض عبادِ صالحین کو الوہیت عطا فرمادی۔ لہٰذا وہ تمام مخلوق کے معبود ہونے کے مستحق ہو گئے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو وہ اس وقت تک مقبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان عبادِ صالحین کی عبادت کے ساتھ مضموم نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ تو انتہائے بلندی میں ہے اس لئے اس کی مخصوص عبادت بے کار ہے۔ عبادت ان ہی صالحین کی کرنی چاہئے جو اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں تا کہ ان کی برکت سے ہم اللہ تعالیٰ کے مقرب ہو سکیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ہمارے یہ معبود سمیع وبصیر ہیں اور ہماری امداد ونصرت کرتے ہیں۔ انہوں نے ان ہی کے نام پر پتھر گھڑ لئے تھے اور جب وہ اپنے معبودوں کی طرف رُخ کرتے تو اپنی توجہ کا قبلہ ان پتھروں کو بنا لیتے تھے۔ ان کے پیچھے آنے والوں نے اتنا بھی نہ سمجھا کہ ان پتھروں اور انسانوں میں کتنا بڑا فرق ہے اور ان پتھروں ہی کو اپنا معبود بنالیا۔

عرب میں صابی

☆ صابیوں کا بھی ایک گروہ عرب میں پایا جاتا تھا جو کواکب پرست تھا۔ یہ لوگ ستاروں کی معبودیت اور ان کی مؤثریت عظیمہ کے قائل تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کواکب کے لئے نفوس مجردہ عاقلہ ہیں جو انہیں حرکت پر آمادہ رکھتے ہیں اور وہ اپنے عابدوں کی عبادت سے غافل نہیں لہٰذا وہ ان کے نام پر مورتیاں بنا کر پوجتے تھے۔

عرب میں مجوسی

☆ بعض عرب مجوسیوں کی طرف میلان رکھتے تھے کیونکہ ایک عرصہ سے یمن اور عراق میں ایرانیوں کی سلطنت تھی جو مجوس اور آتش پرست تھے۔

عرب میں یہودی و نصاریٰ

☆ عرب میں یہودیوں کا بھی ایک گروہ تھا اور نصرانی بھی بکثرت پائے جاتے تھے۔ یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں اور ان میں سے بعض کا عقیدہ تھا کہ مسیح علیہ السلام ابن اللہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام میں حلول کیا ہے اور بعض تثلیث کے قائل تھے۔

اسلام سے پہلے مکہ میں خدا اور یوم آخر پر ایمان

☆ اسلام سے قبل مکہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لئے ایک رسول مبعوث فرمائے گا مگر ے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔

قرآن مجید میں مشرکین کا رد

☆ وجودِ باری کے متعلق جن لوگوں کو قبل اسلام اہل عرب کے ان عقائد کا علم ہے وہ قرآن مجید کی روشنی میں بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے تمام عقائد باطلہ کا کس خوبی کے ساتھ مصلحانہ انداز میں رد فرمایا اور کمال اختصار و جامعیت کے ساتھ ان جاہلانہ نظریات کی تردید بلیغ فرمائی۔ ہم طوالت کلام سے بچنے کے لئے صرف اشارے پر اکتفا کرتے ہیں۔

مسئلہ توحید محتاج دلیل نہیں

☆ ذاتِ باری اور توحید خداوندی کا مسئلہ ایسا نہ تھا جس کو ثابت کرنے کے لئے استدلال کی ضرورت پیش آتی جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ فطرت انسانی کا اصل مقتضا یہی تھا کہ وہ صانع حقیقی اور معبود برحق کو تسلیم کرنے میں ادنیٰ تامل کو بھی گوارا نہ کرتا لیکن بسا اوقات اصل فطرت کے اپنے حال پر رہنے کے باوجود خارجی اسباب کی بنا پر متعلقاتِ فطرت میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جس طرح ایک تندرست آدمی غلبہ مرض سے مغلوب ہو کر بعض طبعی تقاضوں سے متنفر ہونے لگتا ہے۔ ہم رات دن دیکھتے ہیں کہ مریض کی طبیعت ازالہ مرض کی خواہاں ہوتی ہے۔ اس کے باوجود مریض علاج سے جی چراتا ہے۔ یہ امر واقعی ہے کہ شیرنی طبیعت سلیمہ کو پسند ہے لیکن غلبہ صفراء کی وجہ سے وہ پسندیدہ چیز آدمی کو تلخ محسوس ہونے لگتی ہے۔ علیٰ ہٰذا علم و ادب انسان کی فطری مقتضا ہے لیکن بری صحبت کے اثرات اس طبعی تقاضے سے انسان کو متنفر کر دیتے ہیں۔

دلائل توحید کی حکمت

☆ ارواح منکرین کا بھی یہی حال ہے کہ اس عالم قید و بند میں اگر وہ اپنے ماحول سے ایسی متاثر اور مغلوب ہوئیں کہ ان کا جوہر معرفت جہالت سے تبدیل ہو گیا۔ جو روحیں عالم ارواح میں بلٰی کہہ کر اپنے رب کی ربوبیت کا اقرار کر کے یہاں آئی تھیں وہ اس دنیا میں اس کی نفی پر دلائل سوچنے لگیں اور یقین و معرفت کی دولت سے محروم ہو کر شکوک و شبہات کی ذلت میں مبتلا ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انہیں بھٹکی ہوئی روحوں کے لئے اپنی ذات و صفات اور وحدانیت کے اثبات پر دلائل و براہین قائم فرما کر ان کی اصل فطرت کے تقاضا کو پورا فرمایا۔

دلائل قرآن

☆ غور سے دیکھا جائے تو سارا قرآن دلائل توحید سے بھرپور ہے ان میں بعض آفاقی ہیں جن کا تعلق آفاق عالم سے ہے اور بعض انفسی ہیں جو براہِ راست نفس انسانی سے متعلق ہیں۔ بعض دلائل توحید مخاطبین کی فہم کے لحاظ سے صرف اقناعی ہیں اور بعض قطعی، قرآن مجید کا یہ معجزانہ اندازِ بیان خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ ایک ہی دلیل اقناعی بھی ہے اور برہانِ قطعی بھی۔ انشاء اللہ آگے چل کر ہم ان کی

وضاحت کریں گے۔ سر دست قرآن مجید سے وجودِ باری تعالیٰ پر ایک دلیل نقل کرتے ہیں۔

ہستی باری تعالیٰ پر قرآنی دلیل

☆ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ارشاد فرماتا ہے "اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ (س: ملک، آیت: ۳، ۴)

ترجمہ ☆ "جس نے پیدا کئے سات آسمان تہہ بر تہہ۔ کیا دیکھتا ہے تو رحمٰن کے پیدا کرنے میں کچھ فرق۔ پھر دوبارہ نگاہ کر کہیں نظر آتی ہے تجھے کوئی دراڑ۔ پھر بار بار لوٹا کر دیکھ لوٹ آئے گی تیری طرف تیری نگاہِ درماندہ ہونے کی حالت میں تھک کر"

شکوک و شبہات کا ازالہ

☆ نظام عالم کی جس ہمواری اور ترتیب کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے وہ نہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ اور اس کے صفاتِ کمالیہ علم وقدرت اور صنعت وحکمت ہی کی دلیل ہے بلکہ اس نے منکرین وجود باری کے شکوک وشبہات کا بھی ازالہ کر دیا۔ منکرین وجود باری آج تک یہ کہتے چلے آئے کہ تمام موجودات کا ظہور کسی صانع کے بغیر محض اتفاق طور پر ہو گیا ہے۔ یہ نظم ارتباط جو ہمارے مشاہدے میں آتا ہے محض اتفاقی ہے طور پر ہو گیا ہے۔ یہ نظم وارتباط جو ہمارے مشاہدے میں آتا ہے محض اتفاقی ہے کسی خالق اور صانع کی خلقت اور صنعت کا نتیجہ نہیں۔

تربیتی نظام اتفاقی نہیں ہو سکتا

☆ نفسیاتِ انسانی کے پیش نظر مضمون آیت کے روشنی میں اس کا ازالہ اس طرح ہوتا ہے کہ انسان جب کسی نظام میں ہمواری اور ترتیب کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ طبعًا یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ خود بخود قائم نہیں ہوا بلکہ کسی نے اسے قائم کیا ہے اور جہاں کہیں یہ نظم وضبط مفقود ہو تو انسان سمجھ لیتا ہے کہ یہ ناہمواری اور عدم ارتباط ایک قضیہ اتفاقیہ ہے۔

☆ کوہ وبیابان کا مسافر جب کسی صحرا میں ریت کے ناہموار ٹیلوں سے گزرتا ہے اور کوہستان میں چلتے ہوئے بے ترتیب پڑے ہوئے پتھر اسکے سامنے آتے ہیں تو بے اختیار اسکے ذہن میں یہ تصور آتا ہے کہ محض اتفاقی طور پر ہواؤں کے چلنے کی وجہ سے ناہموار صورت میں یہ ریت کے ٹیلے پیدا ہو گئے ہیں اور یہ پتھر بارشوں کے باعث پہاڑوں سے ٹوٹ کر بے ترتیبی کیساتھ ادھر ادھر آ پڑے ہیں۔

نظام مرتب وجود مرتب کی دلیل ہے

☆ اس کے برخلاف اگر وہ ایک عالی شان عمارت سے گزرے اور اس کی تعمیر بہترین ترتیب پر اسے نظر آئے اور وہ اس میں ہر قسم کے ساز وسامان کو قرینے کے ساتھ دیکھے تو اس کا ذہن ہرگز اس بات کو قبول نہ کرے گا کہ یہ بہترین نظم وترتیب اور ہر چیز کا سلیقے کے ساتھ اپنی جگہ پایا جانا خود بخود ہو گیا ہے اور محض اتفاقی طور پر یہ بہترین عمارت حوادثِ کونیہ کے نتیجے کے طور پر از خود تعمیر ہو گئی ہے اور اس کا ساز وسامان ہواؤں کے چلنے اور بارشوں کے ہونے کی وجہ سے اتفاقی طور پر یہاں پہنچ گیا ہے بلکہ وہ یہی سمجھنے پر مجبور ہو گا کہ اس عالی شان مکان کی تعمیر وتزئین اس کے جملہ لوازمات اور کل ساز وسامان کسی دانشور منتظم کی تنظیم وتعمیر کا نتیجہ ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

☆ اس بیان سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا کہ صحرا، کوہستان اور دیگر مقامات پر جو بے ترتیب اشیاء نظر آتی ہیں اگر انہیں تخلیق ایزدی سے خارج قرار دے کر قضیہ اتفاقیہ کے تحت سمجھ لیا جائے تو غالباً درست ہوگا۔

☆ ازالہ کی توضیح یہ ہے کہ ترتیب کبھی حسی ہوتی ہے کبھی معنوی۔ اگر کہیں حسی ترتیب نہ پائی جائے تو ہم سمجھ لیں گے کہ مرتب محسوس مفقود ہے لیکن اس مقام پر ترتیب معنوی اور اس کے موجود سے ہمارے پاس اس تصور کو کوئی تعلق نہ ہوگا۔ لہٰذا ریت کے بے ترتیب ٹیلوں اور ناہموار پتھروں کو دیکھ کر ہم ان کی بے ترتیبی کو امور اتفاقیہ کے تحت یقیناً لا سکیں گے لیکن ترتیب معنوی کو اس حکم میں شامل کرنا ہرگز درست نہ ہوگا۔ نہ اس کے موجود کی نفی متصور ہو سکے گی بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ بعض اشیاء کی ظاہری بے ترتیبی میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکمت مضمر فرمائی ہے کہ انسان جب اس قسم کی غیر مرتب اشیاء دیکھے گا تو نفسیاتی طور پر اس کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوگا کہ ترتیب کا نہ ہونا مرتب کے نہ ہونے کی علامت ہے جس کا لازمی نتیجہ اور قطعی مفاد یہ ہے کہ انسان ترتیب کو پا کر مرتب کے وجود کو تسلیم کرنے کا داعیہ اپنے باطن میں محسوس کرے گا اور یہ سمجھے گا کہ جس طرح ترتیب حسی مرتب محسوس کے وجود کی دلیل ہے اسی طرح ترتیب معنوی مرتب غیر محسوس کے موجود ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ بے تریب اشیاء بھی عقل مند انسان کے لئے ہستی باری تعالیٰ کی دلیل ہیں اور کیوں نہ ہوں جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہر شے کو اپنی معرفت کی دلیل قرار دیا ہے۔

ترتیب محسوس اور ترتیب معنوی

☆ اس مقام پر اتنی بات کہہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ بعض اشیاء میں جو ظاہری بے ترتیبی پائی جاتی ہے در حقیقت اس کے پس پردہ ایک زبردست ترتیبی نظام موجود ہے۔ کیونکہ بے ترتیبی کا یہ تغیر جن اسباب سے متعلق ہے وہ سب اصول حکمت اور قوانین قدرت کے ماتحت ہیں۔ مثلاً ہواؤں کا چلنا، پانی کا برسنا، موسموں کا بدلنا، شب و روز کا گزرنا، سورج کا نکلنا اور ڈوبنا، چاند کا اپنی منازل کو طے کرنا بہترین و مناسب ترتیب اور مضبوط و مستحکم نظام کے ساتھ ہے اور یہ سب اصول و قوانین اور سارا نظام بجائے خود دلائل قدرت کا ایک وسیع ترین سلسلہ ہے۔ لہٰذا ہر چیز خواہ مرتب نظر آئے یا غیر مرتب اسے وجود باری تعالیٰ کی دلیل سمجھنا فطرت سلیمہ کا مقتضا ہے اور ظاہری بے ترتیبی میں نظم و ترتیب کی بے شمار حقیقتوں کو مضمر جاننا عقل و خرد کے تقاضوں کی تکمیل ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ دلائل معرفت میں غور و تدبر کی تاکید اسی حقیقت پر مبنی ہے۔

نظام عالم پر گہری نظر

☆ مضمون آیت کو اس تفصیل کے ساتھ ذہن نشین کر کے نظام عالم پر گہری نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ وہ کیسا مضبوط نظام ہے۔ جواہر و اعراض کس طرح باہم مربوط ہیں۔ عناصر کا امتزاج کس شان سے ہے۔ موالید ثلاثہ میں کیا تعلق ہے۔ اشیاء عالم کی اوضاع و اشکال، ہیئات و مفاد پر اثرات و خواص اور مختلف اوصاف کو ملاحظہ فرمایئے پھر ان میں ایک خاص قسم کے تناسب پر نظر کیجئے۔ آپ کی ہر نظر

معرفت اور یقین کے ساتھ جواہر اپنے دامن میں لے کر واپس آئے گی۔ بلا تامل آپ کہیں گے کہ یہ سب کچھ خالق کائنات ہی کے علم و حکمت اور قدرت وصنعت کے جلوے ہیں۔

روح و مادہ وجودِ ممکنات کا مبداء نہیں ہو سکتے

☆ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات اور کمالاتِ الوہیت پر اس قسم کی بے شمار دلیلیں قائم فرمائی ہیں جن کو سمجھنے کے بعد کوئی شخص ایک آن کے لئے بھی یہ تصور قبول نہیں کر سکتا کہ عالم ممکنات روح اور مادہ کی مخفی قوتوں اور خاصیتوں کا نتیجہ ہے اور حوادث کونیہ کے باعث اتفاقاً یہ نظام قائم ہو گیا ہے بلکہ اس کی فطرت سلیمہ زبانِ حال سے پکارے گی کہ "صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ اِنَّهٗ خَبِیْرٌ بِمَا تَفْعَلُوْنَ." (س: نمل، آیت)

☆ وہ مادہ جس میں نہ حس ہے نہ حیات، نہ شعور ہے نہ ادراک اور وہ روح جس کا دامن احتیاج (مادہ پرستوں کے نزدیک) ہر مرحلہ پر بے شعور مادہ سے بندھا ہوا ہے۔ دنیائے علم وعقل کا مبداء حیات موجودات کا سرچشمہ اور کائنات کے نظام محکم کا مرکز قرار پائے۔ علم وخرد کی روشنی میں جہالت اور حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

توحید کے معنی

☆ ہستی باری تعالیٰ کے اثبات کے بعد اصل موضوع "توحید" کی طرف آیئے۔ مگر اس سے پہلے لفظ "توحید" اور اس کے معنی کے چند امور ذہن نشین کر لیجئے۔

التوحید فی اللغة یگانه کردن و به یگانگی وصف نمودن وعلم التوحید علم یعرف به انها لوجود غیر الله تعالٰی ولیست الاشیاء الا مظاهره تعالٰی ومجالیه والموحدون طائفة لا یرون غیر الحق عزشانه وجل برهانه ولا یعلمون وجود الغیر الحق تعالٰی وان حقیقة الوجود هوا الله سبحانه (دستور العلماء ص ۳٦۱ ج ۱)

☆ سید شریف جرجانی فرماتے ہیں

التوحید فی اللغة الحکم بان الشیء واحد والعلم بانه واحد وفی اصطلاح اهل الحقیقة تجرید الذات الالٰهیة عن کل ما یتصور فی الافهام ویتخیل فی الاوهام والاذهان۔ التوحید ثلاثة اشیاء معرفة الله تعالٰی بالربوبیة والاقرار بالوحدانیة ونفی الانداد عنه جملة۔رسالة تعریف الاشیاء للسید الشریف الجرجانی ص ۳۱)

مراتب توحید

☆ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مراتب توحید چار ہیں

(۱) صفت وجود کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کرنا کہ اس کے سوا کوئی واجب الوجود نہیں

(۲) ہر شے کا خالق اللہ تعالیٰ کو جاننا

☆ یہ دونوں مرتبے مشرکین عرب یہود ونصاریٰ سب کے نزدیک مسلم ہیں۔

(۳) ہر شے کا مدبر صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھے

(۴) اس کے سوا کسی دوسرے کو مستحق عبادت نہ جانے

یہ دونوں مرتبے آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ اخیر کے دونوں مرتبوں میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے جن میں بڑے گروہ تین ہیں، اول نجومی، دوم مشرکین، سوم نصاریٰ (حجۃ اللہ البالغہ ملخصاً)

حقیقت شرک

اقول: حقیقت یہ ہے کہ مراتب اربعہ مذکورہ بلکہ جمیع صفات الوہیت وکمالاتِ ربوبیت میں ایسا تلازم ہے کہ ایک کا دوسرے کے ساتھ پایا جانا عقلاً واجب ہے اور واجب عقلی کا انتفاء ممتنع لذاتہ ہے۔ لہٰذا جس نے ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے الگ جانا اس نے بابِ توحید میں اسی امر ممتنع بالذات کو ممکن اعتقاد کیا اور یہی شرک ہے

قرآن مجید میں دلائل توحید اور "واحد" و "احد" کا استعمال

☆ قرآن مجید میں توحید باری تعالیٰ کا دعویٰ اور اس کے دلائل بکثرت پائے جاتے ہیں۔ بعض آیات میں لفظ واحد اور کہیں لفظ احد بھی وحدانیت الٰہیہ کے بیان میں وارد ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "وَاِلٰهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ" (س: البقرة) اور سورۂ اخلاص میں ہے "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ" مطلقاً وصف کے لئے لفظ احد کا استعمال اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ غیر اللہ کے لئے مطلقاً اس کا استعمال نہیں۔ بعض لوگوں نے "احاد" کو احد کی جمع کہا ہے مگر محققین نے اس کا انکار کیا۔ (کما فی تیسیر الباری)

واحد کے اقسام خمسہ

☆ لفظ واحد کثیر الاستعمال ہے اور متعدد معانی میں مستعمل ہوتا ہے۔ ان سب کا احصاء پانچ اقسام میں ممکن ہے۔ واحد جنسی، واحد نوعی، واحد اتصالی، واحد عددی، واحد حقیقی۔

☆ واحد جنسی میں جہت وحدت جنس ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جنس سے پاک ہے اور واحد نوعی میں جہت وحدت نوع ہے۔ نوع جنس اور فصل سے مرکب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ترکیب سے پاک ہے مبرا ہے۔ واحد بالاتصال میں جہت وحدت اتصال ہے۔ اللہ تعالیٰ اتصال وانفصال دونوں سے پاک ہے۔ واحد عددی میں بھی جہت وحدت خارج عن الذات ہے جس کی تعریف میں علماء ہندسیین کہا کرتے ہیں "الواحد نصف الاثنین" یہاں تو وحدت کا مدار ہی اثنین پر ہے۔ جب تک "دو" نہ کہیں پھر دو آدھا نہ مانیں اس وقت تک ایک کے معنی مفہوم نہیں ہوتے۔ معلوم ہوا کہ اربعہ اولیٰ میں وحدتِ عارضی ہے جو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں۔ البتہ واحد حقیقی ایسا واحد ہے جس میں صفت وحدت عارضی نہیں بلکہ ذاتی اور مستقل ہے۔ اس لئے کہ واحد حقیقی وہ ہے جس کا وصف وحدت بمقتضائے ذات ہو یعنی واحد کی ذات وحدت کی مقتضی ہو اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ ہے۔

☆ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایک ایسی دلیل بھی قائم کی گئی ہے جو عوام کے لئے اقناعی اور خواص کے لئے برہانِ قطعی ہے اور وہ یہ ہے "لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا" (س: الانبیاء، آیت: ۲۲)

اقناعی و خطابی کا بیان

☆ اس آیت کریمہ کا دلیل خطابی و اقناعی ہونا کسی طویل تقریر کا محتاج نہیں۔ مشہور مقولہ ہے "دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند" چنانچہ یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ اگر زمین و آسمان میں متعدد خدا ہوتے تو ان کے آپس میں دنیوی بادشاہوں کی طرح اختلاف پیدا ہو جاتا اور اختلاف کے بعد جنگ و جدال تک نوبت پہنچ جاتی۔ اور ایسی صورت میں نظم و نسق درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ یہی مضمون قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی مذکور ہے۔

وَمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (س: المؤمنون، آیت: ۹۱)

ترجمہ☆ اور نہیں ہے ساتھ اس کے کوئی خدا (اگر ایسا ہوتا تو) اس وقت لے جاتا ہر ایک خدا اس چیز کو جسے پیدا کیا ہے اس نے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا۔ (س: بنی اسرائیل، آیت: ۴۲)

ترجمہ☆ کہہ دیجیے اگر ہوتے اللہ کے ساتھ اور معبود جیسا یہ کافر کہتے ہیں تو اس وقت ڈھونڈتے وہ صاحب عرش کی طرف کوئی راستہ!

خلاصہ یہ کہ ایک ملک میں بیک وقت ایک سے زیادہ بادشاہوں کے پائے جانیکی صورت میں تغالب و تمانع کا پایا جانا ایسا امر عادی ہے جس میں غور و فکر کے بعد انسانوں کو علم حقیقی حاصل ہو جاتا ہے کہ اس عالم کے باوجود اسکے نظام مشاہد میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا ہرگز شریک نہیں اور یقین کا مقتضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو مطلقاً وحدہٗ لا شریک لہٗ اعتقاد کر کے موحد کامل بن جائے۔

برہان تمانع کا خلاصہ

☆ اسی آیت میں برہان قطعی کی طرف بھی اشارہ موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر دو خداؤں کا وجود فرض کیا جائے تو ہر ایک کی قدرت تمام مقدورات پر عام ہوگی۔ اس لئے دونوں میں سے ہر ایک مثلاً زید میں حرکت اور سکون پیدا کرنے پر قادر ہوگا۔ اب اگر ان میں سے ایک نے زید میں حرکت اور دوسرے نے سکون پیدا کرنا چاہا اور دونوں اپنے اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گئے تو اجتماع ضدین لازم آئے گا اور یہ محال عقلی ہے اور اگر دونوں ناکام رہے تو یہ بھی عقلاً محال ہے کیونکہ ہر ایک کا مقصد دوسرے کو ناکام کرنا ہے۔ ایسی صورت میں ایک کی ناکامی دوسرے کی کامیابی پر موقوف ہوگی۔ لہٰذا دونوں کا ناکام ہونا دونوں کے کامیاب ہونے پر موقوف رہے گا اور ظاہر ہے کہ یہ عقلاً ممتنع لذاتہ ہے اور دونوں میں سے ایک کامیاب ہو گیا اور دوسرا ناکام رہا تو جو ناکام ہوگا وہ خدا نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا کا ناکام ہونا ممتنع بالذات اور محال عقلی ہے۔

تعدد آلہۃ اور ان کا اتفاق محال ہے

☆ اگر اس مقام پر یہ شبہ پیش کیا جائے کہ ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ خدا ہوں اور آپس میں اس بات پر متفق ہو گئے ہوں کہ ہم میں سے کوئی ایسا ارادہ نہ کرے گا جو دوسرے کے خلاف ہو تو اسکا جواب یہ ہے کہ یہ امکان اتفاق اس تمانع کے امکان کو مستلزم ہے۔ جس محال ہونا ہم ابھی دلیل سے ثابت کر چکے ہیں اور ظاہر ہے کہ مستلزم محال خود محال ہوتا ہے۔ لہٰذا انکا متفق ہونا بھی محال ہوگا۔ البتہ اگر کسی دلیل سے

اتفاق کا وجوب ثابت ہو جاتا تو واقعی یہ دلیل ساقط ہو جاتی لیکن وجوب اتفاق پر آج تک کوئی دلیل قائم نہیں ہوئی نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔

دلیل اقناعی بھی حصول تعین کا موجوب ہو سکتی ہے

☆ اس تقریر سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا کہ آیت کریمہ "لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا" کو حجت اقناعیہ ماننے کی صورت میں یہ دلیل ظنی ہو جائے گی جس میں یقین منتفی ہو گا اور یہ بات کلام الٰہی کے شایانِ شان نہیں۔ اس کا جواب ہمارے بیان سابق میں واضح طور پر آ گیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اصطلاحی الفاظ میں تو ہم نے اسے دلیل خطابی سے ضرور تعبیر کیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ محض ظنی ہے جس کا کوئی تعلق علم یقین کے ساتھ نہیں بلکہ ہم صاف لفظوں میں کہہ چکے ہیں کہ اس "حجت اقناعی" میں غور و خوض کرنے سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ملازمت عقلیہ میں علم یقینی منحصر نہیں بلکہ وہ امور عادیہ اور قرائن واضحہ جن میں عقلی تلازم نہیں پایا جاتا۔ بسا اوقات علم یقینی کا موجب ہوتے ہیں جیسے زید کی موت کا ہمیں علم یقینی حاصل ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زید عرصۂ دراز سے شدید ترین مہلک مرض میں مبتلا ہے اور اچانک اس کے گھر سے رونے پیٹنے کی آوازیں بلند ہوئیں اور غسل و کفن کا سامان مہیا ہونے لگا تو اگرچہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن اس کے گھر "وازیدہ" کی آوازیں سننے اور تجہیز و تکفین کا سامان دیکھنے کے بعد ہمیں اس کی موت کا علم یقینی حاصل ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ علم یقینی کے لئے ملازمت عقلیہ ہی ضروری نہیں بلکہ امور عادیہ بھی علم یقینی کا موجب ہو سکتے ہیں۔

اعجاز قرآن

☆ یہ قرآن مجید ہی کا معجزانہ اندازِ بیان ہے کہ ایک آیت علامۃ الناس کے لئے حجت اقناعی بھی ہے اور وہی آیت ان خواص کے لئے جو اہل عقل و دانش ہیں، برہانِ قطعی کی شان بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لئے اس کی فہم کے مطابق دلائل توحید بیان فرمائے۔

توحید کے فوائد

☆ ہم سابقاً عرض کر چکے ہیں کہ معرفت الٰہیہ انسان کی روح کا فطری تقاضا ہے اور توحید کے بغیر معرفت خداوندی متصور نہیں۔ لہٰذا توحید کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان کے فطری مقتضا کی تکمیل ہو گئی دوسرے یہ کہ ہر شخص کی زندگی کی عمارت اس کے عقیدہ کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ فسادِ عقیدہ زندگی کی تمام عمارت کو فاسد کر دیتا ہے۔ ہر قوم کی تہذیب اور اس کا معاشرہ اس وقت تک اصلاح پذیر نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس کا عقیدہ صالح اور درست نہ ہو۔ پھر یہ کہ انسانیت کا جوہر عقیدۂ توحید کے بغیر نہیں نکھرتا۔ توحید معرفت کا موجب ہے اور خدا کی معرفت خوفِ الٰہی کا سبب ہوتی ہے اور خوفِ خداوندی ارتکابِ معاصی سے باز رکھتا ہے۔

انسانیت کا مرکز توحید اور وسیلہ رسالت ہے

☆ اقوام عالم کی تہذیب و تمدن اور معاشرے میں اصولی اور بنیادی اختلافات کی سب سے بڑی وجہ توحید باری کے عقیدے میں اختلاف کا پایا جانا ہے۔ بنی نوع انسان کو ایک مرکز پر لانے کا کوئی طریقہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ انہیں معبود واحد کی وحدانیت کے

اعتقادی مرکز پر جمع کردیا جائے لیکن فطرت انسانی محض عقل کی روشنی میں اس مرکز وحدت تک پہنچنے میں کسی ایسی دلیل کی محتاج تھی جو صحیح معنی میں اسے منزلِ مقصود تک پہنچادے اور تمام بنی نوع انسان کے لئے ایسی کامل اور قطعی دلیل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ رسالت توحید کی دلیل ہے اور اس میں شک نہیں کہ کلمہ طیبہ "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ" دعویٰ ہے اور "مُـحَـمَّـدٌ رَّسُوْلُ اللّٰـه" اس کی دلیل ہے اور اس دلیل کو دعوے سے اتنا قرب ہے کہ دونوں کے درمیان واؤ عاطفہ تک کی گنجائش نہیں۔ معلوم ہوا کہ قربِ الٰہی کا ذریعہ صرف قربِ مصطفائی ہے اور توحید کا وسیلہ محض رسالت ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بو لہبی است!
(اقبال)

ضرورتِ نبوت

کل کائنات کی ضروریات، ضروریاتِ انسانیہ کے محور پر گھوم رہی ہیں۔ دنیائے انسانیت کا یہ عظیم الشان نظام دامن نبوت سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن افرادِ انسانی کا رابطہ بارگاہِ نبوت سے قائم نہیں ہوا وہ حیوانیت اور بہیمیت کے گڑھوں میں جا گرے۔

ضرورتِ نبوت

☆ اس میں شک نہیں کہ انسان میں جسمانیت، حیوانیت اور ملکیت سب کچھ موجود ہے۔ جسم کے متعلقات و مناسبات جسمانیت کے لئے ضروری ہیں۔ جیسے زمان و مکان، تشکل و تناہی ہیئت و مقدار وغیرہ اور حیوانیت کے لوازمات و ملحقات حیوانیت کے لئے لازم ہیں، جیسے کھانا پینا اور اس کے متعلقات اسی طرح ملکیت کے مصححات و متعلقات کا ملکیت کے لئے ہونا ضروری ہے جیسے تسبیح و تحمید لیکن جس طرح جسمانیت و حیوانیت و ملکیت تینوں انسان کے اردگرد گھومتی ہیں اسی طرح ان کے جملہ ضروریات و مناسبات بھی ضرویات و مناسبات انسانیہ کے آس پاس گردش کرتے ہیں بلکہ یوں کہیئے کہ انسان کل کائنات کے حقائق لطیفہ کا مجموعہ ہے اور سب مخلوقات انسان کی خادم اور انسان سب کا مخدوم ہے۔ لہٰذا کل مخلوقات انسان کی ضروریات کی خادم اور انسانی ضروریات سب کی مخدوم ہیں۔ گویا کل کائنات کی ضروریات، ضروریاتِ انسانیہ کے محور پر گھوم رہی ہیں۔ دنیائے انسانیت کا یہ عظیم الشان نظام دامن نبوت سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن افرادِ انسانی کا رابطہ بارگاہِ نبوت سے قائم نہیں ہوا وہ حیوانیت اور بہیمیت کے گڑھوں میں جا گرے۔

ضرورتِ نبوت پر پہلی دلیل

☆ مقصودِ تخلیق کے حصول کا موقوف علیہ ہمیشہ ضروری ہوا کرتا ہے۔ انسان معرفت الٰہیہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور خدا کی معرفت

کا حامل ہونا نبوت ورسالت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے نبوت ورسالت کا وجود انسان کے لئے ضروری ہے۔ منکرین نبوت کا یہ کہنا علم و عقل کی روشنی میں قطعی باطل ہے کہ "جب انسان کے پاس حواس اور عقل دونوں موجود ہیں تو اسے نبوت ورسالت کی کوئی ضرورت نہیں" خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے یہ حواس کافی ہیں نہ عقل۔ جن لوگوں نے خدا کی معرفت کے لئے حواس کو کافی سمجھا وہ محسوسات ومظاہر کائنات کی پرستش میں مبتلا ہو گئے اور جنہوں نے عقل پر اعتماد کیا ان میں اکثر لوگ خدا کے منکر ہو گئے اور جو صریح انکار کی جرأت نہ کر سکے انہوں نے ذات وصفات کے مسائل میں ایسی ٹھوکریں کھائیں کہ معرفت کی راہوں سے بہت دور جا پڑے اور عقل ناتمام کی وادیوں میں بھٹک کر ظنون واوہام کے گڑھوں میں جا گرے۔ قرآن کریم نے ایسے ہی لوگوں کے حق میں ارشاد فرمایا ہے "اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ" (س: یونس، آیت: ۶۶) رہا یہ امر کہ خدا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اس کی معرفت ضروری ہے یا نہیں تو یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ مصنوع کا وجود صانع کے وجود کی دلیل ہے اور مصنوع کی تخلیق کسی حکمت ومقصد کے بغیر نہیں ہوتی اور کسی مصنوع کی حکمت تخلیق کا فوت ہو جانا اس مخلوق کے عبث ہونے کو مستلزم ہے۔ انسان کے اوصاف وخواص اس امر کی دلیل ہیں کہ وہ اپنے خالق کا مظہر ہے۔ اب اگر وہ اس حقیقت کو پہچاننے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود بھی نہ پہچانے تو اس نے خود اپنے وجود کو عبث قرار دیا اور اگر پہچانے تو چونکہ وہ ذاتِ باری تعالیٰ کا مظہر ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو صحیح معنی میں پہچاننا دراصل اپنے خالق کو پہچاننا ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" لہٰذا ثابت ہو گیا کہ معرفت خداوندی کے بغیر انسان کا وجود عبث ہے اور اگر انسان چاہتا ہے کہ میرا وجود عبث نہ ہو تو معرفت الٰہیہ کے بغیر اس کے لئے کوئی چارہ کار نہیں۔

ضرورتِ نبوت پر دوسری دلیل

☆ قانونِ فطرت یہ ہے کہ ہر نوع کے مدرکات کو معلوم کرنے کے لئے اسی نوع کا ادراک عطا کیا گیا ہے۔ مثلاً مبصرات کو جاننے کے لئے ادراک بصری اور مسموعات کے لئے ادراک سمعی۔ علیٰ ہذا القیاس پانچوں حواس کو لیجئے۔ ہر نوع محسوس کے لئے اسی نوع کا حاسہ ہمارے اندر پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد معقولات کا وجود ہے جنہیں معلوم کرنے کے لئے عقل عطا فرمائی گئی۔ ادراک انسانی کی تگ ودو حواس وعقل سے آگے نہ تھی مگر اس کی ضروریات کا تعلق ان دونوں سے آگے تھا جسے عالم غیب کہا جاتا ہے۔ جب تک اس عالم تک کسی کی رسائی نہ ہو اس مقام کے ساتھ متعلق انسانی ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ نبوت جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے "اطلاع علی الغیب" ہی کا نام ہے لہٰذا انسانی ضرورتوں کے پورا ہونے کے لئے نبوت کا ہونا ضروری ہے۔

www.kazmis.com

ضرورتِ نبوت پر تیسری دلیل ھے

☆ حاسہ سبب ادراک ہے اور اس سے غلطی بھی واقع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس کے ازالہ کے لئے عقل کا اس پر حاکم ہونا ضروری تھا۔ مگر جب عقل بھی ٹھوکر کھائے تو اس کا ازالہ نہ عقل کر سکتی ہے نہ حواس کیونکہ حواس اس عقل کے محکوم ہیں اور عقل بحیثیت عقل ہونے کے

مساوی ہے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ عقل پر ایسی چیز کو حاکم تسلیم کیا جائے جو غلطی سے پاک ہے اور وہ نبوت ہے کیونکہ نبوت ہی غلطی سے مبرا ہے۔ لہٰذا اختلافِ عقل کی مضرتوں سے بچنے کے لئے "نبوت" کو ماننا ضروری ہے۔ نبوت کا غلطی سے پاک ہونا ہی عصمت نبوت کا مفہوم ہے۔ معلوم ہوا کہ "عصمت" لوازم نبوت سے ہے۔ اس مقام پر زلّات انبیاء علیہم السلام سے وہم پیدا کرنا درست نہیں۔

استدراک

☆ شاید اس بیان کی روشنی میں ضرورت نبوت کے ساتھ اجرائے نبوت کا شبہ پیدا کر لیا جائے اس لئے گزارش ہے کہ ضرورتِ نبوت سے اجرائے نبوت ہرگز لازم نہیں آتا

☆ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے مطابق خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کو اس وقت مبعوث فرمایا جب کہ نوعِ انسانی اپنی حیات کے منازل طے کرتی ہوئی ایسے مرحلہ پر پہنچ گئی تھی کہ اس کے لئے جو نظام مقرر کیا جائے قیامت تک اس کی تمام ضروریات کے لئے وہی قابل عمل ہو۔ چنانچہ ارشاد فرمایا "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" (س: المائدہ، آیت: ۳) میں نے آج تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور میں نے تمہارے لئے تمہارے دین اسلام کو پسند کر لیا۔ یہ ارشادِ خداوندی منکرین ختم نبوت کے اس شبہ کا قلع قمع کرنے کے لئے کافی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبوت محمدیہ کے دامن سے ایسا دین وابستہ ہے جو قیامت تک پیش آمدہ ضروریات کے پورا ہونے کا واحد ذریعہ ہے۔ نبوت و رسالت محمدیہ ہی بنی نوع انسان کے ہر فرد کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بعد کسی کو نبوت دیا جانا متصور نہیں۔ ضرورتِ نبوت کے لئے اجراء نبوت کو لازم سمجھنا اکمال دین کے منافی ہے۔ ضرورت نبوت کے بعد حکمت بعثت پر بھی غور کرتے چلیں تاکہ عصمت و نبوت کا باہمی تعلق اور زیادہ واضح ہو جائے۔

بعثت انبیاء کی حکمتیں

☆ قرآن کریم میں بعثت انبیاء علیہم السلام کی حکمتیں بکثرت آیات میں بیان کی گئی ہیں جن میں بعض حسب ذیل ہیں

(۱) وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (النساء: ۶۴)

(۲) وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ۔ (انعام: ۴۸)

(۳) وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا۔ (احزاب: ۷۱)

(۴) وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ (النساء: ۸۰)

(۵) لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (آل عمران: ۱۶۴)

☆ ضرورت نبوت کے ضمن میں جن امور کو ہم نے بیان کیا ہے یہ آیات مبارکہ روزِ روشن کی طرح ان کی تائید کرتی ہیں اور انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت سے متعلق حسب ذیل حکمتوں کی نشاندہی کرتی ہیں

(۱) اللہ تعالیٰ کے بندوں سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرانا۔

(۲) عالم غیب سے متعلق آخرت کی نعمت کی خوش خبری دینا اور عذابِ الٰہی سے ڈرانا۔

(۳) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا نجاتِ اخروی اور سعادتِ ابدی کے لئے شرط ہونا۔

(۴) اطاعت رسول کا اطاعت خداوندی ہونا تاکہ بندوں کے لئے اطاعت الٰہی کی راہ متعین ہو جائے۔

(۵) آیاتِ الٰہیہ کو تلاوت کرنا۔

(۶) ایمان والوں کا ظاہر و باطن پاک کرنا۔

(۷) کتابِ الٰہی اور حکمت و دانائی کی تعلیم دینا۔

☆ بیانِ سابق کی تفصیلات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اگر نبوت اور رسالت کے ان مناصب و بعثت انبیاء علیہم السلام پر غور کیا جائے تو یقیناً عصمت نبوت کا اقرار کرنا پڑے گا۔ کم از کم اتنی بات تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس کام کے کرنے کی صلاحیت کسی میں نہ ہو وہ کام اس کو سپرد نہیں کیا جاتا۔ ایک ظالم کو کرسی عدالت پر بٹھانا، ان پڑھ آدمی کو علم و حکمت کی موشگافیوں کا کام سونپنا، کسی بدکار فاسق و فاجر کو عفیفات کی عزت و ناموس کی حفاظت کے لئے متعین کرنا، بیمار و ناتواں کے سر پر بھاری بوجھ رکھ دینا، گم کردہ راہ سے ہدایت طلب کرنا کسی عاقل کا کام نہیں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان امور کی صلاحیتوں کے بغیر ہی اللہ تعالیٰ ان کی انجام دہی کا منصب انبیاء علیہم السلام کو سونپ دے؟ جب یہ ممکن نہیں تو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت کے ساتھ وہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں بھی انبیاء علیہم السلام کو عطا فرمائی ہیں جن کا ہونا ان کے لئے ضروری تھا اور یہی عصمت کا مفہوم ہے جس کے بغیر نبوت ایسی ہے جیسے بینائی کے بغیر آنکھ اور روشنی کے بغیر سورج۔

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

☆ ماہِ ربیع الاول شریف وہ نورانی مہینہ ہے، جس کی آغوش میں نورِ مبین کے جلوے قیامت تک چمکتے رہیں گے۔ بموجب فرمانِ خداوندی ”وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ ۔ (ابراہیم:۵) آج ہمیں اس مبارک دن کی یاد تازہ کرنی ہے جو سید ایام اللہ یعنی یوم ولادت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔

☆ یہ وہ مبارک دن ہے، جس میں خدا کے سب سے پہلے اور آخری نبی جناب احمد مجتبیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اس دنیا میں جلوہ گر ہوئے۔ اس مضمون میں ہمیں سب سے پہلے حضور ﷺ کی خلقت و ولادت اور بعثت پر روشنی ڈالنی ہے۔

تشریح

☆ عالم اجسام میں جلوہ گر ہونے سے پہلے ذات پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا عدم سے وجود میں جلوہ گر ہونا خلقت محمدی ہے اور اس دار دنیا میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پیدا ہونا ولادت محمدی ہے اور چالیس سال کی عمر شریف میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وحی

نبوت سے مشرف ہو کر لوگوں کو دین حق کی طرف بلانے پر مامور ہونا بعثت محمدی ہے۔ اب اس اجمالی گفتگو کے بعد تفصیل کی طرف آیئے اور سب سے پہلے خلقت محمدی کا بیان قرآن اور حدیث کی روشنی میں سنیئے۔

خلقت محمدی ﷺ

☆ اجسام سے قبل عالم امر میں ذواتِ انبیاء علیہم السلام کا موجود ہونا نص قرآن سے ثابت ہے، جسکا مقتضا یہ ہے کہ ذات محمدی ﷺ بطریق اولیٰ عالم ارواح میں موجود ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۔ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ (آل عمران: ۸۱ ۔ ۸۲)

ترجمہ☆ اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ دیا میں نے تم کو کتاب اور حکمت سے اور آئے تمہارے پاس رسول معظم جو تصدیق کرنے والا ہو اس چیز کی جو تمہارے ساتھ ہے تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور اس کی ضرور مدد کرو گے، فرمایا کیا تم نے اس شرط پر میرے عہد کو قبول کر لیا۔ سب نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اب گواہ ہو جاؤ اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ پھر جو کوئی پھر جائے اس کے بعد تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِىْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۔ (اعراف:۱۷۲)

ترجمہ: ''اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب! بولے کیوں نہیں (بیشک تو ہمارا رب ہے) ہم اقرار کرتے ہیں۔''

☆ تمام نفوس بنی آدم سے پہلے حضور ﷺ کے نفس قدسی نے ''بَلٰی'' کہہ کر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار فرمایا اور باقی تمام نفوس بنی آدم نے حضور ﷺ کے اقرار پر اقرار کیا، اس واقعہ کا مقتضٰی بھی یہی ہے کہ ذات پاک مصطفوی علیہ التحیۃ والثنا مخلوق ہو کر عدم سے وجود میں جلوہ گر ہو چکی تھی۔ نیز فرمایا

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۪ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۔

ترجمہ: ''اور جب لیا ہم نے نبیوں سے ان کا اقرار اور تجھ سے اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ و عیسیٰ سے جو بیٹا ہے مریم کا اور لیا ہم نے ان سے پکا اقرار۔'' (احزاب:۷)

☆ اس آیت کریمہ میں جس عہد اور اقرار کا بیان ہے وہ تبلیغ رسالت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں دیگر انبیاء علیہم السلام سے تبلیغ رسالت پر عہد لیا وہاں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے بھی یہ عہد و اقرار کرایا۔ یہ واقعہ بھی عالم ارواح کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حضور ﷺ کی خلقت اس وقت نہ ہوگئی ہوتی تو اس عہد و اقرار کا ہونا کس طرح متصور ہوتا۔

☆ رہا یہ امر کہ خلقت محمدی تمام کائنات اور خصوصاً جمیع انبیاء کرام علیہم السلام کی خلقت سے پہلے ہے تو اس مضمون کی طرف قرآن کریم کی بعض آیات میں واضح ارشادات پائے جاتے ہیں اور احادیث صحیح میں تو صراحتاً ارشاد ہے کہ حضور ﷺ اول خلق ہیں وار تمام

انبیاء علیہم السلام سے پہلے حضور ﷺ کی ذاتِ مقدسہ مخلوق ہوئی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ۔ (البقرۃ: ۲۵۳)

ترجمہ: ”یہ سب رسول ہیں فضیلت دی ہم نے ان کے بعض کو بعض پر، بعض ان میں سے وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور بعض کے درجے بلند کئے۔“

☆ جن کے درجے بلند کئے وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ حضور ﷺ کے درجوں کی بلندی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ درجاتِ خلقت میں بھی حضور ﷺ کا درجہ سب سے بلند ہے اور آپ سب سے پہلے مخلوق ہو کر سب کی اصل ہیں۔

☆ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

ترجمہ: ”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو اے محمد مصطفیٰ ﷺ مگر رحمت بنا کر تمام جہانوں کے لئے۔“

☆ یہ آیت کریمہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ حضور ﷺ تمام عالموں کے لئے رحمت ہیں۔ اس آیت میں اَلْعٰلَمِيْنَ اسی طرح اپنے عموم پر ہے جیسے ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ“ میں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مواقع میں اَلْعٰلَمِيْنَ قرائن خارجیہ کی وجہ سے مخصوص ہے لیکن اس آیت کریمہ میں کوئی دلیل مخصوص نہیں پائی جاتی۔ بعض قرائن خارجیہ اس کے عموم کی تائید کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضور ﷺ کا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ہونا جہت رسالت سے ہے یعنی حضور ﷺ رسول ہونے کی وجہ سے رحمت ہیں لہٰذا رحمت کا عموم رسالت کے عموم کے عین مطابق ہوگا۔ حضور ﷺ جس کیلئے رسول ہو گئے، اسی کے لئے رحمت قرار پائیں گے۔ اب یہ معلوم کر لیجئے کہ حضور ﷺ کس کے لئے رسول بن کر تشریف لائے؟ تو مسلم شریف کی حدیث میں وارد ہے، ”اُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً۔“ ”میں ساری امت کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“

☆ جب وہ ساری مخلوق کے لئے رسول ہوئے تو رسول عالمین قرار پائے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ آپ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ہوں۔ ثابت ہوا کہ جس طرح حضور ﷺ کی رسالت تمام عالمین کے لئے عام ہے، اسی طرح آپ کی رحمت بھی تمام جہانوں کے لئے عام اور ماسوی اللہ کو محیط ہے۔

☆ رہا یہ شبہ کہ کفار و مشرکین وغیرہ بدترین لوگوں کے لئے حضور ﷺ رحمت نہیں۔ اس لئے کہ وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہوں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ظہور رحمت کے مراتب ہر ایک کے حق میں متفاوت ہیں۔ روح المعانی میں اسی آیت کے تحت مرقوم ہے، ”لَا فَرْقَ بَيْنَ الْمُؤْمِنِ وَالْكَافِرِ مِنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ فِيْ ذٰلِكَ وَالرَّحْمَةُ مُتَفَاوِتَةٌ۔“ (تفسیر روح المعانی) حضور ﷺ سب کے لئے رحمت ہیں۔ اس بات میں مومن و کافر کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ مگر رحمت ہر ایک کے حق میں مختلف اور متفاوت ہے کہ ان کا مبتلائے عذاب ہونا اس لئے ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر حضور کی رحمت سے منہ پھیرا، ورنہ حضور ﷺ کی رحمت میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے، ”وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ“

میری رحمت ہر شے پر وسیع ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی کفار مبتلائے عذاب ہوں گے۔ تو کیا اللہ تعالیٰ کے رحمٰن ورحیم ہونے پر کچھ فرق آئے گا؟ یا کل شیٔ کے عموم سے انہیں خارج سمجھا جائے گا۔ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ نہیں اور ہرگز نہیں، بلکہ یہی کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو ہر شئے پر محیط ہے مگر بعض افراد اپنی عدم اہلیت کی وجہ سے اس قابل ہی نہیں کہ رحمت خداوندی سے فائدہ اٹھائیں۔ معلوم ہوا کہ کسی کا رحمت سے فائدہ نہ اٹھانا رحمت کے عموم کے منافی نہیں ہے۔

☆ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ حضور ﷺ بلا استثناء تمام عالمین کے لئے رحمت ہیں اور عالم ماسوی اللہ کو کہتے ہیں تو یہ بات بخوبی روشن ہوگئی کہ حضور ﷺ ہر فرد عالم کے لئے رحمت ہیں اور حضور ﷺ کے رحمت ہونے کے معنی یہ ہے کہ مرتبہ ایجاد میں تمام عالم کا موجود ہونا بواسطہ وجود سید الموجودات ﷺ کے ہے اور حضور ﷺ اصل ایجاد ہیں۔ حضور ﷺ کے بغیر کوئی فرد ممکن موجود نہیں ہوسکتا۔ وجود نعمت ہے اور عدم اس کی ضد۔ کل موجودات نعمت وجود میں حضور ﷺ کے دامن رحمت سے وابستہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو ذات کسی کے وجود کا سبب اور واسطہ ہو وہ یقیناً اس کے لئے رحمت ہے۔ رحمت کی حاجت ہوتی ہے اور جس چیز کی حاجت ہو وہ محتاج سے پہلے ہوتی ہے چونکہ تمام عالمین اپنے وجود میں حضور ﷺ کے محتاج ہیں اس لئے سب سے پہلے حضور ﷺ کا وجود ضروری ہوگا۔ نیز یہ کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام عالمین کے وجود کا سبب اور ان کے موجود ہونے کا واسطہ ہیں تو اس وجہ سے بھی حضور ﷺ کا عالمین سے پہلے موجود مخلوق ہونا ضروری ہے کیونکہ سبب اور واسطہ ہمیشہ پہلے ہوا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اسی آیت سے حضور ﷺ کا اصل کائنات ہونا بھی ثابت ہے۔ جیسا کہ صاحب تفسیر عرائس البیان نے جلد۲ صفحہ ۵۲ وصاحب تفسیر روح المعانی نے صفحہ ۹۶ پارہ ۱۷ پر اسی آیت کے ذیل میں نہایت تفصیل سے اس مضمون کو بیان فرمایا ہے اور سب جانتے ہیں کہ اصل کا وجود فرع سے پہلے ہوتا ہے۔ اس لئے ذات پاک محمدیہ ﷺ کی خلقت اصل کائنات ہونے کی حیثیت سے کل موجودات اور عالمین سے پہلے ہے۔ الحمدللہ! خوب واضح ہوگیا کہ خلقت محمدی ﷺ تمام موجودات عالم سے پہلے ہے۔

☆ تیسری آیت جس سے حضور ﷺ کی اولیت خلقت کی طرف واضح اشارہ پایا جاتا ہے۔ آیت کریمہ "وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" ہے۔ یعنی میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔"

☆ صاحب عرائس البیان فرماتے ہیں "وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ اِشَارَۃٌ اِلٰی تَقَدُّمِ رُوْحِہٖ وَجَوْھَرِہٖ عَلٰی جَمِیْعِ الْکَوْنِ" اس آیت میں اشارہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روح پاک اور جوہر مقدس جمیع کون یعنی تمام ماسوی اللہ پر مقدم ہے۔ (عرائس البیان جلد ا صفحہ ۲۳۸)

☆ ظاہر ہے کہ اختیاری یا غیر اختیاری اسلام سے تو عالم کا کوئی ذرہ خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ." (اٰل عمران:۸۳)

☆ پھر سب اسلام لانے والوں سے پہلے حضور ﷺ اسی وقت ہوسکتے ہیں۔ جب کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سب سے پہلے

ہوں۔لہٰذا اس آیت سے بھی حضور نبی کریم ﷺ کی خلقت تمام کائنات سے پہلے معلوم ہوئی۔

☆ اس آیت کے بعد احادیث میں مضمون کو ملاحظہ فرمایئے

(۱) حدیث حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما

☆ حضرت امام عبدالرزاق صاحب مصنف نے اپنی سند کے ساتھ سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر فرماتے ہیں ''میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ مجھے خبر دیں کہ وہ پہلی چیز کون سی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے پیدا فرمایا؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا، اے جابر! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا فرمایا، پھر یہ نور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے موافق جہاں اس نے چاہا سیر کرتا رہا۔ اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم تھا نہ جنت تھی نہ دوزخ نہ فرشتہ تھا نہ آسمان نہ زمین تھی نہ سورج نہ چاند نہ جن نہ انسان جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ مخلوقات کو پیدا کرے تو اس نور کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے حصے سے قلم بنایا، دوسرے حصے سے لوح، تیسرے حصے سے عرش اور پھر چوتھے حصے کو چار حصوں میں تقسیم کیا تو پہلے حصے سے عرش اٹھانے والے فرشتے بنائے اور دوسرے سے کرسی اور تیسرے سے باقی فرشتے اور پھر چوتھے حصے کو چار حصوں میں تقسیم کیا تو پہلے آسمان بنائے اور دوسرے سے زمین اور تیسرے سے جنت اور دوزخ اور پھر چوتھے حصے کو چار حصوں میں تقسیم کیا تو پہلے سے مومنین کی آنکھوں کا نور بنایا اور دوسرے سے ان کے دلوں کا نور پیدا کیا جو معرفت الٰہی ہے اور تیسرے سے ان کا نور انس پیدا کیا اور وہ توحید ہے (جس کا خلاصہ ہے ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ'') الخ مواہب اللدنیہ جلد اول صفحہ ۹۔ سیرت حلبیہ جلد ا صفحہ ۳۰، زرقانی جلد اول صفحہ ۴۶''

یہ حدیث مصنف عبدالرزاق سے جلیل القدر محدثین جیسے امام قسطلانی شارح بخاری و امام زرقانی اور امام ابن حجر مکی اور علامہ فارسی اور علامہ دیار بکری نے اپنی تصانیف جلیلہ افضل القریٰ، مواہب اللدنیہ مطالع المسرات خمیس اور زرقانی علی المواہب میں نقل فرما کر اس پر اعتماد اور اس سے مسائل کا استنباط کیا۔

امام عبدالرزاق صاحب مصنف جو اس حدیث کے مخرج ہیں وہ امام احمد بن حنبل جیسے اکابر ائمہ دین کے استاد ہیں۔ تہذیب التہذیب میں ان کے متعلق لکھا ہے

وَقَالَ اَحْمَدُ بْنُ صَالِحِ الْمِصْرِیُّ قُلْتُ لِاَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلَ رَاَیْتَ اَحَدًا اَحْسَنَ حَدِیْثًا مِّنْ عَبْدِ الرَّزَّاقِ قَالَ لَا .... تہذیب التہذیب (صفحہ ۳۱۱ جلد ۶)

☆ امام احمد بن صالح مصری کہتے ہیں ''میں نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا کہ آپ نے حدیث میں کوئی شخص عبدالرزاق سے بہتر دیکھا؟ انہوں نے فرمایا نہیں'' امام عبدالغنی نابلسی رضی اللہ عنہ حدیقہ ندیہ میں اس حدیث کی تصحیح فرماتے ہوئے رارقام فرماتے ہیں ''قَدْ خُلِقَ کُلُّ شَیْءٍ مِّنْ نُّوْرِہٖ ﷺ کَمَا وَرَدَ بِہِ الْحَدِیْثُ الصَّحِیْحُ'' اسی حدیث کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دلائل النبوۃ میں

تقریباً اسی طرح روایت فرمایا ہے۔ مطالع المسرات شرح دلائل الخیرات میں علامہ فارسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "قَدْ قَالَ الْاَشْعَرِیُّ اِنَّهٗ تَعَالٰی نُوْرٌ لَیْسَ كَالْاَنْوَارِ وَالرُّوْحُ النَّبَوِیَّةُ الْقُدْسِیَّةُ لُمْعَةٌ مِّنْ نُّوْرِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ شَرَرُ تِلْكَ الْاَنْوَارِ وَقَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ وَمِنْ نُّوْرِیْ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ وَّغَیْرَهٗ مِمَّا فِیْ مَعْنَاهُ" یعنی عقائد اہل سنت کے امام سیدنا ابوالحسن اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا نور ہے کہ کسی نور کی مثل نہیں اور حضور علیہ السلام کی روح مقدسہ اسی نور کی چمک ہے اور فرشتے انہی انوار سے جھڑے ہوئے پھول ہیں اور رسول اللہ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرا نور پیدا فرمایا اور میرے ہی نور سے ہر چیز پیدا فرمائی۔

☆ اس حدیث کے علاوہ اور بھی حدیثیں اس مضمون میں وارد ہیں۔

☆ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج النبوۃ میں فرمایا "درحدیث صحیح وارد شدکہ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ (مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۲)" پھر حدیث جابر کا مضمون بیان فرمایا۔ کثیر التعداد جلیل القدر ائمہ کا اس حدیث کو قبول کرنا، اس کی تصحیح فرمانا، اس پر اعتماد کر کے اس سے مسائل کا استنباط کرنا اس کے صحیح ہونے کی روشن دلیل ہے۔ خصوصاً سیدنا عبدالغنی نابلسی رضی اللہ عنہ کا حدیقہ ندیہ کے مبحث ثانی نوع ستین من آفات اللسان فی مسئلہ ذم الطعام میں اس حدیث کے متعلق "اَلْحَدِیْثُ الصَّحِیْحُ" فرمانا صحت حدیث کو زیادہ واضح کر دیتا ہے۔ ان مختصر جملوں سے ان حضرات کو مطمئن کرنا مقصود ہے جو اس حدیث کی صحت میں متردد رہتے ہیں۔

☆ اس حدیث میں نور کی اضافت بیانیہ ہے اور نور سے مراد ذات ہے (زرقانی جلد اول صفحہ ۴۶) حدیث کے معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ السلام کے نور پاک یعنی ذاتِ مقدسہ کو اپنے نور یعنی اپنی ذاتِ مقدسہ سے پیدا فرمایا، اس کے یہ معنی نہیں کہ معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ کی ذات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات کا مادہ ہے یا نعوذ باللہ! حضور کا نور اللہ کے نور کا کوئی حصہ یا ٹکڑا ہے۔ تَعَالَی اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِیْرًا

☆ اگر کسی ناواقف شخص کا یہ اعتقاد ہے تو اسے توبہ کرنا فرض ہے۔ اس لئے کہ ایسا ناپاک عقیدہ خالص کفر و شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔ بلکہ اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی ذاتی تجلی فرمائی جو حسن الوہیت کا ظہور اول تھی۔ بغیر اس کے کہ ذاتِ خداوندی نورِ محمدی کا مادہ یا حصہ اور جزو قرار پائے۔ یہ کیفیت متشابہات میں سے ہے جس کا سمجھنا ہمارے لئے ایسا ہی ہے جیسا قرآن وحدیث کے دیگر متشابہات کا سمجھنا۔ البتہ نکتے اور لطیفے کے طور پر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح شیشہ آفتاب کے نور سے روشن ہو جاتا ہے لیکن آفتاب کی ذات یا اس کی نورانیت اور روشنی میں کوئی کمی نہیں واقع ہوتی اور ہمارا یہ کہنا بھی صحیح ہوتا ہے کہ شیشے کا نور آفتاب کے نور سے ہے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کا نور اللہ تعالیٰ کی ذات سے پیدا ہوا اور آئینہ محمدی نور ذاتِ احدی سے اس طرح منور ہوا کہ نورِ محمدی کو نورِ خداوندی سے قرار دینا صحیح ہوا لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ذات پاک یا اس کی کسی صفت میں کوئی نقصان اور کمی واقع نہیں

ہوئی۔ شیشہ سورج سے روشن ہوا اور اس ایک شیشے سے تمام شیشے منور ہو گئے۔ نہ پہلے شیشے نے آفتاب کے نور کو کم کیا نہ دوسرے شیشوں نے پہلے شیشے کے نور سے کچھ کمی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ فیضان وجود اللہ تعالیٰ کی ذات سے حضور ﷺ کو پہنچا اور حضور ﷺ کی ذات سے تمام ممکنات کو وجود کا فیض حاصل ہوا۔

☆ اس کے بعد اس شبہ کو بھی دور کرتے جایئے کہ جب ساری مخلوق حضور ﷺ کے نور سے موجود ہوئی تو ناپاک، خبیث اور قبیح اشیاء کی برائی اور قباحت معاذ اللہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف منسوب ہوگی۔ جو حضور ﷺ کی شدید توہین ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ آفتاب وجود ہیں اور کل مخلوقات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آفتاب وجود سے فیضان وجود حاصل کر رہی ہے۔ جس طرح اس ظاہری آفتاب کی شعاعیں تمام کرۂ ارضی میں جمادات و نباتات اور کل معدنیات جملہ موالید اور جواہر اجسام کے حقائق لطیفہ اور خواص و اوصاف مختلفہ کا اضافہ کر رہی ہیں اور کسی کی اچھی بری خاصیت کا اثر شعاعوں پر نہیں پڑتا نہ کسی چیز کے اوصاف و اثرات سورج کے لئے قباحت یا نقصان کا موجب ہو سکتے ہیں۔ دیکھئے زہریلی چیزوں کا زہر اور مہلک اشیاء کی یہ تاثیرات معدنیات و نباتات وغیرہ کے الوان طعوم و روائح کثافتیں خاعرا، اچھی بری بو سب کچھ سورج کی شعاعوں سے برآمد ہوتی ہے لیکن ان میں سے کسی چیز کی کوئی صفت سورج کے لئے عار کا موجب نہیں کیونکہ یہ تمام حقائق آفتاب اور اس کی شعاعوں میں انتہائی لطافت کے ساتھ پائے جاتے ہیں اور اس لطافت کے مرتبے میں کوئی اثر برا نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ جب وہ لطیف اثرات اور حقائق سورج اور اس کی شعاعوں سے نکل کر اس عالم اجسام میں پہنچتے اور رفتہ رفتہ ظہور پذیر ہوتے ہیں تو ان میں بعض ایسے اوصاف و خواص پائے جاتے ہیں جن کی بناء پر انہیں قبیح، ناپاک اور برا کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان برائیوں کا کوئی اثر سورج یا اس کی شعاعوں پر نہیں پڑ سکتا۔ اسی طرح عالم اجسام میں کثیف اور نجس چیزوں کا کوئی اثر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات پاک پر نہیں پڑ سکتا۔

☆ اس کے بعد یہ بات بھی سمجھنے کے قابل ہے کہ سورج کی شعاعیں ناپاک گندی چیزوں پر پڑنے سے ناپاک نہیں ہو سکتیں تو انوارِ محمدی کی شعاعیں عالم موجودات کی برائیوں اور نجاستوں سے معاذ اللہ کیونکر متاثر ہو سکتی ہیں۔ نیز یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور میں حقائق اشیاء پائی جاتی ہیں اور حقیقت کسی چیز کی نجس اور ناپاک نہیں ہوتی۔ نجاستیں مٹی میں دب کر مٹی ہو جانے کے بعد پاک ہو جاتی ہیں۔ نجاستوں کا جو کھاد کھیتوں میں ڈالا جاتا ہے اسی کے نجس اجزاء پودوں کی غذا بن کر غلہ اناج، پھول اور پھل سبزیوں اور ترکاریوں کی صورت میں ہمارے سامنے آ جاتے ہیں اور وہی اجزاء غلیظہ غلہ اور پھل بن کر ہماری غذا بن جاتے ہیں۔ جنہیں پاک سمجھ کر ہم کھاتے ہیں اور کسی قسم کا تردد دل میں نہیں لاتے۔ ثابت ہوا کہ ناپاکی کے اثرات صور و تعینات پر آتے ہیں جو محض امور اعتباریہ ہیں حقیقتیں ناپاک نہیں ہوا کرتیں۔ اس لئے کل مخلوق کا نور محمدی ﷺ سے موجود ہونا کسی اعتراض کا موجب نہیں۔

تقسیم نور

☆ حدیث جابر رضی اللہ عنہ میں جو بار بار تقسیم نور کا ذکر آیا ہے۔ اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ معاذ اللہ نور محمدی تقسیم ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ

نے جب نورِ محمدی کو پیدا فرمایا تو اس میں شعاع در شعاع بڑھاتا گیا اور وہی مزید شعاعیں تقسیم ہوتی رہیں۔ اس مضمون کی طرف علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اشارہ فرمایا۔ دیکھئے (زرقانی علی المواہب جلد اول ص ۴۶) رہا یہ شبہ کہ نورِ محمدی سے روح محمدی مراد ہے، لہٰذا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نور ہونا ثابت نہ ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث شریف میں "نُوْرَ نَبِيِّكَ مِنْ نُّوْرِهٖ" وارد ہے۔ جس طرح "نُوْرِهٖ" میں اضافت بیانیہ اور لفظ نور سے اللہ تعالیٰ مراد ہے، اسی طرح "نُوْرَ نَبِيِّكَ" میں اضافت بیانیہ ہے اور لفظ نور سے ذات پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مراد ہے۔ لہٰذا ذاتِ محمدی کو لفظ نور سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اس مقام پر یہ کہنا کہ صرف روح پاک نور ہے، جسم اقدس نور نہیں تو یہ بے خبری پر مبنی ہے جسم اقدس کی لطافت اور نورانیت پر انشاءاللہ ہم آئندہ گفتگو کریں گے، سردست اتنا عرض کردینا کافی سمجھتے ہیں کہ حدیث جابر میں تمام اشیاء سے پہلے جس نورِ محمدی کی خلقت کا بیان ہے وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات پاک کا نور ہے اور وہ اس لطیف حقیقت کو بھی شامل ہے جسے حضور ﷺ کے نورانی اور پاکیزہ اجزائے جسمیہ کا جوہر لطیف کہا جا سکتا ہے، اس لئے کہ وہ نور پاک آدم علیہ السلام کی پشت مبارک میں بطور امانت رکھا گیا ہے۔ علامہ زرقانی فرماتے ہیں "وَفِي الْخَبَرِ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالٰى اٰدَمَ جَعَلَ اَوْدَعَ ذٰلِكَ النُّوْرَ نُوْرَ الْمُصْطَفٰى فِيْ ظَهْرِهٖ فَكَانَ شِدَّةً يَلْمَعُ فِيْ جَبِيْنِهٖ الخ" زرقانی علی المواہب جلد اول ۴۹۔ مواہب اللدنیہ جلد اول ۱۰۔

ترجمہ: "حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو نورِ مصطفیٰ ﷺ کو ان کی پشت مبارک میں رکھ دیا اور نور پاک ایسا شدید چمک والا تھا کہ باوجود پشت آدم میں ہونے کے پیشانی آدم علیہ السلام سے چمکتا تھا اور آدم علیہ السلام کے باقی انوار پر وہ غالب ہو جاتا تھا۔

☆ یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہے کہ پشت آدم علیہ السلام میں ان کی تمام اولاد کے وہ لطیف اجزائے جسمیہ تھے جو انسانی پیدائش کے بعد اس کی ریڑھ کی ہڈی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور وہی اس کے اجزائے اصلیہ کہلائے جاتے ہیں۔ نہ صرف آدم علیہ السلام بلکہ ہر باپ کے صلب میں اس کی اولاد کے ایسے ہی لطیف اجزائے بدنیہ موجود ہوتے ہیں جو اس سے منتقل ہو کر اس کی نسل کہلاتی ہے اولاد کے ان ہی اجزائے جسمیہ کا آباء کے اصلاب میں پایا جانا باپ بیٹے کے درمیان ولدیت اور ابنیت کے رشتہ کا سنگ بنیاد اور سبب اصلی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت میں قیامت تک پیدا ہونے والی اولاد کے اجزائے اصلیہ رکھ دیئے۔ یہ اجزاء روح کے اجزا نہیں، نہ روح کا کل ہیں۔ کیونکہ ایک بدن میں ایک روح سما سکتی ہے۔ ایک سے زیادہ ایک بدن میں روح کا پایا جانا بداہتہً باطل ہے۔ لہٰذا آدم علیہ السلام کی پشت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روح مبارک نہیں رکھی تھی بلکہ جسم اقدس کے جوہر لطیف کی نورانی شعاعیں رکھی گئی تھیں جو نورِ ذاتِ محمدی ﷺ کی شعاعیں تھیں۔

☆ ارواحِ بنی آدم کا ان کے آباء کے اصلاب میں نہ رکھا جانا صحیحین کی اس حدیث سے ثابت ہے کہ استقرار حمل سے چار مہینے بعد اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو چار باتیں لکھنے کے لئے بھیجتا ہے اور وہ چار باتیں لکھ دیتا ہے۔ اس کا عمل، عمر، رزق اور دوزخی یا جنتی ہونا، پھر اس

میں روح پھونکی جاتی ہے۔ مشکوٰۃ ص ۴۰

☆ معلوم ہوا کہ اولاد کی روحیں باپ کے صلب میں نہیں رکھی جاتیں بلکہ شکم مادر میں پھونکی جاتی ہیں۔

ایک شبہ کا ضروری ازالہ

☆ شاید کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت مبارک سے ان کی قیامت تک پیدا ہونے والی تمام اولاد کو باہر نکال کر ان سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا تھا۔ معلوم ہوا کہ تمام بنی آدم کی ارواح آدم علیہ السلام کی پشت میں تھیں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ پشت آدم علیہ السلام سے ان کی اولاد کی ارواح نہیں نکالی گئی تھیں بلکہ وہ ان کے اشخاص مثالیہ تھے جو مثالی صورتوں میں ان کی پشت مبارک سے بہ قدرت ایزدی ظاہر کیے گئے تھے کیونکہ ہم ابھی حدیث صحیحین سے ثابت کر چکے ہیں کہ ماؤں کے پیٹ میں نفخ روح کیا جاتا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ نورِ محمدی اپنی عزت و کرامت کے مقام میں جلوہ گر رہا اور پشت آدم علیہ السلام میں اجزائے جسمانیہ کے جوہر لطیف کے انوار رکھے گئے تھے جو اصلاب طاہرہ اور ارحام طیبہ میں منتقل ہوتے رہے۔

تطبیق

☆ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ نورِ محمدی ﷺ آدم علیہ السلام کی پشت مبارک میں رکھا گیا اور بعض روایات میں وارد ہے کہ نورِ محمدی ﷺ آدم علیہ السلام کی پیشانی میں چمکتا تھا۔

☆ الحمدللہ! ہمارے اس بیان سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بدن مبارک بھی نور تھا۔

☆ صاحب روح المعانی حضور ﷺ کے اول خلق ہونے کے بارے میں ارقام فرماتے ہیں "وَلِـهٰذَا كَانَ نُوْرُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَّلُ الْمَخْلُوْقَاتِ فَفِي الْخَبَرِ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالٰى نُوْرَ نَبِيِّكَ يَا جَابِرُ" (تفسیر روح المعانی پ ۱۷ صفحہ ۹۶)

ترجمہ: "چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وصول فیض میں واسطہ عظمیٰ ہیں اسی لئے حضور ﷺ کا نور اول مخلوقات ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے، سب سے پہلی وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی وہ تیرے نبی کا نور ہے اے جابر۔"

☆ اس حدیث جابر مذکورہ کو مولوی اشرف علی صاحب تھانوی نے اپنی کتاب نشر الطیب کے ۶ پر تفصیل سے لکھا ہے

(۲) حدیث حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

☆ امام احمد بیہقی و حاکم نے حدیث عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرمائی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "بے شک میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک خاتم النبیین ہو چکا تھا اور آدم علیہ السلام ابھی اپنے خمیر میں تھے یعنی ان کا ابھی پتلا بھی نہ بنا تھا۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد کہا۔ مشکوٰۃ شریف میں بھی یہ حدیث بروایت شرح السنہ مذکور ہے۔ مواہب اللدنیہ جلد ا ص ۶

ایک شبہ کا ازالہ

☆ اگر یہ شبہ کیا جائے کہ خاتم النبیین کے معنی دنیا میں تمام نبیوں کے آخر میں آنے والا نبی، یہ معنی دنیا میں متحقق ہو سکتے ہیں، عالم ارواح

میں اس معنی کا ثابت ہونا ممکن نہیں۔ لہٰذا اس حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ حضور کا خاتم النبیین ہونا علم الٰہی میں مقدر تھا یا یہ کہنا پڑے گا کہ خاتم النبیین کے معنی آخری نبی نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خاتم النبیین کے معنی قطعاً آخری نبی ہیں......اور حدیث کا مطلب یہی ہے کہ میں فی الواقع خاتم النبیین ہو چکا تھا نہ یہ کہ میرا خاتم النبیین ہونا علم الٰہی میں مقدر تھا کیونکہ علم الٰہی میں تو ہر چیز مقدر تھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آخرالنبیین ہونے کا ثبوت اور ظہور دو الگ مرتبے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں ختم نبوت کے منصب پر اپنے حبیب ﷺ کو فائز فرمادیا۔ بایں معنی کہ سب نبیوں کے بعد ان کا سردار بن کر جانے والا نبی یہی محبوب ہے۔ اگرچہ جانے کا موقع ابھی نہ آیا ہو۔ یہ بالکل ایسا ہے کہ بادشاہ کسی کو امیر جہاد مقرر کردے تو اس امارت کا ظہور جہاد پر جانے کے بعد ہی ہوگا۔ اسکا منصب پہلے ہی سے ثابت ہوگیا۔ اسی طرح یہاں سمجھ لیں کہ منصب خاتم النبیین کا ثبوت حضور اکرم ﷺ کیلئے پہلے سے ثابت تھا لیکن اسکا ظہور دنیا میں تشریف لانیکے بعد ہوا۔

☆ اس بیان سے ایک اصول ظاہر ہوگیا کہ ثبوت کمال کے لئے اسی وقت ظہور لازم نہیں۔ اسی لئے اہل سنت کا مسلک ہے کہ حضور سید عالم ﷺ تمام کمالاتِ محمدیت کے ساتھ متصف ہو کر پیدا ہوئے لیکن ان کا ظہور اپنے اپنے اوقات میں حسب حکمت و مصلحت خداوندی ہوا۔

(۳) حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ کو نبوت کب ملی؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "وَاٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ" آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے یعنی ان کے جسم میں جان نہیں ڈالی گئی تھی۔ یہ روایت ترمذی شریف کی ہے اور علامہ ابو عیسیٰ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ انہیں الفاظ میں حضرت میسرہ سے ایک حدیث مروی ہے۔ امام احمد بن حنبل نے اس حدیث کو روایت کیا اور امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابو نعیم نے حلیہ میں یہ حدیث روایت کی اور حاکم نے اس کی تصحیح فرمائی۔ (مواہب اللدنیہ جلد ا ص ٦)

(۴) حدیث حضرت امام زین العابدین علیٰ اٰبائہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام

☆ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ اپنے والد ماجد سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اور وہ اپنے والد مکرم حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "میں پیدائش آدم علیہ السلام سے چودہ ہزار سال پہلے اپنے پروردگار کے حضور میں ایک نور تھا۔ (انسان العیون جلد ا صفحہ ۲۹)

ازالہ شبہ

☆ اس روایت میں خلق آدم علیہ السلام سے صرف چودہ ہزار برس پہلے حضور ﷺ کے نور پاک کا ذکر ہے۔ حالانکہ بعض روایتوں میں اس سے بہت زیادہ سالوں کا ذکر بھی وارد ہے۔ یہ تعارض کیسے رفع ہوگا۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں چودہ ہزار برس کا ذکر ہے۔ اس سے زیادہ کی نفی نہیں۔ لہٰذا کسی دوسری روایت میں چودہ ہزار

سے زیادہ سالوں کا وارد ہونا تعارض کا موجب نہیں۔

(۵) حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے دریافت کیا، آپ کی عمر کتنے سال ہے؟ عرض کیا، حضور! اسکے سوا میں کچھ نہیں جانتا کہ چوتھے حجاب عظمت میں ہر ستر ہزار برس کے بعد ایک ستارہ طلوع ہوتا تھا جسے میں نے اپنی عمر میں ستر ہزار مرتبہ دیکھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا، اے جبرائیل! میرے رب کی عزت وجلال کی قسم! وہ ستارہ میں ہوں۔

(انسان العیون جلد ا صفحہ ۲۹، روح البیان جلد ۳ صفحہ ۵۴۳)

☆ آیات واحادیث کی روشنی میں بعض علماء مفسرین کی تصریحات کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی خلقت مبارکہ کا نہایت مختصر بیان ناظرین کرام کے سامنے آ گیا اور اس اثناء میں بعض فوائد بھی مذکور ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد ولادتِ محمدی ﷺ کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔

ولادتِ محمدی ﷺ

☆ بیانِ سابق میں یہ بات ہو چکی ہے کہ حضور ﷺ کا نورِ پاک آدم علیہ السلام کی پشت میں رکھا گیا جو ان کی پیشانی میں چمکتا تھا۔ نورِ مبین اصلاب طاہرہ اور ارحام طیبہ میں منتقل ہوتا رہا۔ جیسا کہ ابو نعیم کی روایت میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے تمام آباؤ اجداد سفاح سے پاک ہیں۔ یعنی میرے والدین ماجدین سے لے کر آدم و حوا علیہم السلام تک کوئی مرد یا عورت ایسا نہیں ہوا جس نے معاذ اللہ کسی قسم کی فحاشی یا بے حیائی کا کام کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ہمیشہ اصلابِ طیبہ سے ارحام مطہرہ کی طرف منتقل فرمایا۔ (مواہب اللدنیہ جلد ۱)

☆ مشکوٰۃ شریف میں حضرت واثلہ بن الاسقع سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا سرکار ارشاد فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو منتخب کیا اور کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو۔ بعض دیگر روایات میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنا صفی اور برگزیدہ بنا کر انکی اولاد میں سے حضرت نوح علیہ السلام کو اپنا صفی اور برگزیدہ بنا کر انکی اولاد میں سے حضرت نوح علیہ السلام کو چن لیا اور نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو برگزیدہ فرما لیا۔ الخ۔ (مشکوٰۃ، ص: ۵۱۱)

☆ دلائل النبوۃ میں ابو نعیم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت لاتے ہیں۔ ام المؤمنین رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتی ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت جبرائیل علیہ السلام سے نقل فرماتے ہیں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا میں تمام مشارق ومغارب میں پھرا میں نے حضرت محمد ﷺ جیسا فضیلت والا کوئی نہ پایا، نہ خاندانِ بنی ہاشم کی طرح کوئی خاندان افضل دیکھا۔ (انسان العیون جلد ا ص ۲۶)

☆ حافظ ابو سعید نیشاپوری ابو بکر ابن ابی مریم سے اور وہ ابو سعید بن عمرو انصاری سے اور وہ اپنے والد ماجد سے اور ان کے والد ماجد سیدنا کعب احبار رضی اللہ عنہ سے نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا نورِ مبارک جب حضرت عبدالمطلب میں منتقل ہوا اور وہ جواب ہو گئے تو ایک دن حطیم کعبہ میں سوئے، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ آنکھ میں سرمہ لگا ہوا ہے، سر میں تیل پڑا ہوا ہے اور حسن و جمال کا لباس زیبِ تن ہے۔ وہ نہایت حیران ہوئے کہ نہیں معلوم، یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ ان کے والدین ان کا ہاتھ پکڑ کر کاہنوں کے پاس لے گئے اور تمام واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس واقعہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نوجوان کو نکاح کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے قبیلہ سے نکاح کیا۔ پھر ان کی وفات کے بعد فاطمہ سے نکاح کیا اور وہ حضور ﷺ کے والد ماجد حضرت عبداللہ کے ساتھ حاملہ ہو گئیں یعنی حضور ﷺ کے والد ماجد جناب عبداللہ اپنی والدہ کے شکم مبارک میں جلوہ گر ہو گئے۔ جناب عبدالمطلب کے جسم سے مشک کی خوشبو آتی تھی اور رسول اللہ ﷺ کا نورِ مبارک ان کی پیشانی میں چمکتا رہا۔ جب مکہ میں قحط ہوتا تو لوگ عبدالمطلب کا ہاتھ پکڑ کر جبل ثبیر کی طرف جاتے تھے اور ان کے ذریعے سے تقربِ خداوندی ڈھونڈتے اور بارش کے لئے دعائیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو نورِ محمدی ﷺ کے طفیل قبول فرماتا اور کثرت سے رحمت کی بارش برستی۔ (مواہب اللدنیہ جلد اول صفحہ ۱۵)

☆ ابو نعیم اور خرائطی اور ابن عساکر نے بطریق عطا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ جب حضرت عبدالمطلب اپنے فرزند جلیل جناب عبداللہ کو نکاح کرنے کی غرض سے لے کر چلے تو راستہ میں ایک کاہنہ ملی جو یہودیہ ہو گئی تھی اور وہ کتب سابقہ پڑھی ہوئی تھی، اس کو فاطمہ خثعمیہ کہتے تھے، اس نے حضرت عبداللہ کے چہرے میں نورِ نبوت چمکتا ہوا دیکھا تو حضرت عبداللہ کو اپنی طرف بلانے لگی۔ مگر حضرت عبداللہ نے انکار فرمایا۔ (مواہب اللدنیہ جلد اول صفحہ ۱۹)

☆ حضور سید عالم ﷺ کے آباؤ امہات الی آدم وحوا علیہما السلام کے زنا وفحاشی سے پاک ہونے پر اجماعِ امت ہے، البتہ ہر فرد کے مؤمن ہونے میں اختلاف ہے۔ روافض نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جمیع آباء کے ہر ہر فرد کو مومن ماننا قطعی اور ضرورتِ ایمان سے قرار دیا اور اہلِ سنت نے اس کو ظنی اور مجتہد فیہ مانا۔ اسی وجہ سے اس مسئلہ میں علماء کے اقوال مختلف ہو گئے۔ لیکن متاخرین جمہورِ اہلِ سنت کا مسلک یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین ماجدین سے لے کر آدم وحوا علیہما السلام تک کل آباؤ امہات مومن و موحد ہیں اور کسی کا کفر وشرک قطعاً ثابت نہیں۔ ان محققین متاخرین کے نزدیک آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نہیں بلکہ چچا ہیں۔ محاوراتِ عرب میں چچا پر باپ کا اطلاق اکثر ہوتا ہے اور جن روایات میں "اِنِّیْ اَبِیْ وَاَبَاکَ فِی النَّارِ" آیا ہے وہاں بھی لفظ "اب" سے ابولہب وغیرہ مشرکین مراد ہیں۔ والدہ مکرمہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو استغفار کا اذن نہ ہونا بھی معاذ اللہ ان کے کفر کی دلیل نہیں بلکہ گناہوں سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ غیر نبی اور غیر رسول کے لئے استغفار کا اذن نہ ہونا بھی معاذ اللہ ان کے کفر کی دلیل نہیں بلکہ گناہوں سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ غیر نبی اور غیر رسول کے لئے استغفار کا لفظ اس کے حق میں گناہ کا وہم پیدا کرتا ہے۔ چونکہ حضور ﷺ کے والدین ایامِ فترۃ میں تھے اس لئے ان کی نجات کے لئے اعتقادِ توحید کافی تھا۔

کسی شریعت واحکام الٰہی کا اس وقت وجود نہ تھا جس کی وجہ سے کوئی گناہ قرار پاتا اور اس سے ان کا بچنا ضروری ہوتا۔ لہٰذا ان کے حق میں استغفار کا اذن نہ ہوا تا کہ کسی کا ذہن ان کے گناہ کا وہم پیدا نہ کرے۔

☆ نیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین ماجدین کا زندہ ہونے کے بعد ایمان بھی اس لئے نہ تھا کہ معاذ اللہ وہ کفر پر مرے تھے بلکہ صرف اس لئے ان کو زندہ کیا گیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے کی فضیلت بھی انہیں حاصل ہو جائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین کریمین کی بابت فقہ اکبر کی عبارت "مَاتَا عَلَى الْكُفْرِ عَلٰى حَذْفِ الْمُضَافِ" ہے "اَیْ مَاتَا عَلٰى عَهْدِ الْكُفْرِ" یعنی موت حضور ﷺ کی نبوت اور اسلام کے ظہور سے پہلے اس عہد میں ہوئی جو کفر و جاہلیت کا عہد اور زمانہ تھا۔ یہ نہیں کہ معاذ اللہ وہ بحالت کفر مرے ہوں۔

☆ ملا علی قاری نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین معظمین کے کفر پر بہت زور دیا ہے لیکن اخیر میں رجوع کر لیا ہے اور توبہ کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ جیسا کہ حاشیہ نبراس حاشیہ نمبر ۵، صفحہ ۵۲۶ پر ہے "ونقل توبة عن ذالک فی القول المستحسن (۱۲)

فائدہ: حضور ﷺ کے والدین کا کفر ثابت کرنے میں ملا علی قاری نے جس شدت اور غلو سے کام لیا اہل علم پر مخفی نہیں۔ اس کے باوجود بھی انہیں توبہ کی توفیق نصیب ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس مسئلہ کے سوا باقی تمام مسائل میں خوش عقیدہ تھے۔ ظاہر ہے کہ خوش عقیدگی ضائع ہونے والی چیز نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کی توفیق ان کے شامل حال ہوئی اور وہ اس قول شنیع سے تائب ہوئے۔ فقیر کا رجحان طبع یہ ہے کہ ملا علی قاری کے علاوہ بھی جن خوش عقیدہ لوگوں سے ایسی لغزش ہوگئی ہے ان کے حق میں بھی ہمیں یہی حسن ظن رکھنا چاہئے کہ مرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی توفیق عطا فرمادی ہوگی۔ وَمَا ذَالِکَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

☆ تفسیر کبیر وغیرہ میں بعض علماء کا وہ کلام جو انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین کا ایمان ثابت کرنے والوں کے دلائل پر کیا ہے۔ درحقیقت وہ ان روافض کا رد ہے جو اس مسئلہ کو قطعی قرار دے کر اسے ضرورت دین میں شمار کرتے ہیں۔ جیسا کہ عنوانِ کلام "قَالَتِ الشِّيْعَةُ" اور "قَالَ اَصْحَابُنَا" سے واضح ہے۔ یہ نہیں کہ ان کا یہ کلام اہل سنت کے رد میں ہے اور معاذ اللہ انہوں نے حضور سید عالم ﷺ کے والدین ماجدین کو کافر کہہ کر اللہ کے پیارے حبیب ﷺ کو ایذا پہنچائی ہو۔ معاذ اللّٰہ ثم معاذ اللّٰہ

☆ مواہب اللدنیہ میں امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں کہ اصحاب فیل کا بادشاہ ابرہہ معاذ اللہ خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے مکہ معظمہ پر چڑھائی کرنے آیا تو حضرت عبدالمطلب قریش کے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر جبل شبیر پر چڑھ گئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کا نورِ مبارک جناب عبدالمطلب کی پیشانی میں بشکل ہلال نمودار ہو کر اس قدر قوت سے چمکا کہ اس کی شعاعیں خانہ کعبہ پر پڑیں۔ حضرت عبدالمطلب نے اپنی پیشانی کے نور کو خانہ کعبہ پر چمکتا ہوا دیکھ کر قریش سے فرمایا کہ واپس چلو۔ میری پیشانی کا نور اس طرح چمکا ہے، یہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ ہم لوگ غالب رہیں گے۔ (مواہب اللدنیہ، جلد ا صفحہ ۱۵)

☆ حضرت عبدالمطلب کے اونٹ ابرہہ کے لشکر والے پکڑ کر لے گئے تھے۔ انہیں چھڑانے کے لئے جناب عبدالمطلب ابرہہ کے

پاس گئے۔ آپ کی صورت دیکھتے ہی عظمت وہیبت نور کی وجہ سے ابرہہ از راہِ تعظیم فوراً تخت سے نیچے اترا پھر جناب عبدالمطلب کو اپنے برابر بٹھا لیا۔ (مواہب اللدنیہ جلد ۱، تاریخ حبیب الٰہ)

☆ ابرہہ نے لشکر کی خبر دینے کے لئے اپنی قوم کا ایک آدمی بھیجا۔ جب وہ مکہ معظمہ میں داخل ہوا اور اس نے جناب عبدالمطلب کے چہرہ کو دیکھا تو فوراً جھک گیا اور اس کی زبان لرزنے لگی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا، جس طرح بیل ذبح ہوتے وقت خراٹے مارنے لگتا ہے۔ جب ہوش میں آیا تو عبدالمطلب کے سامنے سجدہ کرتا ہوا گر پڑا اور کہنے لگا، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ یقیناً سید قریش ہیں۔ (مواہب اللدنیہ جلد اول، صفحہ ۱۵)

☆ ابرہہ کا ایک بہت بڑا سفید رنگ کا ہاتھی تھا باقی سب ہاتھی سدھائے ہوئے ہونے کی وجہ سے اسے سجدہ کیا کرتے تھے اور اس بڑے ہاتھی نے باوجود سدھائے ہوئے ہونے کے بھی ابرہہ کو کبھی سجدہ نہ کیا۔ جب حضرت عبدالمطلب ابرہہ بادشاہ کے پاس تشریف لائے تو اس نے سائیس کو حکم دیا کہ اس بڑے سفید رنگ والے ہاتھی کو حاضر کرے۔ جب ہاتھی حاضر ہوا اور اس نے جناب عبدالمطلب کے چہرہ پر نظر کی تو ان کے سامنے ادب سے اس طرح بیٹھ گیا جیسے اونٹ بیٹھتا ہے، پھر سجدہ کرتا ہوا گر پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے قوتِ گویائی دی۔ ہاتھی نے کہا "اَلسَّلَامُ عَلَی النُّوْرِ الَّذِیْ فِیْ ظَھْرِکَ یَا عَبْدُ الْمُطَّلِبْ" سلام ہو اس نور پر جو تمہاری پیٹھ میں ہے اے عبدالمطلب۔ (مواہب اللدنیہ جلد ۱، صفحہ ۱۵۔۱۶، انسان العیون جلد اول، صفحہ ۵۷)

عبد المطلب کی نذر اور خواب اور حضرت عبد اللہ بن عبد المطلب کی قربانی

☆ ابتداء میں حضرت عبدالمطلب کے صرف ایک صاحبزادے حارث تھے۔ آپ نے نذر مانی کہ اللہ تعالیٰ اگر مجھے پورے دس بیٹے عنایت فرمائے اور وہ سب میرے معاون ہوں تو ان میں سے ایک بیٹے کی میں قربانی کروں گا۔ اس کے بعد حضرت عبدالمطلب زمزم کھودنے میں مصروف ہو گئے اور یہ کام ان کے لئے بڑی عزت و فخر کا موجب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دس بیٹے پورے کر دیئے جن کے نام حسب ذیل ہیں

(۱) حارث (۲) زبیر (۳) حجل (۴) ضرار

(۵) مقوم (۶) ابولہب (۷) عباس (۸) حمزہ

(۹) ابوطالب (۱۰) عبداللہ

☆ ان بیٹوں سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں تو ایک رات جناب عبدالمطلب کعبہ مطہرہ کے پاس قیام لیل میں مشغول تھے۔ خواب میں دیکھا کہ ایک کہنے والا کہہ رہا ہے کہ عبدالمطلب اس بیت (کعبہ شریف) کے رب کی جو نذر مانی تھی وہ پوری کیجئے۔ عبدالمطلب مرعوب ہو کر گھبرائے ہوئے اٹھے اور حکم دیا کہ فوراً ایک مینڈھا ذبح کر کے فقراء و مساکین کو کھلا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا

گیا۔ اگلی رات پھر سوئے تو خواب میں دیکھا۔ کہنے والا کہہ رہا ہے ''اس سے بڑی چیز قربان کیجئے۔'' بیدار ہو کر اونٹ قربان کیا اور مساکین کو کھلا دیا۔ پھر اگلی رات سوئے تو ندا آئی اس سے بھی بڑی چیز قربان کیجئے۔ فرمایا، اس سے بڑی کیا چیز ہے؟ ندا دینے والے نے کہا ''اپنے ایک بیٹے کی قربانی دیجئے، جس کی آپ نے نذر مانی تھی۔ آپ یہ سن کر غمگین ہوئے اور اپنے سب بیٹوں کو جمع کیا اور انہیں وفاءِ نذر کی طرف دعوت دی۔ سب نے کہا ہم آپ کی اطاعت کریں گے۔ آپ ہم میں سے جس کو چاہیں ذبح کر دیں۔ آپ نے فرمایا، قرعہ اندازی کر لو۔ قرعہ اندازی میں حضرت عبداللہ کا نام نکلا۔ جو جناب عبدالمطلب کے محبوب ترین بیٹے تھے۔ قرعہ نکلنے کے بعد عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کا ہاتھ پکڑا، چھری لی اور ذبح کرنے کے لئے چل دیئے۔ جب چھری پھیرنے کا ارادہ کیا تو سادات قریش جمع ہو گئے اور عبدالمطلب سے کہنے لگے ''آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' انہوں نے فرمایا ''میں اپنی نذر پوری کرنا چاہتا ہوں۔'' سردارانِ قریش بولے ہم آپ کو ایسا نہ کرنے دیں گے۔ آپ اپنے رب کی بارگاہ میں عذر کر کے سبکدوش ہو جائیں۔ اگر آپ ایسا کر بیٹھے تو ہمیشہ کے لئے بیٹا ذبح کرنے کی سنت جاری ہو جائے گی۔ سردارانِ قریش نے مشورہ کر کے جناب عبدالمطلب سے کہا، چلئے فلاں کاہنہ کے پاس چلیں، جس کا نام قطبہ ہے (بعض نے ان کا نام سجاح بتایا ہے) شاید وہ آپ کو ایسی بات بتائے جس میں آپ کے لئے کشادگی اور گنجائش ہو۔ یہ سب لوگ کاہنہ کے پاس پہنچے اور تمام واقعہ اسے بتایا۔ اس نے کہا، تم میں خون بہا کتنا ہوتا ہے۔ کہا، دس اونٹ۔ اس نے بتایا، آپ سب لوگ واپس چلے جائیں اور دس اونٹ اور عبداللہ کے درمیان قرعہ اندازی کریں۔ اگر قرعہ عبداللہ کے نام کا نکل آئے تو دس اونٹ بڑھا کر پھر قرعہ ڈالیں اور جب تک عبداللہ کا نام نکلتا رہے، دس اونٹ بڑھاتے جائیں۔ یہاں تک کہ اونٹوں کے نام کا قرعہ ڈالیں، جب ایسا ہو تو ان اونٹوں کو عبداللہ کے بجائے ذبح کر دیا جائے۔ وہ قربانی گویا عبداللہ کی قربانی ہو گی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ہر قرعہ پر عبداللہ کا نام نکلتا رہا اور دس اونٹ بڑھاتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب سو اونٹ تک پہنچے تو جناب عبداللہ کی بجائے اونٹوں کا نام قرعہ میں نکلا اور سو اونٹوں کو قربان کر دیا گیا۔ یہ قربانی اونٹوں کی نہیں بلکہ جناب عبداللہ (حضور ﷺ کے والد ماجد) کی قربانی قرار پائی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں۔ یعنی حضرت اسماعیل بن حضرت ابراہیم علیہما السلام اور عبداللہ بن عبدالمطلب کا۔ انتہیٰ ہو مواہب اللدنیہ جلد ۱، صفحہ ۱۶۔ ۱۷

☆ بعض روایات میں آیا ہے کہ جناب عبدالمطلب نے بیٹا ذبح کرنے کی نذر اس وقت مانی تھی جب آپ کو زمزم کا کنواں کھودنے کا خواب میں حکم دیا گیا تھا اور اس سلسلہ میں آپ کو کچھ پریشانی لاحق ہوئی تو آپ نے نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کام کو مجھ پر آسان کر دیا تو میں ایک بیٹا اللہ کے نام پر قربان کروں گا۔ (مواہب اللدنیہ جلد ۱، صفحہ ۱۷)

نسب شریف

☆ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ ترمذی سے بروایت حضرت عباس مروی ہے کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ میں محمد ہوں عبداللہ کا بیٹا اور عبدالمطلب کا پوتا، اللہ تعالیٰ نے جو مخلوق کو پیدا کیا تو مجھے اچھے گروہ میں بنایا یعنی انسان بنایا۔ انسان میں دو فرقے پیدا کئے۔

عرب اور عجم مجھے اچھے فرقے یعنی عرب میں بنایا پھر عرب میں کئی قبیلے بنائے اور مجھ کو سب سے اچھے قبیلے میں پیدا کیا یعنی قریش میں پھر قریش میں کئی خاندان بنائے اور مجھ کو سب سے اچھے خاندان میں پیدا کیا یعنی بنی ہاشم میں۔ پس میں ذاتی طور پر بھی سب سے اچھا ہوں اور خاندان میں بھی سب سے اچھا ہوں۔

☆ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں نکاح سے پیدا ہوا ہوں اور سفاح یعنی بدکاری سے پیدا نہیں ہوا ہوں آدم علیہ السلام سے لے کر میرے والدین تک سفاح یعنی جاہلیت کا کوئی مورث مجھ کو نہیں پہنچا یعنی زمانہ جاہلیت میں جو بے احتیاطی ہوا کرتی تھی میرے آباؤ امہات سب اس سے منزہ رہے، پس میرے نسب میں اس کا کوئی میل نہیں ہے۔ روایت کیا اس کو طبرانی، ابونعیم اور ابن عسا کرنے اوسط میں (مواہب اللدنیہ)

☆ ابونعیم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا مرفوعاً یعنی حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے اسلاف میں سے کبھی کوئی مرد عورت بطور سفاح کے نہیں ہے۔ کبھی کا مطلب یہ ہے کہ جس قربت کو میرے نسب میں بھی دخل نہ ہو مثلاً حمل ہی نہ ٹھہرا ہو، وہ بھی بلا نکاح نہیں ہوئی یعنی آپ کے سب اصول ذکور واناث ہمیشہ برے کام سے پاک رہے، اللہ تعالیٰ مجھ کو اصلاب طیبہ سے ارحام طاہرہ کی طرف مصفیٰ مہذب کر کے منتقل کرتا رہا۔ جب کبھی دو شعبے ہوئے جیسے عرب وعجم پھر قریش وغیر قریش وعلیٰ ہذا میں بہترین شعبے میں رہا۔ (مواہب اللدنیہ)

☆ دلائل ابونعیم میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتی ہیں اور آپ جبرائیل علیہ السلام سے حکایت فرماتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تمام مشرق ومغرب میں پھرا سو میں نے کوئی شخص محمد ﷺ سے افضل نہیں دیکھا اور نہ کوئی خاندان بنی ہاشم سے افضل دیکھا اور اس طرح طبرانی نے اوسط میں بیان کیا ہے شیخ الاسلام حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ آثار صحت کے اس متن یعنی حدیث کے صفحات پر نمایاں ہیں۔ (مواہب اللدنیہ) یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام کے اس قول کا یوں ترجمہ کیا گیا ہے

آفاقہا گردیدہ ام
مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام
لیکن تو چیزے دیگری

☆ مشکوٰۃ میں مسلم سے روایت واثلہ بن الاسقع سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو منتخب کیا اور کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو اور ترمذی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کو منتخب کیا۔

نسب نامہ

☆ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناب بن قصیٰ بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان

فائدہ: ہم نے حضور ﷺ کا نسب نامہ جناب عدنان تک لکھا ہے کیونکہ اس کے بعد نسب بیان کرنے والوں کے بارے میں ارشاد ہوا ”کذب النسابون“ اور محتاط علماء نے بھی یہیں تک آپ کا نسب شریف لکھا ہے۔

زمانۂ طفولیت

☆ ابن شیخ نے خصائص میں ذکر کیا ہے کہ آپ کا گہوارہ (یعنی جھولا) فرشتوں کی جنبش دینے سے ہلا کرتا تھا۔ (مواہب اللدنیہ)

بیہقی اور ابن عساکر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت حلیمہ کہتی تھیں کہ انہوں نے جب آپ کا دودھ چھڑایا تو آپ نے دودھ چھڑانے کے ساتھ ہی سب سے اول جو کلام فرمایا وہ یہ تھا ”اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا وَّالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا وَّ سُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا“ جب آپ ذرا سمجھدار ہوئے تو باہر تشریف لے جاتے اور لڑکوں کو کھیلتا دیکھتے مگر ان سے علیحدہ رہتے (یعنی کھیل میں شریک نہ ہوتے) (مواہب اللدنیہ)

☆ ابن سعد، ابونعیم اور ابن عساکر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت حلیمہ آپ کو کہیں دور نہ جانے دیا کرتیں۔ ایک بار ان کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ آپ اپنی رضاعی بہن شیماء کے ساتھ عین دوپہر کے وقت مویشی کی طرف چلے گئے۔ حضرت حلیمہ آپ کی تلاش میں نکلیں۔ یہاں تک کہ آپ کو بہن کے ساتھ پایا۔ کہنے لگیں کہ اس گرمی میں (ان کو لائی ہو) بہن نے کہا، اماں میرے بھائی کو گرمی ہی نہیں لگی۔ میں نے ایک بادل کا ٹکڑا دیکھا جو ان پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ جب ٹھہر جاتے تھے وہ بھی ٹھہر جاتا تھا اور جب یہ چلنے لگتے تو وہ بھی چلنے لگتا یہاں تک کہ اس موقع تک اسی طرح پہنچے۔ (مواہب اللدنیہ)

☆ حضرت حلیمہ سعدیہ سے روایت ہے کہ میں (طائف سے) بنی سعد کی عورتوں کے ہمراہ دودھ پینے والے بچوں کی تلاش میں مل کر چلی (اس قبیلہ کا یہی کام تھا) اور اس سال سخت قحط تھا، میری گود میں ایک بچہ تھا۔ مگر اتنا دودھ نہ تھا کہ اس کو کافی ہوتا۔ رات بھر اس کے رونے کی وجہ سے نیند نہ آتی اور نہ ہماری اونٹنی کے دودھ ہوتا۔ میں ایک دراز گوش پر سوار تھی جو غایت لاغری سے سب کے ساتھ نہ چل سکتا تھا۔ ہمراہی بھی اس سے تنگ آ گئے تھے۔ ہم مکہ میں آئے تو رسول اللہ ﷺ کو جو عورت دیکھتی اور یہ سنتی کہ آپ یتیم ہیں کوئی قبول نہ کرتی (کیونکہ زیادہ انعام و اکرام کی توقع نہ ہوتی اور ادھر ان کو دودھ کی کمی کے سبب کوئی بچہ نہ ملا) میں نے اپنے شوہر سے کہا، یہ تو اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں خالی جاؤں۔ میں تو اس یتیم کو لاتی ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ برکت عطا کرے۔ غرض میں آپ کو جا کر لے آئی۔ جب اپنی فرودگاہ پر لائی اور گود میں لے کر دودھ پلانے بیٹھی تو دودھ اس قدر اترا کہ آپ کے رضاعی بھائی نے خوب آسودہ ہو کر پیا اور پیٹ بھر کر سو گئے اور میرے شوہر نے جو اونٹنی کو جا کر دیکھا تو تمام دودھ ہی

دودھ بھرا تھا۔ غرض اس نے دودھ نکالا اور ہم سب نے اونٹنی کا دودھ خوب سیر ہو کر پیا اور رات بڑے آرام سے گزری اور اس سے پہلے سونا میسر نہ ہوتا تھا۔ شوہر کہنے لگا، اے حلیمہ تو تو بڑے برکت والے بچے کو لائی۔ میں نے کہا، ہاں! مجھے بھی امید ہے۔ پھر مکہ سے روانہ ہوئے اور آپ کو لے کر اسی دراز گوش پر سوار ہوئی، پھر تو اس کا یہ حال تھا کہ کوئی سواری اس کو پکڑ نہ سکتی تھی۔ میری ہمراہی عورتیں تعجب سے کہنے لگیں کہ حلیمہ ذرا آہستہ چلو۔ یہ وہی تو ہے جس پر تم آئی تھیں۔ میں نے کہا، ہاں وہی ہے۔ وہ کہنے لگیں، بے شک اس میں کوئی بات ہے۔ پھر ہم اپنے گھر پہنچے اور وہاں سخت قحط تھا لیکن میری بکریاں دودھ بھری آتیں اور دوسروں کو اپنے جانوروں میں ایک قطرہ دودھ کا نہ ملتا۔ میری قوم کے لوگ اپنے چرواہوں سے کہتے کہ ارے تم بھی وہیں چراؤ جہاں حلیمہ کے جانور چرتے ہیں۔ ان لوگوں کے کہنے پر چرواہوں نے اپنے جانور میرے جانوروں کی چراگاہ میں چرنے کے لئے چھوڑے مگر پھر بھی ان کے جانور خالی آتے اور میرے جانور بھرے آتے (کیونکہ چراگاہ میں کیا رکھا تھا وہ تو بات ہی اور تھی) غرض ہم برابر خیر و برکت کا مشاہدہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دو سال پورے ہو گئے اور میں نے آپ کا دودھ چھڑایا۔ آپ کا نشو ونما اور بچوں سے بہت زیادہ تھا۔ یہاں تک کہ دو سال کی عمر میں اچھے بڑے معلوم ہونے لگے۔ پھر ہم آپ کو آپ کی والدہ کے پاس لائے مگر آپ کی برکت کی وجہ سے ہمارا جی چاہتا تھا کہ آپ اور رہیں اس لئے آپ کی والدہ سے اصرار کر کے دوبارہ مکہ میں جانے کے بہانے پھر اپنے گھر لے آئے۔ سو چند مہینے بعد ایک بار آپ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ مویشی میں پھر رہے تھے کہ یہ بھائی دوڑتا ہوا آیا، مجھ سے اور اپنے باپ سے کہا کہ میرے قریشی بھائی کو دو سفید کپڑے والے آدمیوں نے پکڑ لیا اور شکم چاک کیا۔ میں اسی حال میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ سو ہم دونوں گھبرائے ہوئے گئے دیکھا کہ آپ کھڑے ہیں لیکن رنگ متغیر ہے۔ میں نے پوچھا، بیٹا کیا تھا۔ فرمایا، دو شخص سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے اور مجھ کو لٹایا اور پیٹ چاک کر کے کچھ ڈھونڈ کر نکالا۔ معلوم نہیں کیا تھا۔ ہم آپ کو اپنے ڈیرے پر لائے۔ تب شوہر نے کہا، حلیمہ اس لڑکے کو آسیب کا اثر ہے۔ قبل اس کے کہ اس کا زیادہ اثر ہو، ان کے گھر پہنچا آ۔ میں آپ کی والدہ کے پاس لے کر گئی۔ آپ نے فرمایا، تو تو اس کو رکھنا چاہتی تھی۔ پھر کیوں لے آئی؟ میں نے کہا، اب خدا کے فضل سے ہوشیار ہو گئے ہیں اور میں اپنی خدمت کر چکی۔ خدا جانے کیا اتفاق ہوتا، اس لئے لائی ہوں۔ انہوں نے فرمایا، یہ بات نہیں، سچ بتلا؟ میں نے سب قصہ سچ سچ بیان کیا۔ کہنے لگیں، تجھ کو ان پر شیطان کے اثر کا اندیشہ ہے؟ میں نے کہا، ہاں۔ کہنے لگیں، ہرگز نہیں۔ واللہ! شیطان کا ان پر کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ میرے بیٹے کی ایک خاص شان ہے۔ پھر انہوں نے بعض حالات حمل اور ولادت کے بیان کئے اور بعد میں فرمایا، اچھا ان کو چھوڑ دو اور خیریت کے ساتھ جاؤ۔ (سیرت ابن ہشام)

☆ حلیمہ کے اس لڑکے کا نام عبداللہ ہے اور یہ انیسہ اور جذامہ کے بھائی ہیں اور یہ جذامہ شیماء کے نام سے مشہور ہیں اور یہ سب اولاد ہیں حارث بن عبدالعزیٰ کی جو شوہر ہیں حلیمہ کے۔ (فی زاد المعاد)

☆ بعض اہل علم نے ان سب کے ایمان کی تصریح کی ہے۔ (شمامۃ اورزادالمعاد)

☆ محمد بن اسحاق نے ثور بن یزید سے (اس بار کے شق صدر کے بعد کا واقعہ) مرفوعاً ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان سفید پوش شخصوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ ان کو اوران کی امت کے دس آدمیوں کے ساتھ وزن کرو۔ چنانچہ وزن کیا تو میں بھاری نکلا۔ پھر اسی طرح سو آدمیوں کے ساتھ، پھر ہزار آدمیوں کے ساتھ کیا۔ پھر کہا، بس کرو۔ واللہ! اگر ان کو ان کی تمام امت سے وزن کرو گے تب بھی یہ وزنی نکلیں گے۔ (سیرت ابن ہشام)

☆ اس جملہ میں آپ کو بشارت سنائی کہ آپ نبی ہونے والے ہیں۔ آپ کا شق صدر اور قلب اطہر کا دھلنا چار بار ہوا۔ ایک تو یہی جو ذکر کیا گیا۔ دوسری بار دس سال کی عمر میں صحرا میں ہوا تھا۔ تیسری بار وقت بعثت کے ماہِ رمضان غارِ حرا میں۔ چوتھی بار شب معراج میں اور پانچویں بار ثابت نہیں۔ (شمامۃ، بتغیر یسیر)

☆ ایام طفولیت مبارکہ میں شق صدر کے بعد سینۂ اقدس کو ٹانکے لگائے گئے

☆ صحیح مسلم جلد اول صفحہ ۹۲ پر حضرت انس سے مروی ہے کہ حضور ﷺ بچوں کیساتھ (اپنی شان کے لائق) کھیل رہے تھے۔ جبرائیل علیہ السلام آئے اور انہوں نے حضور ﷺ کو زمین پر لٹا کر سینۂ اقدس چاک کیا۔ قلب مبارک کو باہر نکال کر اس سے منجمد خون نکالا اور زمزم کے پانی سے دھو کر سینۂ اقدس میں رکھ کر سینہ مبارک بند کر دیا۔ وہ بچے جنکے ساتھ حضور ﷺ کھیل رہے تھے، آپ کی رضاعی ماں (حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا) کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ" محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے تو لوگ دوڑتے ہوئے آئے تو محمد ﷺ کا رنگ مبارک بدلا ہوا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کے سینۂ اقدس میں سوئی (سے سیئے جانے) کا نشان دیکھا تھا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شق صدر مبارک کے متعلق روحانی، منامی، کشفی، معنوی وغیرہ کی تمام تاویلات قطعاً باطل ہیں بلکہ یہ "شق" اور چاک کیا جانا حسی حقیقی اور امر واقعی ہے کیونکہ سینۂ اقدس میں سوئی سے سیئے جانے کا نشان چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ پھر حدیث پاک میں صاف الفاظ موجود ہیں کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سینہ مبارک چاک کیا گیا تو حضور ﷺ کیساتھ کھیلنے والے لڑکے دوڑتے ہوئے حضور ﷺ کی رضاعی ماں (حلیمہ سعدیہ) کے پاس آئے اور کہا کہ محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے۔ حضور ﷺ کے سینہ پاک کے چاک ہونے اور قلب اطہر کے نکالے جانے اور اس سے منجمد خون کے باہر نکالے جانے کا واضح ذکر اور حضور ﷺ کے متغیر اللون ہونے کا بیان اس حقیقت کو بے نقاب کر رہا ہے کہ یہ واقعہ بالکل حسی ہے۔ اس کو معنوی کہنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

☆ اس تفصیل کو ذہن نشین کر لینے کے بعد بیان سابق میں ہمارا یہ قول بالکل بے غبار ہو جاتا ہے کہ شق صدر مبارک بچپن میں ہوا یا جوانی میں۔ قبل البعثت ہوا یا بوقت معراج، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد وفات حیات حقیقی کے ساتھ زندہ رہنے کی قوی دلیل ہے۔ کیونکہ انسان کا دل اس کی روح حیات کا مستقر ہوتا ہے۔ اس کا سینہ سے باہر آ جانا روح حیات کا بدن سے نکل جانا ہے۔ گویا اس واقعہ میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح قلب مبارک کے سینۂ اقدس سے باہر ہو جانے کے باوجود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ ہیں، اسی طرح

روح مقدس کے قبض ہو جانے کے بعد زندہ رہیں گے۔ یہ واقعہ حضور ﷺ کے عظیم ترین معجزات میں سے ہے۔

فائدہ جلیلہ:

☆ فضیلت شق صدر حضور ﷺ کے طفیل باقی انبیائے کرام علیہم السلام کو بھی عطا ہوئی۔ جیسا کہ تابوت بنی اسرائیل کے قصہ میں طبرانی کی طویل روایت میں یہ الفاظ ہیں "كَانَ فِيهِ الطَّسْتُ الَّتِي يُغْسَلُ فِيهَا قُلُوبُ الْاَنْبِيَاءِ (فتح الملہم جلد اول صفحہ ۱۰۰) یعنی تابوت سکینہ میں وہ طشت بھی تھا جس میں انبیاء علیہم السلام کے دلوں کو دھویا جاتا ہے چونکہ دیگر انبیاء علیہم السلام کو بھی حضور ﷺ کی تبعیت میں حیات حقیقی عطا کی گئی لہٰذا شق صدر اور قلب مبارک کا دھویا جانا بھی ان کو عطا کیا گیا تھا تاکہ ان کی حیات بعد الوفات پر بھی اسی طرح دلیل قائم ہو جائے جس طرح رسول اللہ ﷺ کی حیات بعد الممات پر دلیل قائم کی گئی اور اس طرح بلا تخصیص وتقیید مطلقاً حیاتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ثابت ہو جائے۔

قلب مبارک کا دھویا جانا

☆ قلب اطہر کا زم زم سے دھویا جانا کسی آلائش کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ حضور سید عالم ﷺ سید الطیبین والطاہرین ہیں۔ ایسے طیب و طاہر کہ ولادتِ باسعادت کے بعد بھی حضور سید عالم ﷺ کو غسل نہیں دیا گیا۔ لہٰذا قلب اقدس کا زم زم سے دھویا جانا محض اس حکمت پر مبنی تھا کہ زم زم کے پانی کو وہ شرف بخشا جائے جو دنیا کے کسی پانی کو حاصل نہیں بلکہ قلب اطہر کے ساتھ ماءِ زم زم کو مس فرما کر وہ فضیلت عطا فرمائی گئی جو کوثر و تسنیم کے پانی کو بھی حاصل نہیں۔

شق صدر کی حکمتیں

شب معراج حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سینۂ اقدس کے شق کیے جانے میں بے شمار حکمتیں مضمر ہیں جن میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ قلب اطہر میں ایسی قوت قدسیہ بالفعل ہو جائے جس سے آسمانوں پر تشریف لے جانے اور عالم سمٰوٰت کا مشاہدہ کرنے بالخصوص دیدارِ الٰہی سے مشرف ہونے میں کوئی دقت اور دشواری پیش نہ آئے۔

حیات النبی کی دلیل

☆ علاوہ ازیں شق صدر مبارک میں ایک میں ایک حکمت بلیغہ یہ بھی ہے کہ صحابہ کرام کے لئے حضور ﷺ کی حیات بعد الموت پر دلیل قائم ہو گئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عادتاً بغیر روح کے جسم میں حیات نہیں ہوتی لیکن انبیاء علیہم السلام کے اجسام مقدسہ قبض روح کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ چونکہ روح حیات کا مستقر قلب انسانی ہے لہٰذا جب کسی انسان کا دل اس کے سینہ سے باہر نکال لیا جائے تو وہ زندہ نہیں رہتا لیکن رسول اللہ ﷺ کا قلب مبارک سینۂ اقدس سے باہر نکالا گیا پھر اسے شگاف دیا گیا اور وہ منجمد خون جو جسمانی اعتبار سے دل کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے صاف کر دیا گیا اس کے باوجود بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ ہیں کیونکہ جس کا دل بدن سے باہر ہو اور وہ پھر بھی زندہ رہے اگر اس کی روح قبض ہو کر باہر ہو جائے تو وہ کب مردہ ہو سکتا ہے۔

قلب مبارک میں آنکھیں اور کان

☆ جبرائیل علیہ السلام نے شق صدر مبارک کے بعد قلب اطہر کو جب زم زم کے پانی سے دھویا تو فرمانے لگے "قَلْبٌ سَدِيْدٌ فِيْهِ عَيْنَانِ تُبْصِرَانِ وَاُذُنَانِ تَسْمَعَانِ"

ترجمہ: "قلب مبارک ہر قسم کی کجی سے پاک ہے اور بے عیب ہے۔ اس میں دو آنکھیں ہیں جو دیکھتی ہیں اور دو کان ہیں جو سنتے ہیں۔

(فتح الباری جلد ۱۳، صفحہ ۴۱۰)

☆ قلب مبارک کی یہ آنکھیں اور کان عالم محسوسات سے وراء الوراء حقائق کو دیکھنے اور سننے کے لئے ہیں۔ جیسا کہ حضور علیہ ﷺ نے فرمایا "اِنِّیْ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ وَاَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ" میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے اور وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سن سکتے۔

دائمی ادراک

☆ جب اللہ تعالیٰ نے بطور خرق عادات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب اطہر میں آنکھیں اور کان پیدا فرما دیئے ہیں تو اب یہ کہنا کہ ورائے عالم محسوسات کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دیکھنا اور سننا احیاناً ہے دائمی نہیں قطعاً باطل ہو گیا۔ جب ظاہری آنکھوں اور کانوں کا ادراک دائمی ہے تو قلب مبارک کے کانوں اور آنکھوں کا ادراک کیونکر عارضی اور احیاناً ہو سکتا ہے۔ البتہ حکمت الٰہیہ کی بناء پر کسی امر خاص کی طرف حضور علیہ ﷺ کا دھیان نہ رہنا اور عدم توجہ اور عدم التفات کا حال طاری ہو جانا امر آخر ہے، جس کا کوئی منکر نہیں اور وہ علم کے منافی نہیں ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا باطنی سماع اور بصارت عارضی نہیں بلکہ دائمی ہے۔

شق صدر مبارک اور حضور علیہ ﷺ کا نوری ہونا

☆ علامہ شہاب الدین خفاجی فرماتے ہیں کہ بعض لوگ یہ وہم کرتے ہیں کہ شق صدر مبارک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور سے مخلوق ہونے کے منافی ہے لیکن یہ وہم غلط اور باطل ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے "وَكَوْنُهٗ مَخْلُوْقًا مِّنَ النُّوْرِ لَا يُنَافِيْهِ كَمَا تُوُهِّمَ"

(نسیم الریاض، شرح شفا قاضی عیاض جلد ۲، صفحہ ۲۳۸)

نورانیت اور احوال بشریہ کا ظہور

☆ اقول وباللہ التوفیق! جو بشریت عیوب ونقائص بشریت سے پاک ہو اس کا بشر ہونا نورانیت کے منافی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نور سے مخلوق فرما کر مقدس اور پاکیزہ بشریت کے لباس میں مبعوث فرمایا۔ شق صدر ہونا بشریت مطہرہ کی دلیل ہے اور باوجود سینۂ اقدس چاک ہونے کے خون نہ نکلنا نورانیت کی دلیل ہے۔ فَلَمْ يَكُنِ الشَّقُّ بِاٰلَةٍ وَّلَمْ يَسِلِ الدَّمُ۔

ترجمہ: ☆ "شق صدر کسی آلہ سے نہیں تھا۔ نہ اس شگاف سے خون بہا۔" (روح البیان جلد ۵، ص ۱۰۶)

☆ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خلقت نور سے ہے اور بشریت ایک لباس ہے اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ جب چاہے اپنی حکمت کے مطابق بشری احوال کو نورانیت پر غالب کر دے اور جب چاہے نورانیت کو احوال بشریہ پر غلبہ دے دے اور بشریت نہ ہوتی 'شق' کیسے

ہوتا اور نورانیت نہ ہوتی تو آلہ بھی درکار ہوتا اور خون بھی ضرور بہتا۔

جب کبھی خون بہا (جیسے غزوۂ احد میں) تو وہاں احوال بشریہ کا غلبہ تھا اور جب خون نہ بہا (جیسے لیلۃ المعراج شق صدر میں) تو وہاں نورانیت غالب تھی۔

شب معراج شق صدر مبارک

☆ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ فرشتوں نے حضور ﷺ کا سینۂ اقدس اوپر سے نیچے تک چاک کیا اور قلب مبارک باہر نکالا پھر اسے شگاف دیا اور اس سے خون کا ایک لوتھڑا نکال باہر پھینکا اور کہا کہ آپ کے اندر شیطان کا ایک حصہ تھا۔

خون کا لوتھڑا یا شیطان کا حصہ

☆ علامہ تقی الدین سبکی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں خون کا لوتھڑا پیدا فرمایا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ انسان کے دل میں شیطان جو کچھ ڈالتا ہے یہ لوتھڑا اسے قبول کرتا ہے۔ (جس طرح قوت سامعہ آواز کو اور قوت باصرہ مبصرات کی صورتوں کو اور قوت شامہ خوشبو اور بدبو کو اور قوتِ ذائقہ ترشی اور تلخی وغیرہ کو اور قوتِ لامسہ گرمی اور سردی وغیرہ کیفیات کو قبول کرتی ہے، اسی طرح دل کے اندر یہ منجمد خون کا لوتھڑا شیطانی وسوسوں کو قبول کرتا ہے) یہ لوتھڑا جب حضور ﷺ کے قلب مبارک سے دور کر دیا گیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مقدسہ میں ایسی کوئی چیز باقی نہ رہی جو القائے شیطانی کو قبول کرنے والی ہو۔ علامہ تقی الدین فرماتے ہیں کہ اس حدیث پاک سے یہی مراد ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی میں شیطان کا کوئی بھی حصہ کبھی نہیں تھا۔

☆ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جب یہ بات تھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مقدسہ میں اس خون کے لوتھڑے کو کیوں پیدا فرمایا کیونکہ یہ ممکن تھا کہ پہلے ہی ذاتِ مقدسہ میں اسے پیدا نہ فرمایا جاتا۔ تو جواب دیا جائے گا کہ اس کے پیدا فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ وہ اجزائے انسانیہ میں سے ہے۔ لہٰذا اس کا پیدا کیا جانا خلقت انسانی کی تکمیل کے لئے ضروری ہے اور اس کا نکال دینا، یہ ایک امر آخر ہے جو تخلیق کے بعد طاری ہوا۔ (انتہٰی)

☆ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، اس کی نظیر بدن انسانی میں اشیاء زائدہ کی تخلیق ہے جیسے قلفہ کا ہونا اور ناخنوں اور مونچھوں کی درازی اور اسی طرح بعض دیگر زائد چیزیں (جن کا پیدا ہونا بدن انسانی کی تکمیل کا موجب ہے اور ان کا ازالہ طہارت و نظافت کے لئے ضروری ہے) مختصر یہ کہ ان اشیاء زائدہ کی تخلیق اجزائے بدن انسانی کا تکملہ ہے اور ان کا زائل کرنا کمال تطہیر و تنظیف کا مقتضی ہے۔ (شرح شفاء لملا علی قاری جلد ا، صفحہ ۴۷۳) اَقُوْلُ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ۔

☆ چونکہ ذاتِ مقدسہ میں حظ شیطانی باقی ہی نہ تھا اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہمزاد مسلمان ہو گیا تھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ "وَلٰکِنْ اَسْلَمَ فَلَا یَاْمُرُنِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ میرا ہمزاد مسلمان ہو گیا لہٰذا سوائے خیر کے وہ مجھے کچھ نہیں کہتا۔

☆ علامہ شہاب الدین خفاجی نسیم الریاض میں فرماتے ہیں کہ قلب بمنزلہ میوہ کے ہے جس کا دانہ اپنے اندر کے تخم اور گٹھلی پر قائم

ہوتا ہے اور اسی سے پختگی اور رنگینی حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح وہ منجمد خون قلب انسانی کے لئے ایسا ہے جیسے چھوہارے کے لئے گٹھلی۔ اگر ابتداً اس میں گٹھلی نہ ہو تو وہ پختہ نہیں ہو سکتا لیکن پختہ ہو جانے بعد اس گٹھلی کو باقی نہیں رکھا جاتا بلکہ نکال کے پھینک دیا جاتا ہے۔ چھوہاڑے کی گٹھلی یا دانہ انگور سے بیج نکال کر پھینکتے وقت کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ جو چیز پھینکنے کے قابل تھی وہ پہلے ہی کیوں پیدا کی گئی ؟ اگر اسی طرح یہ بات ذہن نشین کر لی جائے تو قلب اطہر میں خون کا وہ لوتھڑا اسی طرح تھا جیسے انگور کے دانہ میں بیج یا کھجور کے دانہ میں گٹھلی ہوتی ہے۔ اور قلب اطہر سے اس کو بالکل ایسے ہی نکال کر پھینک دیا گیا، جیسے کھجور اور انگور سے گٹھلی اور بیج کو نکال کر باہر پھینک دیا جاتا ہے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کہ اس لوتھڑے کو قلب اطہر میں ابتداً کیوں پیدا کیا گیا۔ (نسیم الریاض، شرح شفاء قاضی عیاض ص ۲۳۹)

☆ رہا یہ امر کہ فرشتوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ کیوں کہا کہ ھٰذِہٖ حَظُّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے یہ معنی نہیں کہ (معاذ اللہ) آپ کی ذات پاک میں واقعی شیطان کا کوئی حصہ ہے۔ نہیں اور یقیناً نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ذات پاک، شیطانی اثر سے پاک اور طیب و طاہر ہے بلکہ حدیث شریف کے معنی یہ ہیں کہ اگر آپ کی ذات پاک میں شیطان کے تعلق کی کوئی جگہ ہو سکتی ہے تو وہ یہی خون کا لوتھڑا تھا۔ جب اس کو آپ کے قلب مبارک سے نکال کر باہر پھینک دیا گیا تو اس کے بعد آپ کی ذاتِ مقدسہ میں کوئی ایسی چیز باقی نہ رہی جس سے شیطان کا کوئی تعلق کسی طرح ہو سکے۔

☆ الفاظ حدیث کا واضح اور روشن مفہوم یہ ہے کہ آپ کی ذاتِ مقدسہ میں شیطان کا کوئی حصہ ہوتا تو یہی خون کا لوتھڑا ہو سکتا تھا مگر جب یہ بھی نہ رہا تو اب ممکن ہی نہیں کہ ذاتِ مقدسہ سے شیطان کا کوئی تعلق ممکن ہو۔ آپ کی ذاتِ مقدسہ ان عیوب سے پاک ہے جو اس لوتھڑے کے ساتھ شیطان کے متعلق ممکن ہو۔ آپ کی ذاتِ مقدسہ ان عیوب سے پاک ہے جو اس لوتھڑے کے ساتھ شیطان کے متعلق ہونے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

☆ شق صدر مبارک کے بعد ایک نورانی طشت جو ایمان و حکمت سے لبریز تھا حضور ﷺ کے سینۂ اقدس میں بھر دیا گیا، ایمان و حکمت اگرچہ جسم و صورت سے متعلق نہیں لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ غیر جسمانی چیزوں کو صورت عطا فرمائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایمان و حکمت کو جسمانی صورت میں متمثل فرما دیا اور یہ تمثل رسول اللہ ﷺ کے حق میں انتہائی عظمت و رفعت شان کا موجب ہے۔

☆ حضور ﷺ داہنی چھاتی کا دودھ پیا کرتے اور بائیں چھاتی اپنے رضاعی بھائی یعنی حلیمہ کے بیٹے کیلئے ہمیشہ چھوڑ دیتے تھے۔ ایسا عدل آپ کی طبیعت میں تھا اور لڑکپن میں کبھی آپ نے بول و براز کپڑے میں نہیں کیا بلکہ دونوں کیوقت مقرر تھے کہ اسی وقت رکھنے والے جائے ضرورت میں اٹھا کر پیشاب کرا لیتے اور کبھی آپ کا ستر برہنہ نہ ہوتا اور جو کپڑا اتفاقاً اٹھ جاتا تو فرشتے فوراً ستر چھپا دیتے۔ (تواریخ حبیب الٰہ)

☆ ایک بار اپنے بچپن کا واقعہ خود حضور علیہ ﷺ نے ذکر فرمایا کہ میں ایک بار بچوں کے ساتھ پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا اور سب اپنی لنگی

اتار کر گردن پر پتھر کے نیچے رکھے ہوئے تھے، میں نے بھی ایسا ہی کرنا چاہا (کیونکہ بچپن میں انسان اتنا مکلّف بھی نہیں ہوتا، طبعاً اور عرفاً بھی ایسے بچے سے ایسا امر خلافِ حیا نہیں سمجھا جاتا) دفعتاً (غیب سے) زور سے ایک دھکا لگا اور یہ آواز آئی کہ اپنی لنگی باندھو، بس میں نے فوراً باندھ لی اور گردن پر پتھر لانے شروع کر دیئے۔ (سیرۃ ابن ہشام)

☆ ابن عساکر نے حلیمہ بن عرفطہ سے روایت کیا ہے کہ میں مکہ معظمہ میں پہنچا اور وہ لوگ سخت قحط میں تھے۔ قریش نے کہا، اے ابو طالب! چلو پانی کی دعا مانگو۔ ابو طالب چلے اور ان کے ساتھ ایک لڑکا تھا، اس قدر حسین جیسے بدلی میں سے سورج نکلا ہو (یہ لڑکے رسول اللہ ﷺ تھے جو اس وقت ابو طالب کی پرورش میں تھے) ابو طالب نے ان صاحبزادے کی پشت خانہ کعبہ سے لگائی اور صاحبزادے نے انگلی سے اشارہ کیا اور آسمان میں کہیں بدلی کا نشان نہ تھا۔ سب طرف سے بادل آنا شروع ہوا اور خوب پانی برسا۔ (مواہب اللدنیہ) اور یہ واقعہ آپ کی صغر سنی میں ہوا۔ (تواریخ حبیب الٰہ)

☆ آپ جب ابو طالب کی کفالت و تربیت میں تھے، جب ان کے عیال کے ہمراہ کھانا کھاتے تو سب شکم سیر ہو جاتے اور جب نہ کھاتے تو سب بھوکے رہ جاتے۔ (شمامہ)

☆ گویا آپ کی برکت خود ابو طالب کی کفالت کر رہی تھی اور ابو طالب کے بیٹے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آپ نے احسان کے جواب میں اپنی آغوشِ تربیت میں لے لیا تھا۔

ان کے اسمائے مبارکہ آپ جن کی تربیت میں رہے

☆ آپ ابھی زمانہ حمل میں تھے کہ آپ کے والد ماجد حضرت عبداللہ کی وفات ہوگئی۔ (سیرت ابن ہشام)

☆ صرف دو مہینے حمل پر گزرے تھے کہ آپ کے والد ماجد حضرت عبداللہ قافلہ قریش کے ساتھ تجارت کے لئے شام گئے، وہاں سے واپسی پر مدینہ میں اپنے ماموں کے پاس بیماری کی حالت میں ٹھہر گئے اور وہیں وفات پائی۔ (تواریخ حبیب الٰہ)

☆ اور جب آپ چھ سال کے ہوئے تو آپ کی والدہ حضرت آمنہ آپ کو لے کر مدینہ شریف اپنے اقارب سے ملنے گئی تھیں۔ مکہ کو واپس آتے ہوئے درمیان مکہ و مدینہ کے موضع ابواء میں انہوں نے وفات پائی۔ (سیرۃ ابن ہشام) اس وقت ام ایمن بھی ساتھ تھیں۔ (مواہب اللدنیہ)

☆ پھر آپ اپنے دادا عبدالمطلب کی پرورش میں رہے۔ جب آپ آٹھ سال کے ہوئے عبدالمطلب کی بھی وفات ہوگئی۔ (سیرۃ ابن ہشام) اور انہوں نے ابو طالب کو آپ کی نسبت وصیت کی تھی چنانچہ پھر آپ انکی کفالت میں رہے۔ (سیرت ابن ہشام) یہاں تک کہ انہوں نے نبوت کا زمانہ بھی پایا اور سات روز تک آپ نے اپنی والدہ ماجدہ کا دودھ پیا۔ (تواریخ حبیب الٰہ) پھر چند روز تک ثویبہ نے دودھ پلایا جو ابولہب کی آزاد لونڈی تھی اور آپ ہی کیساتھ حضرت ابو سلمہ اور حضرت حمزہ کو بھی دودھ پلایا اور اسوقت انکا بیٹا "مسروح" بھی دودھ پیتا تھا پھر حلیمہ سعدیہ نے دودھ پلایا۔ ان ہی "حلیمہ سعدیہ" نے آپ کیساتھ آپ کے چچا زاد بھائی ابو سفیان بن الحارث بن

عبدالمطلب کو بھی دودھ پلایا۔ یہ عام الفتح میں مسلمان ہوئے اور بہت پکے مسلمان ہوئے اور اس زمانہ میں حضرت حمزہ بھی بنی سعد میں کسی عورت کا دودھ پیتے تھے۔ سو اس عورت نے بھی آپ کو ایک دن دودھ پلا دیا۔ جب حلیمہ کے پاس تھے تو حضرت حمزہ دو عورتوں کے دودھ کی وجہ سے آپ کے رضاعی بھائی ہیں۔ ایک ثویبہ کے دودھ سے دوسرے اس سعدیہ کے دودھ سے (زادالمعاد)

☆ اور جن کی آغوش میں آپ رہے، وہ یہ ہیں۔ آپ کی والدہ، ثویبہ اور حلیمہ سعدیہ (جن سے شیماء آپ کی رضاعی بہن ہیں) اور ام ایمن حبشیہ جن کا نام برکت ہے، یہ آپ کو آپ کے والد سے میراث میں ملی تھیں اور آپ نے ان کا نکاح حضرت زید سے کیا تھا، جن سے اسامہ پیدا ہوئے۔ (زادالمعاد)

شباب سے نبوت تک کے بعض حالات

☆ جب آپ چودہ یا پندرہ برس کے ہوئے اور بالقوے بیس سال کے ہوئے تو قریش اور قیس میں ایلان میں یک لڑائی ہوئی تو اس لڑائی میں بعض تواریخ کے مطابق آپ نے بھی شرکت فرمائی تھی اور آپ نے فرمایا کہ میں اپنے اعمام کو تیروں سے بچاتا تھا اور اس واقعہ کا بڑا قصہ ہے۔ (سیرت ابن ہشام) اس واقعہ سے آپ کا شجاع ہونا ثابت ہوتا ہے۔

☆ جب آپ پچیس سال کے ہوئے تو حضرت خدیجہ بنت خویلد نے جو کہ قریش میں مالدار بی بی تھیں اور تاجروں کو اپنا مال اکثر مضاربت پر دیتی رہا کرتی تھیں۔ آپ کے صدق و امانت و حسن معاملہ اور اخلاق کی خبر سن کر آپ سے درخواست کی کہ میرا مال مضاربت پر شام کی طرف لے جائیے اور میرا غلام میسرہ آپ کے ہمراہ رہے گا، آپ نے قبول فرمایا، یہاں تک کہ آپ شام پہنچے اور کسی موقع پر آپ ایک درخت کے نیچے اترے۔ وہاں ایک راہب کا صومعہ تھا۔ اس راہب نے آپ کو دیکھا اور میسرہ سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے۔ میسرہ نے کہا کہ قریش اہل حرم میں سے ایک شخص ہیں۔ راہب نے کہا "اس درخت کے نیچے بجز نبی کے کبھی کوئی نہیں اترا۔" آپ شام سے خوب نفع لے کر واپس ہوئے اور میسرہ نے دیکھا کہ جب دھوپ تیز ہوتی تھی تو دو فرشتے آپ پر سایہ کرتے تھے۔ جب آپ مکہ پہنچے تو حضرت خدیجہ کو ان کا مال بسہ ہر دکیا کہ دو گنا یا اس کے قریب نفع ہوا (یہ تو آپ کے صدق و امانت کی بین دلیل تھی) اور میسرہ نے ان سے اس راہب کا قول اور فرشتوں کے سایہ کرنے کا واقعہ بیان کیا۔ حضرت خدیجہ نے ورقہ بن نوفل سے جو ان کے چچا زاد بھائی اور عیسائی مذہب کے بڑے عالم تھے، ذکر کیا۔ ورقہ بن نوفل نے کہا، اے خدیجہ! اگر یہ بات صحیح ہے تو محمد اس امت کے نبی ہیں اور مجھ کو (کتب سماویہ سے) معلوم ہے کہ اس امت میں ایک نبی ہونے والا ہے اور اس کا یہی زمانہ ہے۔ حضرت خدیجہ بڑی عاقلہ تھیں۔ یہ سب سن کر آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ میں آپ کی قرابت اور اشرف القوم اور امین و خوش خو اور صادق القول ہونے کے سبب آپ سے نکاح کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے اعمام سے ذکر کیا اور ان کے اہتمام سے نکاح ہو گیا۔ (سیرت ابن ہشام) راہب کا نام نسطورا تھا۔ (تواریخ حبیب الہٰ)

☆ جب آپ پینتیس سال کے ہوئے تو قریش نے خانہ کعبہ کی تعمیر از سر نو شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ جب حجر اسود کے موقع تک

تعمیر پہنچی تو ہر قبیلہ اور ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ حجرِ اسود کو اس کی جگہ پر میں رکھوں۔ قریب تھا کہ ان میں جھگڑا ہو، آخر اہل الرائے نے یہ مشورہ دیا کہ مسجد حرام کے دروازے سے جو سب میں پہلے آئے، اس کے فیصلے پر سب عمل کرو۔ لہٰذا سب سے پہلے حضور علیہ السلام تشریف فرما ہوئے۔ سب دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ محمد ہیں، امین ہیں اور قریش آپ کو نبوت سے پہلے امین کے لقب سے یاد کرتے تھے اور آپ کی خدمت میں یہ معاملہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا، ایک بڑا کپڑا لاؤ۔ چنانچہ لایا گیا۔ آپ نے حجرِ اسود اپنے دست مبارک سے اس کپڑے میں رکھا اور فرمایا کہ ہر قبیلہ کا آدمی اس چادر کا ایک ایک پلو تھام لے اور خانہ کعبہ تک لے چلے۔ جب وہاں پتھر پہنچا تو آپ نے خود اس کو اٹھا کر اس کے موقع پر رکھ دیا۔ (سیرت ابن ہشام)

☆ اس فیصلہ سے سب راضی ہو گئے۔ اٹھانے کا شرف تو سب کو حاصل ہو گیا اور چونکہ آپ نے فرمایا تھا کہ سب آدمی مجھ کو اسکے موقع پر رکھنے کیلئے اپنا وکیل بنائیں کہ فعل وکیل کا بمنزلہ موکل ہوتا ہے تو اسطرح رکھنے میں بھی سب شریک ہو گئے۔ (تواریخ حبیب الٰہ بتغیر الفاظ)

بعثت محمدی اور نزول وحی

☆ جب آپ چالیس برس کے ہوئے تو آپ کو خلوت محبوب ہو گئی۔ آپ غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور کئی کئی روز رہتے۔ اور نبوت سے چھ ماہ قبل ہی سچے اور واضح خواب دیکھنے لگے تھے کہ ایک دفعہ اچانک ربیع الاول کی آٹھویں تاریخ دوشنبہ کے دن جبرائیل علیہ السلام ''سورۂ علق'' کی شروع کی آیتیں آپ پر لائے اور آپ مشرف بہ نبوت ہو گئے۔ اس کے ایک عرصہ کے بعد ''سورۂ مدثر'' کی اول کی آیتیں نازل ہوئیں جو آپ نے حسب حکم ''فَــاَنْــذِرْ'' دعوتِ اسلام شروع کی مگر پوشیدہ۔ پھر یہ آیت آئی ''فَـاصْـدَعْ بِـمَــا تُؤْمَـرُ'' آپ نے علی الاعلان دعوت شروع کی۔ بس کفار نے عداوت اور ایذا شروع کی لیکن ابو طالب آپ کی حمایت کرتے تھے۔ ایک بار کفار نے جمع ہو کر ابو طالب سے کہا کہ یا تو محمد کو ہمارے حوالہ کر دو ورنہ ہم تم سے لڑیں گے۔ انہوں نے حوالے کرنا قبول نہ کیا۔ کفار نے آپ کے قتل کا مصمم ارادہ کیا۔ ابو طالب آپ کو لے کر مع بنی ہاشم و مطلب کے ایک شعب یعنی گھاٹی میں واسطے محافظت جا رہے اور کفار نے آپ سے اور بنی ہاشم اور بنی مطلب سے برادری قطع کر دی اور سوداگروں کو منع کر دیا کہ ان لوگوں کے پاس کوئی چیز نہ بیچیں اور ایک کاغذ اس قطع علاقہ کے عہد کا لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا۔ تین سال تک آپ اور بنی ہاشم و بنی مطلب اس شعب میں نہایت تکلیف میں رہے۔ آخر کار آپ کو وحی الٰہی کے ذریعہ اس بات سے اطلاع ہوئی کہ کیڑے نے اس عہد نامہ کے کاغذ کو بالکل کھا لیا۔ بجز اللہ کے نام کے جو اس میں کہیں تھا ایک حرف نہیں چھوڑا۔ آپ نے یہ حال ابو طالب سے کہا۔ انہوں نے شعب سے نکل کر یہ بات قریش سے بیان کی اور کہا اس کاغذ کو دیکھو۔ اگر محمد کا بیان غلط نکلے تو ہم انہیں تمہارے حوالے کر دیں گے اور اگر صحیح ہو تو اتنا تو ہو کہ تم اس قطع رحم اور عہد بد سے باز آ ؤ۔ قریش نے کعبہ پر سے اتار کر اس کاغذ کو دیکھا، فی الواقع ایسا ہی تھا۔ تب قریش اس ظلم سے باز آئے اور عہد نامہ کو چاک کر ڈالا۔ ابو طالب آپ کو اور بنی ہاشم و بنی مطلب کو لے کر شعب سے نکل

آئے اور آپ بدستور دعوت الی اللہ میں مشغول ہوئے۔ (تواریخ حبیب الٰہ وغیرہ)

☆ اور عہد نامہ بخط منصور بن عکرمہ بن ہشام لکھا گیا اور غرہ محرم سنہ سات نبوت کو لٹکایا گیا تھا۔ اس کا ہاتھ خشک ہو گیا اور نبوت سے سال دہم میں شعب سے باہر آئے تھے اور اسی سال حصار شعب سے نکلنے کے آٹھ ماہ بعد ابو طالب کا انتقال ہو گیا اور ان کے تین دن بعد حضرت خدیجہ کی وفات ہو گئی۔ (شمامہ)

☆ حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد آپ کے دو نکاح قرار پائے۔ ایک حضرت عائشہ سے کہ اس وقت چھ سال کی تھیں، مکہ میں ان کا نکاح ہوا اور مدینہ شریف آ کر نو سال کی عمر میں رخصت ہو کر آئیں اور دوسرا نکاح حضرت سودہ بنت زمعہ سے کہ بیوہ تھیں، آپ کا نکاح مکہ میں ہوا اور حضور ﷺ کے ساتھ مدینہ میں آئیں اور ہمیشہ ازواج میں رہیں۔ (تواریخ حبیب الٰہ)

☆ اس سال دہم میں آپ طائف بنی ثقیف کی طرف تشریف لے گئے اور یہ جانا دعوتِ اسلام کے لئے، نیز اس لئے تھا کہ ان سے کچھ مدد لیں (کیونکہ بعد وفات ابو طالب کے کوئی باوجاہت آدمی آپ کا حامی نہ تھا) لیکن وہاں کے سرداروں نے آپ کی کچھ مدد نہ کی بلکہ بے عقلے لوگوں کو بہکا کر آپ کو بہت تکلیف پہنچائی۔ آپ وہاں سے ملول ہو کر مکہ واپس ہوئے اور جب آپ بطن نخلہ میں کہ ایک دن کی راہ پر مکہ سے ہے پہنچے، رات کو وہاں رہ گئے۔ آپ قرآن مجید نماز میں پڑھ رہے تھے کہ سات یا نو جن نینوے کے کہ یہ ایک قریہ ہے موصل میں، وہاں پہنچے اور کلام اللہ سن کر ٹھہر گئے۔ جب آپ نماز پڑھ چکے تو وہ ظاہر ہوئے۔ انہیں اسلام کی طرف دعوت دی۔ وہ سب بلا توقف مسلمان ہو گئے اور انہوں نے اپنی قوم کو جا کر اسلام کی دعوت دی۔ سورۂ احقاف آیت "وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَیْکَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ" میں اسی قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ پھر آپ مکہ میں تشریف لائے اور بدستور ہدایت خلق اللہ میں مشغول ہوئے اور آپ عکاظ و مجنہ وذی المجاز میں کہ اسواق عرب تھے جاتے اور دعوت کرتے، مگر کوئی قبیلہ متوجہ نہ ہوتا۔ یہاں تک کہ سنہ گیارہ نبوت میں آپ موسم حج میں اسلام کی دعوت فرما رہے تھے کہ کچھ لوگ نصاریٰ کے آپ کو ملے۔ آپ نے ان کو دعوتِ اسلام دی۔ انہوں نے یہود مدینہ سے سنا تھا کہ ایک پیغمبر عنقریب پیدا ہوں گے، ہم ان کے ساتھ ہو کر تم کو قتل کریں گے۔ انصار نے آپ کی دعوت سن کر کہا کہ یہ وہی پیغمبر معلوم ہوتے ہیں جن کا ذکر یہود کرتے ہیں۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ یہود ہم سے پہلے ان سے آملیں اور چھ آدمی ان میں سے مشرف باسلام ہوئے اور اقرار کیا کہ سال آئندہ ہم پھر آئیں گے۔ مدینہ میں جا کر انہوں نے آپ کا ذکر کیا اور ہر گھر میں آپ کا ذکر پہنچایا۔ اگلے سال کہ نبوت سے بارہواں سال تھا، بارہ آدمیوں نے آپ سے ملاقات کی، پانچ پہلے اور سات بعد کے اور انہوں نے احکام اسلام اور اطاعت پر بیعت کی۔ اس کا نام عقبۂ اولیٰ ہے۔ آپ نے حسب درخواست ان کی مصعب بن عمیر کو قرآن مجید کی تعلیم اور شرائع اور دعوتِ اسلام کے لئے مدینہ شریف بھیج دیا۔ مصعب نے تعلیم قرآن و شرائع اور دعوت اسلام کی اور اکثر آدمی انصار کے مسلمان ہو گئے۔ تھوڑے ان میں سے باقی رہے۔ پھر اگلے سال کہ نبوت سے تیرہواں سال تھا، ستر آدمی شرفائے انصار میں سے آئے اور مشرف باسلام ہوئے

اور عہدو پیان آپ کے ساتھ کیا کہ آپ جو مدینہ کو تشریف لے جائیں گے، ہم خدمت گاری میں کوتاہی نہ کریں گے اور جو کوئی دشمن آپ کے مدینہ پر چڑھ آئے گا، ہم اس سے لڑیں گے اور جاں نثاری میں قصور نہ کریں گے۔ اس کا نام بیعت عقبہ ثانیہ ہے۔ عقبہ کے معنی گھاٹی کے ہیں۔ ایک گھاٹی پر یہ دونوں بیعتیں ہوئی تھیں۔ (تواریخ حبیب الٰہ و سیرت ابن ہشام)

شب میلاد مبارک لیلۃ القدر سے افضل ہے

☆ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ماثبت بالسنۃ میں ارقام فرماتے ہیں، جس کا اردو خلاصہ حسب ذیل ہے

☆ ''شب میلاد مبارک لیلۃ القدر سے بلاشبہ افضل ہے، اسلئے کہ میلاد کی رات خود حضور ﷺ کے ظہور کی رات ہے اور شب قدر حضور ﷺ کو عطا کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ جس رات کو ذاتِ مقدسہ سے شرف ملا، وہ اس رات سے ضرور افضل قرار پائیگی جو حضور ﷺ کو دیئے جانے کی وجہ سے شرف والی ہے۔ نیز لیلۃ القدر نزول ملائکہ کی وجہ سے مشرف ہوئی اور لیلۃ المیلاد بنفس نفیس حضور ﷺ کے ظہور مبارک سے شرف یاب ہوئی اور اس لئے بھی کہ لیلۃ القدر میں حضور ﷺ کی امت پر فضل و احسان ہے اور لیلۃ المیلاد میں تمام موجوداتِ عالم پر اللہ تعالیٰ نے فضل و احسان فرمایا کیونکہ حضور ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تمام خلائق اہل سمٰوٰت والارضین پر عام ہوگئیں۔'' انتہیٰ (ماثبت بالسنہ ص ۷۸)

☆ امام قسطلانی نے بھی مواہب اللدنیہ جلد اول ص ۲۶، ۲۷ پر لیلۃ القدر پر شب میلاد کے افضل ہونے پر یہی دلائل قائم فرمائے اور اس مضمون کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

☆ اس کے بعد یہ عرض کرنا بھی نہایت ضروری ہے کہ حضور ﷺ کا ظہور قدسی اور ولادت مقدسہ مومنین کے حق میں کمال فرحت و سرور کا موجب ہے، جس کا اظہار محافل میلاد، انواع و اقسام کے مبرات خیرات و صدقات کی صورت میں اہل محبت مومنین مخلصین ہمیشہ کرتے رہے، جو لوگ اسے بدعت و ناجائز کہتے ہیں ان پر اتمام حجت کے لئے قرآن و حدیث و عبارات علماء محدثین کی تصریحات تفصیل سے پیش کی جاتی ہیں۔ (واللہ ولی التوفیق)

حضور ﷺ کا ظہور پیدائش موجب فرحت اور سرور ہے

☆ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے

يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (پ ۱۱، ع ۱۰)

ترجمہ: ''اے لوگو! تمہارے پاس رب کی طرف سے نصیحت آئی اور دلوں کی صحت اور ہدایت اور رحمت ایمان والوں کے لئے۔ فرما دیجئے، اللہ کے فضل اور اسی کی رحمت سے تو اسی پر چاہئے کہ وہ خوشی کریں وہ بہتر ہے اس سے کہ وہ جمع کرتے ہیں۔''

☆ ظاہر ہے کہ نصیحت شفاء ہدایت و رحمت سب کچھ حضور ﷺ کی پیدائش اور تشریف آوری پر موقوف ہے اور اللہ کی سب سے بڑی رحمت و نعمت حضور ﷺ کی ذاتِ مقدسہ ہے۔ اس آیت کریمہ میں ان سب چیزوں پر خوش ہونے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا

ہے کہ یہ وہ نعمتیں ہیں جو لوگوں کی ہر نعمت و دولت سے بہتر ہیں۔ لہٰذا حضور ﷺ کی ذاتِ مقدسہ کے ظہور پر جتنی بھی خوشی منائی جائے کم ہے۔ اسے ناجائز قرار دینا انہی لوگوں کا کام ہے جو ظہورِ ذاتِ محمدی ﷺ سے خوش نہیں۔

نعمت الٰہی کو بیان کرنا چاہئے

☆ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" (ضحیٰ ۱۱) اپنے رب کی نعمت کو بیان کرو۔ حضور ﷺ نعمة اللّٰه ہیں۔ (بخاری جلد ۲، ص ۵۶۶) لہٰذا حضور ﷺ کا ذکرِ مقدس اور بیانِ مبارک از روئے قرآن کریم مطلوب و محبوب ہے۔

☆ حضور ﷺ کی پیدائش کی خوشی منانے پر کافر کو بھی فائدہ ملتا ہے

☆ بخاری شریف میں ہے

قال عروة ثويبة مولاة لابي لهب كان ابو لهب اعتقها فارضعت النبي صلى الله عليه وسلم فلما مات ابو لهب اريه بعض اهله بشر حيبة قال له ماذا القيت قال ابو لهب لم الق بعدكم غير اني سقيت في هذه بعتاقتي ثويبة۔ (انتهیٰ) بخاری شریف جلد ۲ ص ۷٦٤

ترجمہ: "حضرت عروہ فرماتے ہیں، ثویبہ ابولہب کی باندی تھی، جسے اس نے (حضور کی پیدائش کی خوشی میں) آزاد کر دیا تھا۔ اس نے حضور ﷺ کو دودھ بھی پلایا۔ ابولہب کے مرنے کے بعد اس کے بعض اہل (حضرت عباس) نے اسے بہت بری حالت میں خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا، مرنے کے بعد تیرا کیا حال رہا؟ ابولہب نے کہا، تم سے جدا ہو کر میں نے کوئی راحت نہیں پائی، سوائے اس کے کہ میں تھوڑا سا سیراب کیا جاتا ہوں، اس لئے کہ میں نے (حضور کی پیدائش کی خوشی میں) ثویبہ کو آزاد کیا تھا۔"

☆ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں ہے

ذكر السهيلي ان العباس قال لما مات ابو لهب رايته في منامي بعد حول في شر حال فقال مالقيت بعدكم راحة الا ان العذاب يخفف عني في كل يوم اثنين قال وذٰلك ان النبي صلى الله عليه وسلم ولد يوم الاثنين وكانت ثويبة بشرت ابا لهب بمولده فاعتقها (فتح الباری جلد ۹ ص ۱۱۸)

ترجمہ: "سہیلی نے ذکر کیا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ابولہب جب مر گیا تو میں نے ایک سال بعد اسے خواب میں دیکھا وہ بہت برے حال میں ہے اور کہہ رہا ہے کہ تمہارے بعد مجھے کوئی راحت نصیب نہیں ہوئی لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ہر پیر کے دن مجھ پر عذاب کی تخفیف کی جاتی ہے۔ حضرت عباس نے فرمایا، یہ اس وجہ سے کہ نبی کریم ﷺ پیر کے دن پیدا ہوئے اور ثویبہ نے ابو لہب کو حضور ﷺ کی پیدائش کی خوش خبری سنائی تو ابولہب نے اسے آزاد کر دیا تھا۔"

☆ یہ حدیث عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری طبع جدید جلد ۲۰ صفحہ ۹۵ پر علامہ بدر الدین عینی حنفی نے بھی ارقام فرمائی۔ یہاں دو اعتراض پیدا ہوتے ہیں، جن کا جواب نہایت ضروری ہے۔

اعتراض اول

☆ قرآن مجید میں ہے "لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ" کافروں سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا۔ ابولہب کافر تھا، اس کے حق میں

تخفیف عذاب کیونکر متصور ہو سکتی ہے؟

جواب: اس اعتراض کے جواب میں محدثین کے مختلف اقوال ہیں جن میں بعض بالکل رکیک اور نا قابل اعتناء ہیں اور بعض ایسے ہیں جن پر وثوق کیا جا سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری نے فتح الباری میں اکثر اقوال نقل فرما کر قابل وثوق مسلک نقل کیا اور آخر میں اپنے قول سے بھی اسی کی تائید فرمائی۔ ان کا بیان حسب ذیل ہے

قال القرطبی هذا التخفیف خاص بهذا وبمن ورد النص فیه وقال ابن منیر فی الحاشیة هنا قضیتان احداهما محال وهی اعتبار طاعة الکافر مع کفره لان شرط الطاعة ان تقع بقصد صحیح وهذا مفقود من الکافر الثانیة اثابة الکافر علی بعض الاعمال تفضلا من الله تعالٰی وهذا لایحیله العقل فاذا تقرر ذٰلك لم یکن عتق ابی لهب لثویبة قربة معتبرة ویجوز ان یتفضل الله علیه بماشاء کما تفضل علی ابی طالب والمتبع فی ذٰلك التوقیف نفیا واثباتا (قلت) وتتمة هذا ان یقع التفضل المذکور اکراما لمن وقع من الکافر البر له ونحو ذالك والله اعلم (فتح الباری جلد ۹ صفحه ۱۱۹)

ترجمہ: ''امام قرطبی نے فرمایا، یہ تخفیف عذاب ابولہب کے ساتھ خاص ہے اور اسی شخص کے ساتھ جس کے حق میں تخفیف عذاب کی نص وارد ہوئی۔ ابن منیر نے حاشیہ میں کہا، یہاں دو قضیئے ہیں۔ ایک تو محال ہے، وہ یہ کہ کافر کے کفر کے ساتھ اس کی طاعت کا اعتبار کیا جائے۔ استحالہ کی وجہ یہ ہے کہ طاعت کا معتبر ہونا قصد صحیح کی شرط سے مشروط ہے اور یہ کافر میں نہیں پایا جاتا۔ دوسرا قضیہ یہ ہے کہ کافر کو اس کے کسی عمل پر محض بطور تفضل کوئی فائدہ پہنچانا اور یہ بات عقلاً محال نہیں اور جب یہ دونوں باتیں ثابت ہو گئیں تو جاننا چاہئے کہ ابو لہب کا ثویبہ کو آزاد کرنا طاعت معتبرہ نہ تھی اور اس کے اس عمل پر اگر اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق کچھ احسان فرمادے تو یہ ممکن ہے۔ جیسا کہ ابو طالب پر احسان فرمایا اور اس مسئلہ پر نفیاً و اثباتاً توقیف ہی کی اتباع کی جا سکتی ہے (یعنی تخفیف عذاب کی نفی و اثبات کا قول ورود نص پر موقوف ہے، جس کے حق میں جو کچھ نص میں وارد ہو، اس کی اتباع کی جائے گی)۔ میں (ابن حجر عسقلانی) کہتا ہوں کہ ابن منیر کی اس تقریر کا تتمہ یہ ہے کہ ابولہب پر تفضل یا اسی طرح کسی دوسرے کے حق میں جو احسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے واقع ہوتا ہے وہ اس ذات کے اکرام کے لئے ہوتا ہے جس کے لئے کافر نے کوئی نیک کام کیا ہو (جیسے حضور ﷺ کی ذاتِ مقدسہ کہ ابولہب نے حضور ﷺ کی پیدائش کی خوشی میں ثویبہ کو آزاد کیا تھا، لہٰذا ابولہب کے حق میں تخفیف عذاب حضور ﷺ کے اکرام و اجلال کے لئے ہے۔''

اعتراض نوم

سوال: غیر مسلم کا خواب حجت نہیں، جس پر یقین کر لیا جائے۔

جواب: ان خوابوں کا حجت شرعیہ نہ ہونا مسلم ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان سے کسی حقیقت واقعیہ پر کوئی روشنی نہ پڑ سکے اور کسی امر میں کم از کم استنباط کا فائدہ بھی ان سے متصور نہ ہو۔ غیر مسلم کے خواب کا فی الجملہ سچا ہونا اور اس سے بعض حقائق کا پتا چلنا قرآن مجید سے ثابت ہے۔

☆ دیکھئے یوسف علیہ السلام کے دو ساتھی جو کافر تھے، انہوں نے خواب دیکھے اور یوسف علیہ السلام نے ان کی تعبیریں بیان فرمائیں اور وہ بالکل سچی اور صحیح ثابت ہوئیں اور ان دونوں آدمیوں کا کافر ہونا اس امر سے ظاہر ہے کہ خواب سننے کے بعد یوسف علیہ

السلام نے انہیں ایمان وتوحید کی طرف دعوت دی۔ لہٰذا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اس خواب سے جو انہوں نے کفر کے زمانہ میں دیکھی تھی بطور استنباط ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جب حضور علیہ کی پیدائش کی خوشی منانا ابولہب جیسے کافر کے حق میں مفید ہو سکتا ہے تو مومن مخلص کے حق میں ولادتِ باسعادت پر اظہارِ مسرت بطریق اولیٰ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کی امید کا سبب قرار پا سکتا ہے۔

چنانچہ امام قسطلانی شارح بخاری مواہب اللدنیہ جلد اصفحہ ۲۷ پر یہی مضمون امام ابن جزری سے نقل فرماتے ہیں

قال ابن الجزری فاذا کان هذا ابولهب الکافر الذی نزل القرآن بذمه جوزی فی النار بفرحه لیلة مولد النبی صلی اللّٰه علیه وسلم به فما حال المسلم الموحد من امته علیه السلام الذی یسر بمولده ویبذل ما اتصل الیه قدرته فی محبته صلی اللّٰه علیه وسلم لعمری انما یکون جزاؤه من اللّٰه الکریم ان یدخله بفضله العمیم جنات النعیم ۔ انتهیٰ

ترجمہ: ”ابن جزری نے کہا کہ (شب میلاد کی خوشی کی وجہ سے جب ابولہب جیسے کافر کا یہ حال ہے کہ اس کے عذاب میں تخفیف ہوتی ہے) حالانکہ ابولہب ایسا کافر ہے جس کی مذمت میں قرآن نازل ہوا تو حضور علیہ کے امتی مومن وموحد کا کیا حال ہوگا جو حضور علیہ کے میلاد کی خوشی میں حضور علیہ کی محبت کی وجہ سے اپنی قدرت اور طاقت کے موافق خرچ کرتا ہے۔ قسم ہے میری عمر کی اس کی جزا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل عمیم سے جنات نعیم میں داخل کرے۔“ (مواہب اللدنیہ جلد اص ۲۷ مطبوعہ مصر)

عید میلاد منانا اور ماہِ ربیع الاول میں اظہار فرحت و سرور اور صدقات و خیرات کرنا

☆ بعض لوگ میلاد شریف کی محفل منعقد کرنے اور ربیع الاول میں خیرات وصدقات و اظہارِ فرحت وسرور کو بدعت سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال قطعاً غلط ہے۔ امام قسطلانی شارح بخاری مواہب اللدنیہ میں ارقام فرماتے ہیں

ولازال اهل الاسلام یحتفلون بشهر مولده صلی اللّٰه علیه وسلم ویعملون الولائم ویتصدقون فی لیالیه بانواع الصدقات ویظهرون السرور ویزیدون فی المبرات ویعتنون بقرأة مولده الکریم ویظهر علیهم من برکاته کل فضل عمیم ومما جرب من خواصه انهٗ امان فی ذٰلک العام وبشریٰ عاجلة بنیل البغیه والمرام فرحم اللّٰه امرا اتخذ لیالی شهر مولده المبارک اعیادا لیکون اشد علة علی من فی قلبه مرض واعیاداء ولقد اطنب ابن الحاج فی المدخل فی الانکار علی ما احدثه الناس من البدع والاهواء والغنی بالاٰلات المحرمة عند عمل المولد الشریف فاللّٰه تعالیٰ یثیبه علی قصده الجمیل ویسلک بنا سبیل السنة فانهٗ حسبنا ونعم الوکیل ۔ (مواهب اللدنیه جلد اول ص ۲۷ مطبوعه مصر)

ترجمہ: ”حضور علیہ کی پیدائش کے مہینے میں اہل اسلام ہمیشہ سے محفلیں منعقد کرتے چلے آئے ہیں اور خوشی کے ساتھ کھانے پکاتے رہے اور دعوتِ طعام کرتے رہے ہیں اور ان راتوں میں انواع واقسام کی خیرات کرتے رہے اور سرور ظاہر کرتے چلے آئے ہیں اور نیک کاموں میں ہمیشہ زیادتی کرتے رہے ہیں اور حضور علیہ کے مولد کریم کی قرأت کا اہتمام خاص کرتے رہے ہیں۔ جس کی برکتوں سے ان پر اللہ تعالیٰ کا فضل ظاہر ہوتا رہا ہے اور اس کے خواص سے یہ امر مجرب ہے کہ انعقادِ محفل میلاد اس سال میں موجب امن وامان ہوتا ہے اور ہر مقصود ومراد پانے کے لئے جلدی آنے والی خوشخبری ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس شخص پر بہت رحمتیں فرمائے جس نے ماہِ میلاد مبارک کی ہر رات کو عید بنالیا تا کہ یہ عید میلاد سخت ترین علت ہو جائے اس شخص پر جس کے دل میں مرض وعناد ہے اور علامہ ابن الحاج نے مدخل میں طویل کلام کیا ہے۔ ان چیزوں پر انکار کرنے میں جو لوگوں نے بدعتیں اور نفسانی خواہشیں پیدا کر دی ہیں اور آلاتِ محرمہ کے ساتھ عمل مولود شریف میں غنا کو شامل

کردیا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو ان کے قصد جمیل پر ثواب دے اور ہمیں سنت کی راہ چلائے، بے شک وہ ہمیں کافی ہے اور بہت اچھا وکیل ہے۔"

☆ علامہ قسطلانی کی اس عبارت سے حسب ذیل امور ثابت ہوئے

۱☆ ماہِ میلاد (ربیع الاول شریف) میں انعقاد محفل میلاد اہل اسلام کا طریقہ رہا ہے۔

۲☆ کھانے پکانے کا اہتمام، انواع واقسام کے خیرات وصدقات ماہِ میلاد کی راتوں میں اہل اسلام ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔

۳☆ ماہِ ربیع الاول میں خوشی ومسرت وسرور کا اظہار شعارِ مسلمین ہے۔

۴☆ ماہِ میلاد کی راتوں میں زیادہ سے زیادہ نیک کام کرنا مسلمانوں کا پسندیدہ طریقہ چلا آرہا ہے۔

۵☆ ماہِ ربیع الاول میں میلاد شریف پڑھنا اور قرأت میلاد پاک کا اہتمام خاص کرنا مسلمانوں کا محبوب طرزِ عمل ہے۔

۶☆ میلاد کی برکتوں سے میلاد کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل عمیم ہمیشہ سے ظاہر ہوتا چلا آیا ہے۔

۷☆ محفل میلاد کے خواص سے یہ مجرب خاصہ ہے کہ جس سال میں محافل میلاد منعقد کی جائیں، وہ تمام سال امن وامان سے گزرتا ہے۔

۸☆ انعقادِ محافل میلاد مقصود ومطلب پانے کے لئے بشریٰ عاجلہ (جلد آنے والی خوشخبری) ہے۔

۹☆ میلاد مبارک کی راتوں کو عید منانے والے مسلمان اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے اہل ہیں۔

۱۰☆ ربیع الاول شریف میں میلاد شریف کی محفلیں منعقد کرنا اور ماہِ میلاد کی ہر رات کو عید بنانا یعنی عید میلاد منانا ان لوگوں کے لئے سخت مصیبت ہے جن کے دلوں میں نفاق کا مرض اور عداوتِ رسول کی بیماری ہے۔

۱۱☆ علامہ ابن الحاج نے مدخل میں جو انکار کیا ہے وہ انعقاد محفل میلاد پر نہیں بلکہ ان بدعات اور نفسانی خواہشات پر ہے جو لوگوں نے محافل میلاد میں شامل کردی تھیں۔ آلاتِ محرمہ کے ساتھ گانا بجانا میلاد شریف کی محفلوں میں شامل کردیا گیا تھا۔ ایسے منکرات پر صاحب مدخل نے انکار فرمایا اور ایسے ناجائز امور پر ہر سنی مسلمان انکار کرتا ہے۔ صاحب مدخل کی عبارات سے دھوکا دینے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ امام قسطلانی نے ان کا یہ طلسم بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ علامہ شیخ حقی اسمٰعیل بروسی رحمۃ اللہ علیہ روح البیان میں فرماتے ہیں

وقال الامام السیوطی قدس سرہٗ یستحب لنا اظہار الشکر لمولدہٖ علیہ السلام (انتہیٰ) روح البیان جلد ۹ صفحہ ۲۵

ترجمہ: "امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضور ﷺ کی ولادتِ باسعادت پر شکر ظاہر کرنا ہمارے لئے مستحب ہے۔"

ایک شبہ کا جواب

☆ علامہ فاکہانی مالکی نے عمل مولد کو بدعت مذمومہ لکھا ہے اس کا کیا جواب ہوگا؟

☆ جواباً گزارش ہے کہ فاکہانی مالکی کا عمل مولد مقدس کو معاذ اللہ بدعت مذمومہ لکھنا خود مذموم ہے۔ عمل مولد کی اصل وہ تمام احادیث ہیں جن میں حضور ﷺ نے منبر شریف پر اپنی پیدائش کا حال بیان فرمایا اور اپنی نعت شریف پڑھنے کے لئے حضرت حسان بن

ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا۔ علمائے اہل حق نے عمل مولد کی اصل کو ثابت مانا ہے۔ ایسی صورت میں اس کو بدعت مذمومہ کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ دیکھئے علامہ علی بن برہان الدین الحلبی سیرۃ حلبیہ میں فرماتے ہیں

وقد استخرج له الحافظ ابن حجر اصلا من السنة وكذا الحافظ السيوطي ورد على الفاكهاني المالكي في قوله ان عمل المولد بدعة مذمومة۔ انتهىٰ (سيرة حلبيه جلد ١ صفحه ٨٠)

ترجمہ: ''بے شک عمل مولد کیلئے حافظ ابن حجر نے سنت سے اصل نکالی ہے اور اسیطرح حافظ سیوطی نے بھی اور ان دونوں نے فاکہانی مالکی پر اس کے اس قول میں سخت رد فرمایا ہے کہ (معاذ اللہ) عمل مولد بدعت مذمومہ ہے۔ (سیرۃ حلبیہ) نیز مجمع بحار الانوار میں ہے

☆ مظهر منبع الانوار والرحمة شهر ربيع الاول وانه شهر امرنا باظهار الحبور فيه كل عام. ربیع الاول کا مہینہ منبع انوار اور رحمت کا مظہر ہے۔ یہ ایسا مہینہ ہے جس میں ہر سال ہمیں اظہار سرور کا حکم دیا گیا ہے۔ (مجمع بحار الانوار جلد ۳، صفحہ ۵۵)

☆ اور ما ثبت بالسنۃ میں ہے ''ولا زال اهل الاسلام يحتفلون بشهر مولده صلى الله عليه وسلم'' (ما ثبت بالسنۃ، ص ۷۹) اور اہل اسلام ہمیشہ محفلیں منعقد کرتے رہے حضور ﷺ کے میلاد مبارک کے مہینے میں۔

☆ اس مقام پر حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ پوری عبارت لکھی ہے جو مواہب اللدنیہ سے ابھی نقل کر چکے ہیں۔

الدر الثمين في مبشرات النبي الامين میں بائیسویں حدیث کے ذیل میں ہے، شاہ عبد الرحیم والد ماجد شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''میں ہر سال ایام مولد شریف میں کھانا پکا کر لوگوں کو کھلایا کرتا تھا۔ ایک سال قحط سالی کی وجہ سے بھنے ہوئے چنوں کے سوا کچھ میسر نہ ہوا، میں نے وہی چنے تقسیم کر دیئے۔ رات کو حضور ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی بھنے ہوئے چنے حضور ﷺ کے سامنے رکھے ہوئے ہیں اور حضور ﷺ ان چنوں سے بہت خوش اور مسرور ہیں۔'' (الدر الثمین صفحہ ۸)

☆ مولد النبی میں ابن جزری محدث شافعی نے نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ تمام بلادِ عرب و عجم میں محافل میلاد مبارک کے انعقاد کا ذکر فرمایا ہے۔ بخوف طوالت صرف حوالہ پر اکتفا کیا گیا۔

☆ انسان العیون، تفسیر روح البیان، شمائم امدادیہ اور فیصلہ ہفت مسئلہ میں بھی میں بھی میلاد شریف کی مبارک محفلوں کے انعقاد کا بیان مذکور ہے۔ انشاء اللہ العزیز قیام میلاد کے ذیل میں ان کی عبارات ہدیۂ ناظرین ہوں گی۔

قیام میلاد اور صلوٰۃ و سلام

☆ بعض لوگ میلاد پاک میں قیام تعظیمی اور صلوٰۃ و سلام کو بھی بدعت مذمومہ کہتے ہیں حالانکہ یہ طریقہ ان کے اکابر علماء اور مشائخ میں بھی جاری رہا اور جلیل القدر ائمہ دین اور اعلام امت عمل مولد و قیام میلاد کے عامل رہے۔ انسان العیون (سیرۃ حلبیہ) میں ہے

ومن الفوائد انه جرت عادة كثير من الناس اذا سمعوا بذكر وضعه صلى الله عليه وسلم ان يقوموا تعظيما له صلى الله

علیہ وسلم وھذا القیام بدعة لاصل لھا ای لکن ھی بدعة حسنة لانهٗ لیس کل بدعة مذمومة (سیرت حلبیہ جلد اول صفحہ ۸۰)

ترجمہ: ''اور فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر لوگوں کی یہ عادت ہو جاری ہو گئی کہ جب حضور ﷺ کی پیدائش مبارک کا ذکر سنا تو فوراً حضور ﷺ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور یہ قیام بدعت ہے۔ جس کی کوئی اصل نہیں۔ یعنی بدعت حسنہ ہے۔ کیونکہ ہر بدعت مذمومہ نہیں ہوتی۔''

☆ آگے چل کر اسی صفحہ پر فرماتے ہیں

وقد وجد القیام عند ذکر اسمہ صلی اللہ علیہ وسلم من عالم الامة ومقتدی الائمة دینار و ورعا الامام تقی الدین السبکی وتابعهٗ علٰی ذٰلک مشائخ الاسلام فی عصرہٖ فقد حکٰی بعضھم ان الامام السبکی اجتمع عندهٗ جمع کثیر من علماء عصرہٖ فانشد منشد ول الصر صری فی مدحہ ﷺ۔

"قلیل لمدح المصطفٰی الخط بالذھب
علٰی ورق من خط احسن من کتب
وان تنھض الاشراف عند سماعہ
قیامًا صفوفًا او جیثًا علی الرکب"

فعند ذٰلک قام الامام السبکی رحمہ اللہ وجمیع من فی المجلس فحصل انس کبیر بذالک المجلس ویکفی مثل ذٰلک فی الاقتداء (انتھٰی، سیرة حلبیہ جلد اول صفحہ ۸۰)

ترجمہ: ''حضور سید عالم ﷺ کے ذکر مبارک کے وقت قیام پایا گیا ہے امت محمدیہ کے جلیل القدر عالم امام تقی الدین سبکی سے جو دین اور تقویٰ میں ائمہ کے مقتدا ہیں اور اس پر ان کے تابع ہوئے تمام مشائخ اسلام جو ان کے ہم عصر تھے۔ چنانچہ منقول ہے کہ امام سبکی کے پاس ان کے ہم عصر علماء کرام بکثرت جمع ہوئے۔ ایک مداح رسول نے حضور ﷺ کی مدح میں صرصری، رحمۃ اللہ علیہ کے یہ اشعار پڑھے، اگر چاندی پر سونے کے حروف سے بہترین کاتب حضور ﷺ کی مدح لکھے تب بھی کم ہے۔ بے شک عزت و شرف والے لوگ حضور ﷺ کا ذکر جمیل سن کر صف بستہ قیام کرتے ہیں یا گھٹنوں پر دو زانو ہو جاتے ہیں۔ یہ اشعار سن کر امام سبکی کھڑے ہو گئے اور ان کے ساتھ تمام اہل مجلس، مشائخ و علماء بھی کھڑے ہو گئے اور اس وقت بڑا انس حاصل ہوا۔ مجلس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی اور اس قسم کے واقعات مشائخ و علماء کی اقتداء کے بارے میں کافی ہوتے ہیں۔ انتہٰی

☆ ثابت ہوا کہ مسئلہ قیام میں امام سبکی اور ان کے ہم عصر مشائخ و علماء کی اقتدا کافی ہے۔ بالکل یہی مضمون اور منقولہ بالا دونوں شعر اور اس کے بعد امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تمام رفقا اہل مجلس کا قیام علامہ شیخ اسمٰعیل حقی بروسی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر روح البیان میں ارقام فرمایا ملاحظہ فرمائیے۔ (تفسیر روح البیان جلد ۹ ص ۴۵)

☆ اور حاجی امداد اللہ صاحب فیصلہ ہفت مسئلہ میں فرماتے ہیں ''اور مشرب فقیر کا یہ ہے کہ محفل مولد میں شریف ہوتا ہوں بلکہ ذریعہ

برکات سمجھ کر ہر سال منعقد کرتا ہوں اور قیام میں لطف ولذت پاتا ہوں۔" (فیصلہ ہفت مسئلہ مطبوعہ قیومی پریس کانپور ص ۵) یہی حاجی امداد اللہ صاحب شمائم امدادیہ میں فرماتے ہیں اور قیام کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ ہاں مجھ کو ایک کیفیت قیام میں حاصل ہوتی ہے۔ (شمائم امدادیہ ص ۸۸)

☆ محفل میلاد مبارک میں حضور ﷺ کی تشریف آوری کے بارے میں ہی حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ شمائم امدادیہ میں فرماتے ہیں "ہمارے علماء مولد شریف میں بہت تنازع کرتے ہیں، تاہم علماء جواز کی طرف بھی گئے ہیں، جب صورت جواز کی موجود ہے پھر کیوں ایسا تشدد کرتے ہیں اور ہمارے واسطے اتباع حرمین کافی ہے۔ البتہ وقت قیام کے اعتقاد تولد کا نہ کرنا چاہئے اگر احتمام تشریف آوری کا کیا جاوے مضائقہ نہیں کیونکہ عالم خلق مقید بزمان ومکان ہے لیکن عالم امر دونوں سے پاک ہے۔ پس قدم رنجہ فرمانا ذاتِ بابرکات کا بعید نہیں۔" انتہی (شمائم امدادیہ ص ۹۳)

☆ دنیا میں کروڑوں جگہ محافل میلاد منعقد ہوتی ہیں لیکن کسی محفل میں بھی حضور ﷺ کا قدم رنجہ فرمانا حضرت حاجی صاحب کے نزدیک بعید نہیں اور حضور ﷺ کی تشریف آوری کا خیال کرنا بھی شرعاً کوئی مضائقہ نہیں رکھتا۔ جو لوگ حضور ﷺ کے تشریف لانے کے منکر ہیں اس اعتقاد کو معاذ اللہ کفر و شرک سمجھتے ہیں، وہ شمائم امدادیہ کی منقولہ بالا عبارت کو غور سے پڑھیں۔

☆ رہا یہ امر کہ قیام میں صلوٰۃ وسلام پڑھنے کی کیا دلیل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ارشادِ خداوندی "صلوا علیہ وسلموا تسلیما" مطلق ہے۔ ہر وہ حالت جو شرعاً صلوٰۃ وسلام کے لئے مکروہ اور نامناسب نہیں آیت کریمہ کی رو سے اس میں صلوٰۃ وسلام جائز ہوگا۔ ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قیام میلاد ذوق وشوق کی حالت میں کیا جاتا ہے۔ اور یہ حال درود وسلام کے لئے بہت موزوں اور مناسب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت "یا" حرف ندا کے ساتھ بصیغہ خطاب صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں کیونکہ حالت ذوق میں محبوب کو خطاب کرنا فطری امر ہے۔ اور "یا" حرف ندا سے خطاب کو ناجائز سمجھنا انتہائی محروم القسمتی کی دلیل ہے۔ اوراد فتحیہ میں ص ۳۲ سے ص ۳۴ تک "الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللّٰہ" کا ورد موجود ہے اور اس میں ستر ہ مرتبہ "یا" حرف ندا کے ساتھ صلوٰۃ وسلام وارد ہے۔ اسی اوراد فتحیہ کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں فرماتے ہیں "وچوں سلام دہد باوراد فتحیہ خواندان مشغول شود کہ از تبرکات انفاس ہزار و چہار صد ولی کامل جمع شدہ است" جب سلام پھیرے اوراد فتحیہ پڑھنے میں مشغول ہو کہ ایک ہزار چار سو لی کامل کے متبرک کلام سے جمع ہوا ہے۔
(انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ ۱۲۴، ۱۲۵ مطبوعہ آرمی برقی پریس دہلی)

☆ الحمدللہ! ہمارے بیان کردہ حوالہ جات وعبارات سے انعقاد محفل میلاد کا استحباب اور قیام میلاد وصلوٰۃ، صلوٰۃ وسلام کا جائز اور موجب ازدیاد محبت وباعث ذوق وشوق ہونا اچھی طرح واضح ہو گیا۔ معترضین کے شکوک وشبہات کے جواب بھی احسن طریقے سے دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب سید عالم نورِ مجسم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے طفیل ہمیں اپنی مرضیات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ط

وَمَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ

وَمَا اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ

ترجمہ ☆ اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو (اے محمد ﷺ) مگر رحمت بنا کر تمام جہانوں کے لئے

☆ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے نزدیک یہ امر قطعی ہے کہ اس آیت کریمہ میں کاف خطاب سے مراد حضور سید عالم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدسہ ہے اور یہ امر بھی واضح ہے کہ رحمۃ للعالمین ہونا حضور نبی کریم ﷺ کا وصف خاص ہے یعنی حضور ﷺ کے علاوہ کوئی رحمۃ للعالمین نہیں ہوسکتا جس کی دلیل یہ ہے کہ آیت کریمہ حضور ﷺ کی مدح میں وارد ہے اور قاعدہ ہے کہ مقام مدح میں جو وصف وارد ہوگا وہ ممدوح کے ساتھ خاص ہوگا کیونکہ تخصیص کے بغیر مدح ممکن نہیں۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ رحمۃ للعالمین ہونے کا وصف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے خاص ہو۔ کسی مسلم ہستی کے کلام میں کسی دوسرے کے لئے اگر مسامحہ کے طور پر یہ لفظ یا اس کا ہم معنی کوئی کلمہ وارد بھی ہو تو اسے مبالغہ یا مجاز پر محمول کیا جائے گا۔ حقیقت وواقعیت سے اس کو کوئی تعلق نہ ہوگا۔

☆ **العٰلمین** سے مراد صرف انسان یا جن وبشر وملائکہ ہی نہیں بلکہ کل ماسوی اللہ ہے اس لئے کہ حضور ﷺ کا رحمۃ للعالمین ہونا جہت رسالت سے ہے اور رسالت کل مخلوق کے لئے عام ہے جیسا کہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا، **ارسلت الی الخلق کافۃ** (رواہ مسلم) ''میں تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

☆ جب رسالت کل مخلوق کے لئے عام ہے تو رحمت بھی سارے جہانوں کے لئے عام ہے تو رحمت بھی سارے جہانوں کے لئے عام اور اللہ کے سوا ہر ذرے کو شامل قرار پائی۔ وللّٰہ الحمد!

☆ اس کے بعد لفظ **رحمۃ** کی طرف آیئے۔ مفسرین نے اس کی دو توجیہیں کی ہیں۔ اگر مستثنیٰ منہ اعم علل ہو تو ''**رحمۃ**'' **ارسلنا** فعل کا مفعول لہٗ قرار پائے گا اور تقدیر عبارت یہ ہوگا ''**وما ارسلنٰک لعلۃ من العلل الا لاجل الرحمۃ للعٰلمین۔**'' (ہم نے آپ کو کسی کے لئے نہیں بھیجا صرف عالمین کے واسطے ''رحمت'' کے لئے بھیجا ہے) اور اگر اعم احوال کو مستثنیٰ منہ بنایا جائے تو رحمت ضمیر خطاب سے حال ہوگا اور لفظ رحمت مصدر بمعنی للفاعل ہو کر بمعنی راحم قرار پائے گا اور تقدیر عبارت یوں ہوگی کہ ''**وما ارسلنٰک فی حال من الاحوال الا حال کونک راحما للعٰلمین۔**'' (اے محبوب ﷺ! نہیں بھیجا ہم نے آپ کو کسی حال میں مگر صرف اس حال میں کہ آپ تمام جہانوں کے لئے رحم کرنے والے ہیں۔ لفظ رحمت مفعول لہٗ ہو یا حال بہر صورت آپ تمام جہانوں کے لئے راحم قرار پاتے ہیں کیونکہ مفعول لہٗ سبب فعل ہوتا ہے اور فاعل بھی سبب فعل ہے اس لئے حضور ﷺ کا راحم ہونا حال اور مفعول لہٗ دونوں کے مطابق ہے۔ خلاصۃ الکلام یہ کہ حضور نبی کریم ﷺ تمام کائنات، کل مخلوقات، ایک ایک ذرہ، ایک ایک قطرہ غرض اللہ کے سوا ہر شے کے لئے رحم فرمانے والے ہیں۔

☆ بیان سابق کی روشنی میں جب حضور علیہ کا تمام عالمین کے لئے راحم ہونا ثابت ہوگیا تو رَاحِمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ہونے کے لوازمات ومناسبات بھی ثابت ہو گئے۔ کیونکہ قاعدہ کلیہ ہے کہ اذا ثبت الشیء ثبت بجمیع لوازمہ جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو اپنے تمام لوازمات کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔

☆ کسی پر رحم کرنے کے لئے چار باتیں لازم ہیں

نمبر ۱: سب سے پہلے تو یہ امر لازم ہے کہ رحم کرنے والا زندہ ہو مردہ نہ ہو کیونکہ مردہ رحم نہیں کر سکتا وہ خود رحم کا طالب و مستحق ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر حضور علیہ معاذ اللہ زندہ نہ ہوں تو رَاحِمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ نہیں ہو سکتے۔ جب آیت قرآنیہ سے حضور علیہ کا رَاحِمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ہونا ثابت ہوگیا تو حضور علیہ کا زندہ ہونا بھی ثابت ہوگیا۔

نمبر ۲: دوسری بات یہ ہے کہ صرف زندہ ہونے سے کسی پر رحم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ رحم کرنے والا مرحوم کے حال کا عالم نہ ہو کیونکہ بے خبر کسی پر کیا رحم کرے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ فرض کیجئے زید انتہائی مظلوم ہے اور چاہتا ہے کہ کوئی شخص اس پر رحم کر کے ظالم کے ظلم سے اسے بچائے۔ اسی خواہش کو دل میں لے کر وہ عمرو کے پاس جاتا ہے اور اس سے رحم کی درخواست کرتا ہے۔ عمرو اس کی درخواست سن لیتا ہے مگر اسے کچھ معلوم نہیں کہ اس کا حال کیا ہے؟ وہ نہیں جانتا کہ یہ کس مصیبت میں مبتلا ہے اور کس نوعیت کے رحم کا طالب ہے اس لئے وہ اس سے دریافت کرتا ہے کہ تمہیں تکلیف کیا ہے اور تم کس طرح کی مہربانی چاہتے ہو۔ اب اگر زید اسے اپنا حال نہ بتائے اور یہی کہتا رہے کہ آپ میرا حال نہ پوچھیے بس مجھ پر رحم کر دیجیے تو کیا عمرو اس پر رحم کر سکتا؟ نہیں اور یقیناً نہیں۔ جب تک وہ اپنا حال نہ بتائے اور عمرو اس کے حالات سے پوری طرح باخبر نہ ہو اس وقت تک وہ اس پر قطعاً رحم نہیں کر سکتا۔ آیت قرآنیہ کی روشنی میں حضور علیہ رَاحِمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ہیں تو جب تک حضور علیہ تمام عالمین ماسوی اللہ جمیع کائنات ومخلوقات کے حالات کو نہ جانیں اور جمیع ما یوکن کا علم حضور علیہ کو نہ ہو اس وقت تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام رَاحِمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ نہیں ہو سکتے جب تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا رَاحِمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ہونا ثابت ہے تو تمام کائنات کے احوال کا عالم ہونا بھی ثابت ہوگیا۔

نمبر ۳: تیسری بات یہ کہ صرف عالم ہونے سے بھی کسی پر رحم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ مرنے والا مرحوم تک اپنی رحمت ونعمت پہنچانے کی قدرت واختیار نہ رکھتا ہو۔ مثال کے طور پر ایک شخص شب وروز ہمارے پاس مقیم ہے وہ دن رات اللہ تعالیٰ کی عبادت وطاعت میں مشغول رہتا ہے اور عبادت وریاضت کرتے کرتے وہ اس قدر ضعیف وناتواں ہوگیا ہے کہ اس کیلئے چلنا پھرنا اور اٹھنا بیٹھنا تک دشوار ہوگیا ہے اگر ایسے شخص کو ڈاکہ زنی اور قتل وغارت کے الزام میں پکڑ کر تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے اور وہ بے گناہ اس وقت ہم سے رحم کی درخواست کرتے ہوئے کہے کہ آپ خوب جانتے ہیں کہ میں بے گناہ ہوں آپ مجھ پر رحم کیوں نہیں کرتے تو ہم اسے یہی جواب دیں گے کہ واقعی ہم آپ کے حال سے اچھی طرح باخبر ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ آپ بے گناہ ہیں مگر فقط جاننے سے کیا ہوتا ہے؟ ہمارے پاس وہ قدرت واختیار نہیں کہ آپ کو تختۂ دار سے بچالیں۔ اپنی رحمت آپ تک پہنچانے کا جب تک ہمیں اختیار نہ ہو اور قدرت نہ پائی جائے اسوقت تک ہم

آپ پر رحم نہیں کر سکتے۔ معلوم ہوا قدرت واختیار کا ہونا بھی رحم کرنے کیلئے ضروری ہے۔ جب حضور ﷺ تمام مخلوقات اور کل کائنات کیلئے علی الاطلاق راحم ہیں تو ہر ذرۂ کائنات تک رحمت ونعمت پہنچانے کی قدرت واختیار بھی حضور ﷺ کیلئے حاصل ہے۔

نمبر۴: چوتھی بات یہ کہ صرف قدرت واختیار سے بھی کام نہیں چلتا۔ کسی پر رحم کرنے کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ رحم کرنے والا مرحوم کے قریب ہو اور مرحوم راحم کے قریب ہو۔

☆ اس بات کو ایک مثال کے ذریعے یوں سمجھیئے کہ مثلاً آپ تین فرلانگ کے فاصلہ پر کھڑے ہیں اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خونخوار دشمن نے آپ کے مخلص دوست پر حملہ کر دیا وہ چلّا کر آپ سے رحم کی درخواست کرنے لگا۔ آپ اس کی مدد کے لئے دوڑے اور خلوص قلب سے اس پر رحم کرنے کے لئے آگے بڑھے مگر آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی دشمن نے اسے ہلاک کر دیا۔ اب غور کریں آپ زندہ بھی ہیں اور اس دوست کو بچشم خود ملاحظہ فرما رہے ہیں اور اس کے حال کے عالم بھی ہیں، رحم کرنے کی قدرت اور طاقت بھی آپ کے اندر پائی جاتی ہے۔ آپ اپنے اختیار سے رحم کر سکتے ہیں لیکن صرف اس وجہ سے کہ وہ مخلص دوست آپ سے دور ہے اور آپ اس سے دور ہیں۔ آپ اپنی حیات، قدرت واختیار کے باوجود بھی اس پر رحم نہیں کر سکتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ رحم کرنے کے لئے راحم کا مرحوم سے قریب ہونا بھی ضروری ہے۔

☆ جب آیت قرآنیہ سے رسول اللہ ﷺ کے لئے تمام جہانوں اور مخلوقات کیلئے ہر ذرے کے لئے راحم ہونا ثابت ہو گیا تو یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ حضور ﷺ اپنی روحانیت ونورانیت کیساتھ تمام کائنات کے قریب ہیں اور ساری کائنات حضور ﷺ سے قریب ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

☆ اگر یہاں یہ شبہ پیدا کیا جائے کہ ایک ذات تمام جہانوں کے قریب کیسے ہو سکتی ہے؟ ایک فرد کسی ایک سے قریب ہو گا تو اس کے علاوہ باقی سب سے دور ہو گا۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ فردِ واحد افرادِ کائنات میں سے ہر فرد کے قریب ہو؟

☆ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن دو کے درمیان نزدیکی متصور ہے اگر وہ دونوں کثیف ہوں تو واقعی ایسا ہی ہو گا کہ فردِ واحد افرادِ مختلفہ فی الزمان والمکان سے بیک وقت قریب نہیں ہو سکتا اور اگر دونوں لطیف ہوں یا دونوں میں سے کوئی ایک لطیف ہو تو جو لطیف ہو گا وہ بیک وقت تمام موجوداتِ کائنات سے قریب ہو سکتا ہے جس میں کوئی شرعی یا عقلی استحالہ لازم نہیں آتا۔ دیکھیئے ایک قرآن سارے جہان میں پایا جاتا ہے۔ مشرق ومغرب، جنوب وشمال، افریقہ وامریکہ، چین وجاپان میں ہر مسلمان حافظ قرآن کے سینے میں ایک قرآن ہے اور وہ ایک ہونے کے باوجود سب سے قرب ہے۔ عالم محسوسات میں شکل وصورت اور آواز ہی کو لے لیجئے کہ ایک شکل ایک صورت اور ایک ہی آواز بے شمار دیکھنے اور سننے والوں سے قریب ہے۔ ایک بولنے والے کی آواز تمام سامعین کے کانوں میں پہنچتی ہے اور ایک شکل وصورت سب دیکھنے والوں کی آنکھوں اور دماغوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اگرچہ حافظانِ قرآن کثیف ہیں اسی طرح سننے دیکھنے والے انسان بھی کثافت سے متصف ہیں لیکن قرآن شکل وصورت اور آواز یہ سب چیزیں لطیف ہیں

اس لئے سب کے قریب ہیں کسی سے دور نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی لطافت اتنی قوی اور ارفع واعلیٰ ہے جس کی شان کو کائنات ومخلوقات کی کوئی لطیف سے لطیف چیز بھی نہیں پہنچ سکتی۔

☆ اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تمام افرادِ ممکنات سے قریب ہونا بالکل واضح اور روشن ہے۔ ہم کثیف سہی لیکن حضور ﷺ تو لطیف ہیں۔ لہٰذا حضور ﷺ کا ہم سے قریب ہونا کوئی امر دشوار نہیں۔ آواز کی لطافت کا یہ حال ہے کہ جہاں تک ہوا جاسکتی ہے آواز بھی وہاں تک پہنچ سکتی ہے لیکن رسول اللہ ﷺ آواز اور ہوا سے بھی زیادہ لطیف ہیں۔ ہوا اپنے مقام محدود سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور آواز ہوا سے آگے نہیں جاسکتی لیکن جہاں آواز اور ہوا بھی نہ جاسکے، آواز اور ہوا تو کیا، یوں کہیئے کہ جہاں جبریل امین علیہ السلام کا بھی گزر نہ ہوسکے وہاں بھی حضور ﷺ پہنچ جاتے جاتے ہیں بلکہ جہاں زمانہ اور مکان بھی نہ پایا جاسکے وہاں بھی حضور ﷺ پائے جاتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو شب معراج کا حال سامنے رکھ لیجئے جس سے آپ کو ہمارے بیان کی پوری تصدیق ہوجائے گی۔

☆ مختصر یہ کہ لطافت ایسی صفت ہے جس کے ہوتے ہوئے قرب اور بعد مکانی کا اشکال باقی نہیں رہتا اور حضور ﷺ تو ایسے لطیف ہیں کہ تمام کائنات میں کوئی چیز رسول اللہ ﷺ کے برابر لطیف پیدا نہیں ہوئی۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوبات شریف (ج ۳ ص ۱۸۷ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ) میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ تھا۔ دلیل یہ ہے کہ ہر چیز کا سایہ اس چیز سے زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کا سایہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کے وجود مبارک سے زیادہ لطیف ہوتا اور حضور ﷺ کے وجود مبارک کے برابر کوئی لطیف چیز جہان میں پیدا نہیں ہوئی چہ جائیکہ اس سے زیادہ لطیف ہو۔ اس صورت میں حضور ﷺ کا سایہ کس طرح ہوسکتا ہے؟

☆ حاصل کلام یہ ہے کہ حضور ﷺ تمام عالموں کے قریب اسی وقت ہوسکتے ہیں کہ جب اعلیٰ درجے کے نورانی، روحانی اور لطیف ہوں۔ چونکہ رَاحِمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ہونے کی وجہ سے ان کا تمام جہانوں سے قریب ہونا ضروری ہے اس لئے ان کا روحانی، نورانی اور لطیف ہونا بھی ضروری ہوا۔ ایک آیت سے پانچ مسئلے وضاحت کے ساتھ ثابت ہوگئے یعنی حضور ﷺ تمام عالموں کے لئے رحمت فرمانے والے ہیں لہٰذا زندہ ہیں اور تمام کائنات کے حالات وکیفیات کے عالم بھی ہیں اور ساتھ ہی عالم کے ہر ذرہ تک اپنی رحمت اور نعمت پہنچانے کی قدرت اور اختیار بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ تمام عالم کو محیط اور تمام کائنات کی ہر شے سے قریب بھی ہیں۔ نیز ایسے روحانی، نورانی اور لطیف ہیں کہ جس کی بنا پر آپ کا کسی ایک چیز سے قریب ہونا دوسری چیز سے بعید ہونے کو مستلزم نہیں بلکہ بیک وقت تمام افرادِ عالم سے یکساں قریب ہیں۔

اسراء ...... اور ...... معراج

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ط

نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡکَرِیۡمِ

☆ حضور نبی اکرم نورِ مجسم سید عالم ﷺ کے اخص خصائص اور اشرف فضائل و کمالات اور روشن ترین معجزات و کرامات سے یہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو فضیلت اسراء اور معراج سے وہ خصوصیت و شرافت عطا فرمائی۔ جسکے ساتھ کسی نبی اور رسول کو مشرف و مکرم نہیں فرمایا اور جہاں اپنے محبوب ﷺ کو پہنچایا۔ کسی کو وہاں تک پہنچنے کا شرف نہیں بخشا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

سبحٰن الذی اسرٰی بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ لنریہ من اٰیتنا انہ ھو السمیع البصیر

ترجمہ: ''پاک ہے جو لے گیا اپنے (خاص) بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے طرف مسجد اقصیٰ کے جس کے آس پاس ہم نے (بہت) برکت نازل فرمائی۔ تاکہ ہم (اپنے) اس (بندۂ خاص) کو اپنی قدرت کی (خاص) نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

اسراء اور معراج میں فرق

☆ اگرچہ عام استعمالات میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس تمام مبارک سیر و عروج یعنی مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ اور وہاں سے آسمانوں اور لامکان تک تشریف لے جانے کو معراج کہا جاتا ہے۔ لیکن محدثین و مفسرین کی اصطلاح میں حضور ﷺ کا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک تشریف لے جانا اسراء کہلاتا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس کو لفظ اسراء سے تعبیر فرمایا ہے اور مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کی طرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عروج فرمانا معراج کہلاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے لئے معراج اور عروج کے الفاظ احادیث صحیحہ میں وارد ہوئے ہیں۔

اسراء، معراج اور اعراج

☆ حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی رضی اللہ عنہ فارسی میں فرماتے ہیں۔ جس کا اردو خلاصہ یہ ہے کہ (مسجد حرام سے) بیت المقدس تک اسراء ہے اور وہاں سے آسمانوں تک معراج ہے اور آسمانوں سے مقام قاب قوسین تک اعراج ہے۔ (فوائد الفواد ص ۳۰۸)

آیت اسراء

☆ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم و جلیل واقعہ کے بیان کو لفظ سبحان سے شروع فرمایا جس کا مفاد اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور ذات باری کا ہر عیب و نقص سے پاک ہونا ہے۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ واقعاتِ معراج جسمانی کی بناء پر منکرین کی طرف سے جس قدر اعتراضات ہو سکتے تھے ان سب کا جواب ہو جائے۔ مثلاً حضور نبی کریم ﷺ کا جسم اقدس کے ساتھ بیت المقدس یا آسمانوں پر تشریف لے جانا اور وہاں سے ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی کی منزل تک پہنچ کر تھوڑی دیر میں واپس تشریف لے آنا منکرین کے نزدیک ناممکن اور محال تھا۔ اللہ تعالیٰ نے لفظ

سبحان فرما کر یہ ظاہر فرمایا کہ یہ تمام کام میرے لئے بھی ناممکن اور محال ہوں تو یہ میری عاجزی اور کمزوری ہوگی اور عجز وضعف عیب ہے اور میں ہر عیب سے پاک ہوں۔ اسی حکمت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے اَسْرٰی فرمایا جس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ حضور ﷺ کو جانے والا نہیں فرمایا بلکہ اپنی ذات مقدسہ کو لے جانے والا فرمایا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لفظ سبحان اور اَسْرٰی فرما کر معراج جسمانی پر ہونے والے ہر اعتراض کا جواب دیا ہے اور اپنے محبوب ﷺ کی ذاتِ مقدسہ کو اعتراضات سے بچایا ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ اے منکرو! خبردار، واقعہ معراج میں میرے حبیب (ﷺ) پر اعتراض کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ اس لئے کہ اس نے معراج کرنے اور مسجد اقصیٰ یا آسمانوں پر خود جانے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ایسی صورت میں تمہیں اس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ یہ دعویٰ تو میرا ہے کہ میں اپنے حبیب ﷺ کو لے گیا۔ اب اگر میرے لے جانے پر اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ کیسے لے گیا؟ یہ لے جانا اور ذرا سی دیر میں آسمانوں کی سیر کرا کے واپس لے آنا تو ممکن نہیں۔ تو یاد رکھو کہ میں سبحان ہوں۔ جو چیز مخلوق کے لئے عادتاً ناممکن اور محال ہے، اگر میرے لئے بھی اسی طرح محال اور ناممکن ہو تو میں عاجز اور ناتواں ٹھہروں گا اور عاجزی وناتوانی عیب ہے اور میں ہر عیب سے پاک ہوں۔ معلوم ہوا کہ آیت اَسْرٰی کا پہلا لفظ ہی معراج جسمانی کی روشن دلیل ہے۔ وللّٰہ الحمد!

نکتہ

☆ اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ میں نہ اپنا نام لیا اور نہ اپنے حبیب ﷺ کا اپنی ذات پاک کو اَلَّذِیْ اور اپنے حبیب ﷺ کو عَبْدِہٖ سے تعبیر فرمایا۔ اَلَّذِیْ اسم موصول ہے، جس کے معنی ہیں ''وہ ذات'' یہ ایسا لفظ ہے کہ ہر چیز پر اس کا اطلاق کر سکتے ہیں اور ہر چیز کو اَلَّذِیْ کہہ سکتے ہیں اور لفظ عبد بھی ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے عبد ہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے حبیب، دونوں کے لئے ایسا لفظ ارشاد فرمایا جو تمام ممکنات کو حاوی ہے۔ ہر شے اَلَّذِیْ ہے اور ہر چیز عبد ہے۔ گویا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اَلَّذِیْ تو ہر چیز ہے لیکن جس کو کامل اَلَّذِیْ کہا جا سکے وہ وہی ہے جو اَسْرٰی کا فاعل ہے۔ کیونکہ اَلَّذِیْ کے معنی ہیں ''وہ ذات'' اور ظاہر ہے کہ کمال ذات، وجوب ذاتی، الوہیت اور قدرتِ کاملہ کے بغیر متصور نہیں۔ واجب ممکن کو اور الٰہ معبود ہر عبد ومملوک کو اور قادرِ مطلق ہر مقدور کو محیط ہے اور اس میں شک نہیں کہ واجب بالذات، معبود برحق اور قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ لہٰذا کامل اَلَّذِیْ صرف اللہ تعالیٰ ہے اور کمال کی دلیل اَسْرٰی ہے کیونکہ معراج کو لے جانا قدرتِ کاملہ کے بغیر محال ہے اور قدرتِ کاملہ جس کے لئے ہوگی معبودِ برحق وہی ہوگا اور معبودِ برحق کے لئے وجوب ذاتی لازم ہے اور وجوب ذاتی ہی اَلَّذِیْ کا کمال ہے۔ لفظ اَلَّذِیْ دال ہے اور ذاتِ کاملہ اس کا مدلول۔ دال کا تمام کائنات کو حاوی ہونا اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ مدلول ہر ذرہ کائنات کو بالذات محیط ہے۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ

☆ علیٰ ہٰذا القیاس ''عبد'' بھی ہر چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق اس کی عبد ہے لیکن جس کو تمام عباد کاملین میں سے سب سے زیادہ کامل اور عبد اکمل کہا جا سکے وہ وہی ہے جو اَسْرٰی ہے۔ جس کا مفعول بہٖ یعنی عبدِ مقدس ہے کیونکہ عبدہ کے معنی ہے ''اللہ کا بندہ'' اور اللہ کی بندگی کا سب سے بڑا کمال اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی نزدیکی ہے۔ اسراء اور معراج میں اس عبدِ مقدس ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا جو قرب

نصیب ہوا اور مرتبہ قاب قوسین کی جو نزدیکی حاصل ہوئی وہ اولین و آخرین میں سے آج تک نہ تو کسی کو حاصل ہوئی ہے نہ ہو گی اور نہ ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے جملہ عباد میں عبد کامل صرف ''عبدہ'' ہے اور بس!

☆ حاصل کلام یہ کہ جس طرح اَلَّذِیْ سب ہیں مگر کامل اَلَّذِیْ (واجب الوجود) صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی طرح ''عبد'' سب ہیں مگر کامل عبد صرف حضرت محمد ﷺ ہیں۔ لفظ عبد دال ہے اور کامل فی العبودیت (حضرت محمد رسول اللہ ﷺ) مدلول۔ دال کا تمام عالم کو حاوی ہونا اشارہ ہے۔ اس امر کیطرف کہ مدلول تمام موجوداتِ عالم کو (بالعطاء) محیط ہے (وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ)

☆ اَلَّذِیْ اور عبد کا تمام ممکنات اور موجودات کو محیط ہونا اس امر کی طرف بھی مشیر ہے کہ تمام عالم اَلَّذِیْ اور ''عبدہ'' کے حسن و جمال کا آئینہ دار ہے۔ جس طرح ہر تعین میں وجود حقیقی کامل اَلَّذِیْ (رب العالمین) کا جلوہ ہے، ایسے ہی ہر مخلوق میں حقیقت نوری کامل عبد رحمۃ للعالمین کا ظہور ہے جَلَّ جَلَالُهٗ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ اَلَّذِیْ اور عبدہ دونوں میں ابہام ہے اور اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا حسن ذات تمام کائنات سے ابہام میں ہے اسی طرح ذاتِ محمدی ﷺ کا حسن بھی نگاہِ عالم سے مبہم اور پوشیدہ ہے۔ پھر اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ میں چونکہ ضمیر ھُوَ کا مرجع اَلَّذِیْ اور عبد دونوں ہو سکتے ہیں (روح المعانی پ ۱۵ ص ۱۳، روح البیان پ ۵ ص ۱۰۶) اس لئے یہ احتمال اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ شب معراج اَلَّذِیْ عبدہ کا سمیع و بصیر ہوا اور عبدہ اَلَّذِیْ کا۔

مقام عبدیت

☆ قربِ الٰہی کا وہ بلند ترین مقام ہے جہاں بندہ اپنے تعینات کو معدوم پا کر جلوہ معبود میں محو ہو جاتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر رَسُوْلِهٖ وَ نَبِیِّهٖ نہیں فرمایا بلکہ بعبدہٖ فرمایا۔

عبدہٖ: معراج کے بیان میں عبدہٖ فرما کر اس حقیقت کی طرف اشارہ فرما دیا کہ باوجود اس قرب عظیم کے جو شب معراج میں میرے حبیب ﷺ کو حاصل ہوا وہ میرے عبد ہی ہیں معبود نہیں۔

عبد کی اقسام

☆ عبد کی کئی قسمیں ہیں لیکن ایک اعتبار خاص سے اس کی تین قسمیں ہیں۔ عبد رقیق، عبد ابق، عبد ماذون۔

☆ عبد رقیق سے مراد وہ مملوک غلام ہے جو پوری طرح اپنے مالک کے قبضہ اور اس کی ملک میں ہو۔

☆ عبد ابق اپنے مالک سے بھاگے ہوئے غلام کو کہتے ہیں (جو مالک مجازی کے قبضہ سے باہر ہوتا ہے)

☆ اور عبد ماذون وہ غلام ہے جو مالک کی ملک اور اس کے قبضہ میں ہے اور اس کی قابلیت صلاحیت استعداد اور خوبی کی وجہ سے اس کے مالک نے اپنے کاروبار کا اسے مختار و ماذون بنا دیا ہو اور اسے اس بات کا اذن دے دیا ہو کہ وہ مالک کے کاروبار میں جائز اور ممکن تصرف کرے۔ اس غلام کا بیچنا، خریدنا، لینا، دینا سب کچھ اس کے مالک کا بیچنا، خریدنا، لینا، دینا متصور ہو گا۔ عام مومنین خواہ عاصی ہوں

یا مطیع سب اللہ تعالیٰ کے بمنزلہ عبد رقیق کے ہیں اور کفار مشرکین منافقین بمنزلہ عبد ابق (بھاگے ہوئے غلام) کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے محبوبین بمنزلہ عبد ماذون کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کے قرب کے مطابق ماذونیت کا شرف عطا فرماتا ہے۔ ساری کائنات میں رسول اللہ ﷺ کے برابر کوئی اللہ تعالیٰ کا مقرب نہیں۔ اس لئے حضور ﷺ سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے عبدِ ماذون ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا

'وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی۔ وَمَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ۔" پھر فرمایا "اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡھِمۡ" اور حضور ﷺ نے فرمایا "اَللّٰہُ یُعۡطِیۡ وَاَنَا قَاسِمٌ"

☆ مختصر یہ کہ حضور ﷺ کے عبدِ ماذون ہونے کی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بولنا اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہے۔ حضور ﷺ کا فعل مبارک اللہ تعالیٰ کا فعل مبارک ہے۔ حضور ﷺ کا بیچنا اللہ تعالیٰ کا بیچنا ہے اور حضور ﷺ کا خریدنا اللہ تعالیٰ کا خریدنا ہے۔ حضور ﷺ کا دینا اللہ تعالیٰ کا دینا اور حضور ﷺ کا لینا اللہ تعالیٰ کا لینا ہے۔

عبدہٖ معراج جسمانی کی دلیل ھے

☆ اللہ تعالیٰ نے عبدہٖ فرما کر اس حقیقت کو روشن تر فرما دیا کہ معراج صرف روح کو نہیں ہوئی بلکہ روح مع الجسد کو ہوئی ہے کیونکہ قرآن وحدیث یا کلام عرب میں ایسا کوئی استعمال موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ کسی کی دنیاوی زندگی میں اسے عبد کہا گیا ہو اور لفظ عبد سے صرف روح مراد ہو بلکہ اس کے برعکس آپ قرآن وحدیث اور محاورات عرب میں یہی پائیں گے کہ جب بھی کسی کو اس کی حیاتِ ظاہری میں لفظ عبد سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس لفظ سے روح مع الجسد مراد لیا گیا ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا "فَاَسۡرِ بِعِبَادِیۡ لَیۡلًا" (پ ۲۵ سورۂ دخان) اے موسیٰ! میرے بندوں کو رات میں لے جا۔ یہاں بھی لفظ عبد سے روح مع الجسد اور اسراء سے اسراءِ جسمانی مراد ہے۔

☆ نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَرَاَیۡتَ الَّذِیۡ یَنۡھٰی عَبۡدًا اِذَا صَلّٰی" کیا تو نے اسے دیکھا جو روکتا ہے عبد (مقدس محمد مصطفیٰ ﷺ) کو جب وہ نماز پڑھے۔ دیکھئے یہاں بھی عبد سے جسم وروح کا مجموعہ مراد ہے۔ ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰہِ یَدۡعُوۡہُ" جب کھڑا ہوا اللہ کا عبد (مقدس حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ کو پکارتا یعنی اس کی عبادت کرتا تھا۔ اس آیت میں بھی لفظ عبد سے جسم وروح دونوں مراد ہیں۔ وللّٰہ الحمد

عبدہٖ کی اضافت

☆ اللہ تعالیٰ نے "اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ" فرمایا اور عبد کو ضمیر مجرور کی طرف مضاف کیا جو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ میرے محبوب ﷺ عام عباد کی طرح عبد نہیں بلکہ وہ عبد خاص ہیں بلکہ عبد نہیں عبدہ ہیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مضمون کو اس شعر میں ادا کیا ہے

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر او سراپا انتظار ایں منتظر

☆ لَيْلًا اسراء کے معنی رات کو لے جانے کے ہیں۔ اس کے باوجود لفظ اسریٰ کے بعد لیلاً فرمایا تا کہ ظاہر ہو جائے کہ معراج تمام رات نہیں ہوئی بلکہ رات کے بہت تھوڑے حصہ میں ہوئی ہے۔

مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

☆ مسجد حرام مکہ مکرمہ کی وہ مبارک مسجد ہے۔ جس کے وسط میں بیت اللہ شریف واقع ہے۔

مسجد اقصیٰ:

☆ مسجد اقصیٰ بیت المقدس کی وہ مشہور مسجد ہے جو انبیاء سابقین علیہم السلام کا مرکز رہی ہے۔ ان انبیاء کرام علیہم السلام ومحبوبین باری تعالیٰ کی ذواتِ قدسیہ سے جو برکتیں اس خطۂ پاک کو حاصل ہوئیں اللہ تعالیٰ نے بَارَكْنَا حَوْلَهُ فرما کر ان ہی کا اظہار فرمایا ہے۔

نکتہ: اللہ تعالیٰ نے بَارَكْنَا حَوْلَهُ فرمایا اس لئے کہ اردگرد برکتیں ہیں۔ اس کے اندر تو یقیناً عظیم وجلیل برکتیں ہوں گی۔

☆ خلاصہ یہ کہ فیہ فرمانے سے اندر کی برکتیں ثابت ہو جاتیں لیکن اردگرد ان کا ثبوت نہ ہوتا اور حَوْلَهُ فرمانے سے اس کے اندر اور باہر سب جگہ برکتیں ثابت ہو گئیں۔

لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا

☆ ان آیات سے آسمانی آیات مراد ہیں اور معنی یہ ہیں تا کہ ہم انہیں آسمانوں پر لے جا کر وہاں کی عجیب وغریب نشانیاں دکھائیں۔ روح المعانی میں اسی آیت کے تحت ارقام فرماتے ہیں "ای لنرفعه الی السماء حتّٰی یرٰی ما یرٰی من العجائب العظیمة" یعنی تا کہ ہم انہیں آسمانوں کی طرف اٹھائیں یہاں تک کہ وہ دیکھنے کے قابل عجیب وغریب نشانیاں دیکھیں۔ اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس آیت کریمہ میں اسراء اور معراج دونوں کا بیان ہے۔

لفظ مِنْ کی تشریح

☆ لفظ مِــنْ سے یہ سمجھنا کہ جب رسول اللہ ﷺ کو بعض آیتیں دکھائی گئیں اور بعض نہیں دکھائی گئیں تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تمام آیات کا علم نہ ہوا کسی طرح صحیح نہیں۔ اس لئے کہ آیات مختلف قسم کی تھیں۔ بعض کا تعلق دیکھنے سے تھا اور بعض ایسی تھیں جن کا تعلق سننے، سمجھنے اور چکھنے سے تھا۔ جیسے صریف اقلام کا سننا اور دودھ کا چکھنا وغیرہ۔ اگر من تبعیضیہ ہو تو اس کی وجہ سے کل آیات کا بعض مراد ہوں گی اور ظاہر ہے کہ جو آیتیں دیکھنے کے قابل ہیں وہ کل آیات کا بعض ہی ہیں۔ اس لئے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ کل آیات میں سے جو آیتیں دیکھنے کے قابل تھیں وہ سب ہم نے اپنے حبیب ﷺ کو دکھانے کے لئے آسمانوں پر بلند فرمایا۔ اس صورت میں بعض آیات سے حضور ﷺ کی لاعلمی ثابت نہ ہوئی۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ

☆ بے شک وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ بعض مفسرین نے اِنَّـهٗ کی ضمیر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف راجع کی اور بعض نے صرف رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کو عاجع کیا۔ جیسا کہ علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرمایا۔ (زرقانی شریف

جلد ۳ صفحہ ۱۴۴) اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ ضمیر اگر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو تب بھی جائز ہے اور اگر رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کو راجع کیا جائے تب بھی درست ہے۔ (دیکھئے روح المعانی پ ۱۵ ص ۱۴)

معراج جسمانی کے متعلق اختلافِ اقوال

☆ بعض کا قول ہے کہ معراج روحانی طور پر خواب میں ہوئی۔ بعض کہتے ہیں کہ معراج کئی دفعہ ہوئی۔ ایک دفعہ بیداری میں ہوئی اور دیگر اوقات میں بحالت خواب۔ بعض کہتے ہیں کہ معراج مکہ مکرمہ میں ہوئی اور بعض کے نزدیک مدینہ میں۔ بعض کہتے ہیں کہ اسراء جسمانی ہے اور معراج روحانی۔ لیکن جمہور علماء صحابہ تابعین وتبع تابعین اور ان کے بعد محدثین وفقہا اور متکلمین سب کا مذہب یہ ہے کہ اسراء اور معراج دونوں بحالت بیداری اور جسمانی ہیں اور یہی حق ہے اور عارفین کا قول ہے کہ اسراء اور معراج بہت مرتبہ حضور ﷺ کو کرائی گئیں۔ بعض نے چونتیس کو عدد بھی للکھا ہے مگر وہ سب خواب میں روحانی طور پر واقع ہوئیں۔ بجز ایک مرتبہ کے جیسا کہ جمہور امت کا مذہب ہے۔

ایک سوال کا جواب

☆ اگر سوال کیا جائے کہ جب اسراء اور معراج دونوں جسمانی ہیں اور بحالت بیداری ان کا تحقق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضور ﷺ کے مکہ شریف سے مسجد اقصیٰ تک لے جانے کے ذکر پر کیوں اکتفا فرمایا۔ اسراء کے ساتھ آسمانی معراج کا بیان نہ کرنے میں کیا حکمت ہے؟ تو جواباً عرض کیا جائے گا کہ آیت کریمہ میں مسجد اقصیٰ کے ذکر کی تخصیص اس لئے ہے کہ کفار قریش نے مسجد اقصیٰ دیکھی ہوئی تھی اور انہیں اس کے متعلق معلومات حاصل تھیں۔ اس لئے انہوں نے واقعہ معراج کا انکار کرتے ہوئے حضور ﷺ سے اس کی علامات وغیرہ دریافت کیں اور بڑی شدت کے ساتھ جھگڑا اور اختلاف کیا لیکن حضور ﷺ نے ان کو مسکت جوابات دیئے اور مسجد اقصیٰ کی تمام علامتیں اور نشانیاں بتائیں جو کفار قریش نے دریافت کی تھیں بلا کم وکاست بیان فرمادیں اور نہایت خوبی کے ساتھ ان پر حجت قائم فرمادی۔ جس کے بعد ان کے لئے مجال انکار باقی نہ رہی اور اس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسراء اور معراج کی صداقت پر ایک عظیم الشان دلیل قائم کی گئی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساھت مسجد اقصیٰ کا ذکر فرمایا۔ اگر ادنیٰ تامل سے کام لیا جائے تو قرآن کریم میں واقعہ معراج کی صداقت پر لاجواب دلیل قائم کی گئی ہے۔ وہ مسجد اقصیٰ کا ذکر ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو مشرکین مکہ کے ذہن میں مسجد اقصیٰ کی تمام علامتیں محفوظ تھیں اور دوسری طرف انہیں اس بات کا یقین تھا کہ حضرت محمد عربی ﷺ نے مسجد اقصیٰ کبھی نہیں دیکھی۔ جب انہوں نے سنا کہ حضور ﷺ مسجد اقصیٰ جانے اور معراج فرمانے کا حال بیان فرمارہے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ اس سے بہتر حضور ﷺ کی تکذیب کا موقع ہاتھ نہیں آسکتا۔ آسمان وغیرہ تو ہمارے دیکھے ہوئے نہیں۔ جن کی علامتیں اور نشانیاں ہم ان سے دریافت کریں لیکن مسجد اقصیٰ کا نقشہ تو ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔

☆ چلو اسی کی بابت ان سے سوالات کریں۔ جب ہماری دریافت کی ہوئی نشانیاں وہ نہ بتاسکیں گے تو (معاذ اللہ) ان کا دعویٰ خود

بخود جھوٹا ہو جائے گا لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ کفارِ قریش نے مسجد اقصیٰ کی جو نشانیاں پوچھیں حضور ﷺ ٹھیک ٹھیک بیان فرما دیں۔ جس کو سن کر اپنے دل میں انہیں قائل ہونا پڑا کہ واقعی یہ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں۔ مسجد اقصیٰ تک جانے میں جب حضور ﷺ کا سچا ہونا ثابت ہو گیا تو آسمانوں کی معراج بھی سچی ثابت ہو گئی۔ اس لئے کہ جس طرح آسمانوں پر جانا محال ہے بالکل اسی طرح رات کے تھوڑے سے حصہ میں مکہ سے مسجد اقصیٰ جا کر واپس آ جانا بھی محال ہے۔ جب یہ جانا اور آنا محال نہ رہا تو آسمان پر جا کر واپس آنا ان کے لئے کیونکر محال رہ سکتا تھا؟

☆ اس مختصر بیان سے واضح ہو گیا کہ مسجد اقصیٰ کا ذکر صداقت معراج کی دلیل اس لئے بن گیا کہ منکرین نے مسجد اقصیٰ دیکھی ہوئی تھی۔ اب اگر مسجد اقصیٰ کی طرح آسمانوں کا ذکر بھی تفصیل سے کر دیا جاتا تو وہ اس عظیم الشان خارق عادت واقعہ معراج کی سچائی کے لئے دلیل نہیں بن سکتا تھا۔ کیونکہ منکرین نے کبھی آسمان نہیں دیکھے تھے نہ ان کے ذہن میں وہاں کی کسی چیز کا کوئی تصور تھا۔ اس لئے وہ اگر آسمانوں کی بابت کوئی نشانی دریافت کرتے اور حضور ﷺ انہیں بتا دیتے تو ان کے خالی الذہن ہونے کی وجہ سے حضور ﷺ کا بتانا ان کے حق میں بے فائدہ رہتا اور واقعہ معراج کی تصدیق کے لئے کوئی دلیل قائم نہ ہوتی۔

☆ اس حکمت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے آسمانی معراج کا ذکر تفصیل کے ساتھ نہیں فرمایا بلکہ ''لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا'' میں اجمال کے ساتھ اسے بیان فرما دیا تاکہ مسجد اقصیٰ کی طرف حضور کا لے جانا ان کو آسمانوں پر لے جا کر وہاں کی آیات دکھانے پر دلیل قائم ہو جائے۔ خلاصۃ الکلام یہ کہ آیۂ کریمہ میں اسراء کا بیان مفصل ہے اور معراج کا ذکر مجمل اور مفصل مجمل کی دلیل ہے آیۂ کریمہ میں حضور ﷺ کے اس تمام سفر مبارک کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ اس کے تین مرحلے الگ الگ نظر آتے ہیں۔

☆ پہلا مرحلہ مسجد حرام سے شروع ہو کر مسجد اقصیٰ پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے مرحلے کا بیان ''لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا'' میں وارد ہے اور تیسرے مرحلہ کا بیان ''اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ'' میں موجود ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ مسجد حرام سے چل کر مسجد اقصیٰ پہنچے اور مسجد اقصیٰ سے آسمانوں پر جلوہ گر ہوتے ہوئے عرشِ الٰہی تک تشریف لے گئے۔ پھر عرشِ الٰہی سے ''اِلٰى حَيْثُ شَآءَ اللّٰهُ'' (جہاں تک اللہ نے چاہا) جلوہ افگن ہوئے اور زمان و مکان بلکہ عالم امکان کی قیود سے بالاتر ہو کر اللہ تعالیٰ کے قرب خاص سے مشرف ہوئے اور اپنے رب کا جمال اپنے سر اقدس کی آنکھوں سے بے حجاب دیکھا۔

☆ سُبْحٰنَ الَّذِیْ سے لے کر اَلَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ تک اسریٰ کا تفصیلی بیان ہے اور لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا میں تمام آسمانی سفر کا اجمالی ذکر ہے اور اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ میں اللہ تعالیٰ کے قرب خاص میں اس کا کلام سننے اور جمال دیکھنے کا بیان ہے۔

مراحل ثلاثہ میں باریک اور لطیف فرق

☆ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک دنیائے جسمانیات اور عالم شہادت ہے اور مسجد اقصیٰ سے اوپر آسمانوں اور عرش کا عالم روحانی، نورانی اور مجرد لطیف کائنات ہے۔ اس کے بعد فوق العرش اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قدس ہے۔ جس میں کسی کائن و مخلوق کا شائبہ تک متصور نہیں

بلکہ زمان ومکان سے بالاتر، اللہ تعالیٰ کے جلوہ ہائے عظمت وجلال کے ظہور کا وہ عالم ہے جسے عالم کہنا بھی صرف مجاز ہے۔ حقیقت میں وہ عالم وعالمیات سے کہیں اعلیٰ اور برتر ہے کیونکہ زمان ومکان کی حدود میں جمال الوہیت کا ظہور اتم مقید نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کا تینوں مرحلوں سے تعلق

☆ ان تینوں مرحلوں سے حضور نبی کریم کی ذات گرامی کا ربط اور تعلق یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تین شانیں ہیں

(۱) بشریت: جس کو عالم جسمانیت سے ربط ہے۔

(۲) ملکیت اور روحانیت: جسے عالم انوار اور حقائق مجردات قدسیہ سے تعلق ہے۔

(۳) محمدیت: یعنی حق تعالیٰ کی ذات وصفات اور حسن وجمال کا مظہر اتم ہونا، جسے بارگاہِ قدس اور حضرت جمال الوہیت سے گہرا تعلق ہے۔

☆ سفر معراج کے تینوں مرحلوں اور حضور نبی کریم ﷺ کی تینوں شانوں کا تعلق اور باہمی مناسبت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آیت کریمہ کی روشنی میں فلسفۂ معراج نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ معراج کا مقصد حضور سید عالم ﷺ کا اپنی شایانِ شان بلند اور اونچے مراتب تک پہنچنا ہے۔ چونکہ حضور ﷺ کی یہ مذکورہ شانیں ایسی ہیں کہ تمام کمالاتِ محمدی ان ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ہر کمالِ مصطفوی کا سرچشمہ یہی تین شانیں ہیں۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک کا اپنے عروج پر پہنچنا تکمیل معراج کے لئے ضروری ہوا۔ حضور ﷺ کی بشریت، نورانیت ومظہریت سب کا عروج ضروری ہوا۔ یہ امر واضح رہے کہ ہر چیز کا عروج اسی عالم میں متصور ہے جس سے اس چیز کا تعلق پایا جاتا ہے۔ اس لئے بشریت کا معراج عالم بشریت میں ہوگا اور نورانیت اور روحانیت کا معراج عالم ارواح وعالم انوار میں اور اسی طرح حقیقت محمدیہ یعنی مظہریت حق کا معراج بارگاہِ حق تعالیٰ میں ہوگا۔

☆ آیت کریمہ کے مضمون میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی معراج مبارک بالکل اسی شان سے واقع ہوئی۔ دیکھئے حضور ﷺ مسجد حرام سے چل کر مسجد اقصیٰ پہنچے جہاں تمام انبیاء علیہم السلام نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اقتداء کی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سب کے امام بنے۔ مسجد اقصیٰ عالم اجسام میں ہے اور اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت مطہرہ کو یہ عروج حاصل ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت مقدسہ کے پیچھے اقتدا کی۔ بشریت مصطفویہ کا مسجد اقصیٰ میں انبیاء علیہم السلام کا مقتدا ہونا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت کا معراج ہے۔ اسی حیثیت سے کہ عالم بشریت میں انسانیت اور بشریت کا کمال رکھنے والے یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام پیچھے ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت آگے ہے۔ اس کے بعد جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مسجد اقصیٰ سے آسمانوں پر تشریف لے گئے اور ساتوں آسمانوں سے گزر کر سدرۃ المنتہیٰ پہنچے۔ یہ تو وہ مقام ہے کہ جہاں سے اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے فرشتے بھی آگے نہیں جا سکتے۔ آسمان اول سے لے کر سدرہ تک تمام روحانی اور نورانی افراد یعنی ملائکہ کرام پیچھے رہ گئے۔ حتیٰ کہ جبریل علیہ السلام بھی وہاں سے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن حضور ﷺ سب کو پیچھے چھوڑ کر سدرۃ المنتہیٰ سے آگے تشریف لے گئے اور حضور ﷺ کا سدرہ سے آگے تشریف لے جانا حضور ﷺ کی حقیقت ملکیہ اور آپ کی نورانیت وروحانیت کا

چمکتا ہوا معراج تھا۔ اس حیثیت سے کہ عالم ملائکہ میں حضور ﷺ کی نورانیت وروحانیت درحقیقت ملکیت کی معراج ہے۔

☆ پھر آقائے نامدار ﷺ کا بلند زمان ومکان کی قیود سے بالا ہو کر فوق العرش پہنچ کر بارگاہِ حق تعالیٰ جل مجدہٗ میں حاضر ہونا اور ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کے مراتب عالیہ پر فائز ہونا اور سر اقدس کی آنکھوں سے بے حجاب اللہ تعالیٰ کو دیکھنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حقیقت محمدیہ اور صورت حقیہ کی معراج ہے۔ اس حیثیت سے کہ وہ عرشِ عظیم جو تجلیات حسن حقیقی کی بلند ترین جلوہ گاہ ہے اسی طرح پیچھے رہ گیا جس طرح مسجد اقصیٰ میں کمال انسانیت رکھنے والے انبیاء علیہم السلام پیچھے رہ گئے اور سدرۃ المنتہیٰ پر کمال ملکیت ونورانیت رکھنے والے ملائکہ مقربین پیچھے رہ گئے تھے اور حضور ﷺ ان سے آگے تشریف لے گئے تھے۔ بالکل اسی طرح حسن الوہیت کی بلند ترین جلوہ گاہ عرشِ عظیم بھی پیچھے رہ گیا اور حضور ﷺ زمان ومکان اور تحت وفوق کو پیچھے چھوڑ کر ایسے عالم میں جسے عالم کہنا درحقیقت مجاز ہے اپنی حقیقت محمدیہ اور صورت حقیہ کے ساتھ اس عرشِ عظیم کی بلندی سے بلند ہو کر اس ذات والا صفات کے ساتھ واصل ہوئے جس کے حسن ذات وصفات کا مظہر اتم تھے۔ اس کا کلام سنا اور اس کا جمال دیکھا نہ ان کی بات سننے اور اسے دیکھنے والا ان کے سوا کوئی دوسرا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام رب کے سمیع وبصیر تھے اور رب کریم حضور ﷺ کا سمیع وبصیر تھا۔

☆ فوائد الفواد ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی دہلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک حوالہ تو اس سے قبل عرض کر چکا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مسجد حرام سے بیت المقدس تک اسراء ہے اور وہاں سے آسمانوں تک معراج اور آسمانوں سے قاب قوسین تک اعراج ہے۔ یہ ملفوظ مبارک بھی فقیر کے بیان سابق پر بلا تاویل واضح اور روشن دلالت کر رہا ہے۔ دوسرے حوالہ کی فارسی عبارت کا اردو خلاصہ حسب ذیل ہے

☆ کسی خادم نے عرض کیا، حضور! لوگ کہتے ہیں کہ قلب کو بھی معراج ہوئی ہوگی اور قالب کو بھی اور روح کو بھی۔ ہر ایک کو کس طرح معراج ہوئی ہوگی؟ حضور خواجہ غریب نواز نے جواب میں یہ مصرع پڑھا "تظن خیرا ولا تسئل عن الخیر"
یعنی "گمان خیر رکھ اور خیر کی بابت تحقیق نہ کر۔" (فوائد الفواد جلد ۴ صفحہ ۲۰۸)

☆ مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ اور رسول ﷺ کے مابین راز ہے جس کو مان لو اور اس کی ماہیت وکیفیت کے پیچھے نہ پڑو۔ اس مضمون سے بھی فقیر کے بیان پر اس طرح روشنی پڑتی ہے کہ

☆ قالب بشریت ہے روح ملکیت اور قلب مظہریت حق۔ تینوں کو معراج ہوئی۔ یہ اجمال ہے۔ اس کی تفصیل وہ تھی جو فقیر وضاحت کے ساتھ بیان کر چکا ہے۔

☆ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی بشریت ملکیت اور مظہریت تینوں کو معراج کرائی۔

☆ بشریت اس عالم کی چیز ہے اس کی معراج یہاں یعنی مسجد اقصیٰ میں ہوئی۔ ملکیت ونورانیت عالم سمٰوٰت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی معراج آسمانوں پر ہوئی۔ مظہریت حقیہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے متعلق ہے۔ اس لئے اس کی معراج فوق العرش لامکان

میں ہوئی۔ جہاں اللہ تعالیٰ کا دیدار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہوا۔ بشریت کی معراج اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی میں تفصیلاً مذکور ہے اور آسمانی معراج لِنُرِیَہٗ میں اجمالاً مذکور ہے اور معراج فوق العرش قرب ایزدی و دیدار الٰہی کا ذکر اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ میں ہے۔

☆ معلوم ہوا کہ سفر معراج کے تین حصے صرف اس لئے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کی تین صفتیں ہیں۔ ہر صفت کی معراج کا مستقل ذکر ہے۔ ہمارے اس بیان سے کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت کو جب معراج ہوئی تھی تو اس وقت روح مبارک نہ تھی یا جس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حقیقت ملکیہ کی معراج آسمانوں پر ہوئی تو اس وقت جسمانیت مطہرہ ساتھ نہ تھی۔ اسی طرح جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مظہریت مطہرہ کو معراج ہوئی تھی تو روح اقدس یا جسم مبارک اس وقت موجود نہ تھا۔ اس لئے کہ حضور ﷺ ان تمام مراحل میں جسم اقدس اور روح مبارک کے ساتھ جلوہ گر تھے۔ جب مسجد اقصیٰ تشریف لے گئے تو جسم اقدس کے ساتھ روح مبارک بھی تھی اور جب مسجد اقصیٰ سے آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ پر تشریف لے گئے تو اس وقت بھی روح مبارک بدن اقدس میں جلوہ گر تھی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس عالم ناسوت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت مطہرہ بالفعل تھی اور ملکیت مقدسہ بالقوۃ۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جسم و روح اقدس کے ساتھ عالم ملائکہ میں پہنچے تو اس وقت حضور ﷺ کی بشریت بالقوۃ اور ملکیت بالفعل ہو گئی تھی اور جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مقام دَنٰی فَتَدَلّٰی پر جلوہ گر ہوئے تو بشریت و ملکیت دونوں بالقوۃ ہو گئیں اور کمال مظہریت قوت سے فعل کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ آدمی جب کسی پر غضب ناک ہوتا ہے تو اس میں رحم کی صفت موجود ہوتی ہے۔ بولنے کے وقت خاموش ہونے کی اور خاموشی کے وقت بولنے کی طاقت انسان میں موجود ہوتی ہے۔ حرکت کے وقت سکون کی اور سکون کے وقت حرکت کی قوت انسان میں پائی جاتی ہے۔

☆ اسی طرح بشریت کے معراج کے وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملکیت و مظہریت موجود تھی اور حقیقت ملکیہ کے وقت بشریت اور مظہریت دونوں صفتیں بحال تھیں۔ پھر حقیقت مظہریت کی معراج ہوئی تو بشریت اور ملکیت دونوں بدستور تھیں۔ ان تینوں میں سے ہر ایک کی معراج کے وقت اسی حقیقت کا غلبہ تھا۔ مسجد اقصیٰ میں بشریت اور آسمانوں میں ملکیت و روحانیت اور عرش پر حقیقت مظہریت کو اللہ تعالیٰ نے غالب فرما دیا تھا۔

حدیث معراج

(بنظر اختصار صرف ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے)

☆ انس بن مالک حضرت مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے صحابہ کرام سے اس رات کی کیفیت بیان فرمائی جس میں آپ کو معراج ہوئی تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ میں حطیم کعبہ میں تھا۔ یکا یک میرے پاس ایک آنے والا آیا اور اس نے میرا سینہ یہاں سے لے کر یہاں تک چاک کیا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے جارود سے پوچھا وہ میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے کہ یہاں سے یہاں تک کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے بتایا کہ حلقوم شریف سے لے کر ناف مبارک

تک۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ پھر اس آنے والے نے میرا سینہ چاک کرنے کے بعد میرا دل نکالا۔ پھر میرے پاس سونے کا ایک طشت لایا گیا جو ایمان وحکمت سے لبریز تھا اس کے بعد میرا دل دھویا گیا پھر وہ ایمان وحکمت سے لبریز ہوگیا۔ اس قلب کو سینۂ اقدس میں اس کی جگہ پر رکھا گیا۔ اس کے بعد میرے پاس ایک جانور سوار ہونے کے لئے لایا گیا جو خچر سے نیچا اور گدھے سے اونچا تھا۔ (جارود نے حضرت انس سے پوچھا کہ اے ابوحمزہ کیا وہ براق تھا؟ حضرت انس نے فرمایا، ہاں!) وہ اپنا قدم منتہائے نظر پر رکھتا تھا۔ میں اس پر سوار ہوا پھر جبریل مجھے لے کر چلے۔ یہاں تک کہ ہم آسمان دنیا پر پہنچے (ا) تو جبریل علیہ السلام نے اس کا دروازہ کھلوایا، پوچھا گیا، کون ہے؟ انہوں نے کہا، جبریل ہے۔ پھر آسمان کے فرشتوں نے پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا، محمد ﷺ۔ پوچھا گیا وہ بلائے گئے ہیں؟ جبریل علیہ السلام نے جواب دیا کہ ہاں۔ کہا گیا انہیں خوش آمدید ہو۔ ان کا آنا بہت اچھا اور مبارک ہے۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو آدم علیہ السلام ملے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یہ آپ کے باپ آدم علیہ السلام ہیں۔ آپ انہیں سلام کیجئے۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا خوش آمدید ہو۔ صالح بیٹے اور صالح نبی کو۔ پھر جبریل علیہ السلام (میرے ہمراہ) اوپر چڑھے۔ یہاں تک کہ دوسرے آسمان پر پہنچے اور انہوں نے اس کا دروازہ کھلوایا۔ پوچھا گیا کون؟ انہوں نے کہا جبریل۔ دریافت کیا گیا تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا محمد ﷺ۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ بلائے گئے ہیں؟ جبریل علیہ السلام نے کہا، ہاں۔ اس (دوسرے آسمان کے دربان) نے کہا، خوش آمدید ہو۔ ان کا آنا بہت اچھا اور مبارک ہے۔ یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ پھر جب وہاں پہنچا تو وہاں یحیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام ملے۔ وہ دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے کہا یہ یحیٰ اور عیسیٰ ہیں آپ انہیں سلام کیجئے۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ ان دونوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا خوش آمدید ہو اخ صالح اور نبی صالح کو۔ پھر جبریل مجھے تیسرے آسمان پر لے گئے اور اس کا دروازہ کھلوایا پوچھا گیا کون؟ انہوں نے کہا جبریل۔ دریافت کیا گیا تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے بتایا کہ محمد ﷺ۔ پھر دریافت کیا گیا وہ بلائے گئے ہیں؟ جبریل علیہ السلام نے کہا، ہاں۔ اس کے جواب میں کہا گیا، انہیں خوش آمدید ہو۔ ان کا آنا بہت ہی اچھا اور نہایت مبارک ہے اور دروازہ کھول دیا گیا۔ پھر جب میں وہاں پہنچا تو یوسف علیہ السلام ملے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا، یہ یوسف ہیں، انہیں سلام کیجئے۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ خوش آمدید ہو اخ صالح نبی صالح کو۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام چوتھے آسمان پر مجھے لے گئے اور اس کا دروازہ کھلوایا۔ پوچھا گیا کون؟ انہوں نے کہا، جبریل۔ پھر دریافت کیا گیا تمہارے ہمراہ کون ہے؟ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ محمد ﷺ۔ پھر پوچھا گیا کیا وہ بلائے گئے ہیں؟ انہوں نے کہا، ہاں۔ چوتھے آسمان کے دربان نے کہا کہ انہیں خوش آمدید ہو۔ ان کا آنا بہت ہی اچھا اور نہایت مبارک ہے اور دروازہ کھول دیا گیا۔ پھر جب میں وہاں پہنچا تو ادریس علیہ السلام ملے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا یہ ادریس ہیں۔ انہیں سلام کیجئے۔ میں نے انہیں سلا کیا انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد کہا خوش آمدید ہو اخ صالح اور نبی صالح کو۔ پھر جبریل علیہ السلام مجھے ساتھ لے کر اوپر چڑھے یہاں تک کہ پانچویں آسمان پر پہنچے اور انہوں

نے اس کا دروازہ کھلوایا۔ پوچھا گیا کون؟ انہوں نے کہا جبریل۔ دریافت کیا گیا تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا، محمد ﷺ۔ پوچھا گیا کیا وہ بلائے گئے ہیں؟ انہوں ے کہا، ہاں۔ پانچویں آسمان کے دربان نے کہا، انہیں خوش آمدید ہو۔ ان کا آنا بہت ہی اچھا اور مبارک ہے۔ پھر جب میں وہاں پہنچا تو ہارون علیہ السلام ملے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا، یہ ہارون ہیں۔ انہیں سلام کیجئے۔ میں نے ان کو سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ پھر کہا، خوش آمدید ہو اخ صالح اور نبی صالح کو۔ پھر جبریل علیہ السلام مجھے اوپر چڑھا لے گئے۔ یہاں تک کہ ہم چھٹے آسمان پر پہنچے۔ جبریل علیہ السلام نے اس کا دروازہ کھلوایا۔ پوچھا گیا کون؟ انہوں نے کہا جبریل۔ دریافت کیا گیا تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے محمد ﷺ۔ پوچھا گیا کیا وہ بلائے گئے ہیں؟ انہوں نے کہا، ہاں۔ اس فرشتے نے کہا انہیں خوش آمدید ہو۔ ان کا آنا بہت ہی اچھا اور مبارک ہے۔ میں وہاں پہنچا تو موسیٰ علیہ السلام ملے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا، یہ موسیٰ ہیں۔ انہیں سلام کیجئے۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا خوش آمدید ہو اخ صالح اور نبی صالح کو۔ پھر جب میں آگے بڑھا تو وہ روئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کیوں روتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا میں اس لئے روتا ہوں کہ میرے بعد ایک مقدس لڑکا مبعوث کیا گیا جس کی امت کے لوگ میری امت سے زیادہ جنت میں داخل ہوں گے۔ پھر جبریل علیہ السلام مجھے ساتویں آسمان پر چڑھا لے گئے اور اس کا دروازہ کھلوایا۔ پوچھا گیا کون ہے؟ انہوں نے کہا جبریل۔ پوچھا گیا تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا، محمد ﷺ۔ پوچھا گیا کیا وہ بلائے گئے ہیں؟ انہوں نے کہا، ہاں۔ تو اس فرشتے نے کہا، انہیں خوش آمدید ہو۔ ان کا آنا بہت اچھا اور مبارک ہے۔ پھر جب میں وہاں پہنچا تو ابراہیم علیہ السلام ملے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا، یہ آپ کے باپ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ انہیں سلام کیجئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا کہ خوش آمدید ہو ابن صالح اور نبی صالح کو۔ پھر میں (۱) سدرۃ المنتہیٰ تک چڑھایا گیا تو اس درخت سدرۃ کے پھل مقام ہجر کے مٹکوں کی طرح تھے اور پتے ہاتھی کے کانوں جیسے تھے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا، یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے اور وہاں چار نہریں تھیں۔ دو پوشیدہ اور دو ظاہر۔ میں نے پوچھا، اے جبریل! یہ نہریں کیسی ہیں؟ انہوں نے کہا، ان میں جو پوشیدہ ہیں، وہ تو جنت کی نہریں ہیں اور جو ظاہر ہیں وہ نیل وفرات ہیں۔ پھر بیت المعمور میرے سامنے ظاہر کیا گیا۔ اس کے بعد مجھے ایک برتن شراب کا اور ایک دودھ کا اور ایک برتن شہد کا دیا گیا۔ میں دودھ کو لے لیا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا یہی فطرت (دین اسلام) ہے۔ آپ اور آپ کی امت اس پر قائم رہیں گے۔ اس کے بعد مجھ پر ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ جب میں واپس لوٹا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہ آپ کی امت پچاس نمازیں روزانہ نہ پڑھ سکے گی۔ خدا کی قسم! میں آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کر چکا ہوں اور بنی اسرائیل کے ساتھ میں نے سخت برتاؤ کیا ہے۔ لہٰذا آپ اپنے رب کے پاس لوٹ جایئے اور اپنی امت کے لئے تخفیف کی درخواست کیجئے۔ چنانچہ میں لوٹا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے دس نماز معاف کر دیں۔ پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے پھر اسی طرح کہا۔ میں پھر خدا کے پاس واپس گیا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے دس نمازیں پھر معاف کر دیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا انہوں نے پھر اسی طرح کہا۔ میں پھر خدا کے پاس واپس گیا تو مجھے ہر روز پانچ نمازوں

کا حکم دیا گیا۔ پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس لوٹ کر آیا تو انہوں نے پوچھا کہ آپ کو کیا حکم ملا؟ میں نے کہا روزانہ پانچ نمازوں کا حکم ملا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کی امت پانچ نمازیں بھی نہ پڑھ سکے گی۔ میں نے آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل سے سخت برتاؤ کر چکا ہوں۔ لہٰذا آپ پھر اپنے رب کی بارگاہ میں جایئے اور اپنی امت کے لئے تخفیف کی درخواست کیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب تعالیٰ سے کئی مرتبہ درخواست کی، مجھے شرم آتی ہے۔ لہٰذا اب میں راضی ہوں اور اپنے رب کے حکم کو تسلیم کرتا ہوں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ میں آگے بڑھا۔ ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ میں نے اپنا حکم جاری کر دیا اور اپنے بندوں سے تخفیف فرمادی۔ (بخاری شریف جلد اول ص ۵۴۸)

☆ بخاری شریف کی ایک دوسری روایت میں سدرۃ المنتہیٰ کے بعد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایسا قرب مذکور ہے جسے قاب قوسین او ادنیٰ سے تعبیر فرمایا گیا۔ حدیث شریف کے الفاظ حسب ذیل ہیں

حتی جاء سدرۃ المنتہٰی ودنا الجبار رب العزۃ فتدلّٰی حتّٰی کان منه قاب قوسین او ادنٰی (بخاری شریف جلد ثانی ص ۱۱۲۰)

☆ یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے قریب ہوا پھر اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے یا حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے اس سے بھی زیادہ قرب طلب فرمایا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے دو کمانوں کی مقدار یا اس سے بھی زیادہ قریب ہو گیا (عینی جلد ۲۵ ص ۱۷۰) اور اللہ تعالیٰ کا جمال مبارک سر اقدس کی آنکھوں سے دیکھا۔ (فتح الباری جلد ۱۳ ص ۴۱۷ عینی نبراس، شرح عقائد)

☆ آسمانی معراج کہاں تک ہوئی؟ اس میں علماء اہل سنت کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ اور جنت الماویٰ تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے گئے۔ بعض نے کہا، عرش تک حضور ﷺ کو معراج ہوئی اور ایک قول ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فوق العرش تشریف لے گئے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ حضور ﷺ طرف عالم تک تشریف لے گئے یعنی عالم اجسام کی وہ انتہا جس کے پیچھے کچھ نہیں۔ نہ ہوا نہ زمان و مکان، بلکہ عدم محض ہے۔ (شرح عقائد نفسی نبراس)

☆ اسراء یعنی مسجد حرام سے بیت المقدس تک تشریف لے جانا قطعی اور یقینی ہے جس کا منکر مسلمان نہیں اور زمین سے آسمان کی طرف معراج ہونا احادیث مشہورہ سے ثابت ہے۔ اس کا منکر فاسق اور ضال و مضل ہے۔ پھر آسمانوں سے جنت کی طرف اور عرش یا عرش کے علاوہ فوق العرش تک یا لامکاں تک اخبار احاد سے ثابت ہے۔ جس کا منکر سخت آثم اور گنہگار ہے۔ (شرح عقائد نبراس ص ۴۷۴)

ولذا اختلف فی الانتهاء فقیل الی الجنة وقیل الی العرش وقیل الٰی مافوقه وهو مقام دنٰی فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنٰی (شرح فقه اکبر ص ۱۳۶)

ترجمہ: اسی وجہ سے اختلاف ہوا کہ معراج کہاں تک ہوئی۔ ایک قول ہے عرش تک اور ایک قول میں وارد ہے کہ فوق العرش حضور ﷺ تشریف لے گئے اور وہ مقام ہے۔

دنا فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنٰی (وجاوز السبع الطباق) وهی السمٰوٰت (او جاوز سدرۃ المنتهٰی ووصل الٰی محل من القرب سبق به الاولین والاٰخرین) اذ لم یصل الیه نبی مرسل ولا ملك مقرب۔ (زرقانی جلد ۶، ص ۱۰۱)

ترجمہ: حضور علیہ السلام شب معراج ساتوں آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ سے گزر گئے اور ایسے مقام قرب تک پہنچے کہ اولین وآخرین سب پر سبقت لے گئے کیونکہ جہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پہنچے وہاں نہ کوئی نبی پہنچا نہ رسول نہ کوئی مقرب فرشتہ۔

(ودنو الرب تبارك وتعالٰی وتدلیه علٰی مافی حدیث شریك) عن انس (كان فوق العرش لا الی الارض) (زرقانی جلد ۶ ص ۹۹)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کا (اپنے حبیب علیہ السلام) قریب ہونا اور زیادتی قرب کا طلب فرمانا عرش کے اوپر تھا زمین پر نہیں تھا۔

قائلین معراج منامی کے شبہات اور ان کا جواب

☆ جو لوگ معراج جسمانی کے منکر اور منامی کے قائل ہیں، ان کے شبہات مع جوابات حسب ذیل ہیں

پہلا شبہ: اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے "وما جعلنا الرؤیا التی اریناك الا فتنة للناس" اور نہیں کیا ہم نے اس رؤیا کو جو آپ کو دکھائی (اے محبوب علیہ السلام) لیکن آزمائش لوگوں کے لئے۔ بعض مفسرین نے اس آیہ کریمہ کو معراج پر محمول کیا ہے لہٰذا معراج منامی ہوئی کیونکہ "رؤیا" عربی زبان میں خواب کو کہتے ہیں۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت نے حدیبیہ یا بدر کی رؤیا پر حمل فرمایا ہے۔ اس لئے کہ اس کو واقعہ معراج پر محمول کرنا حتمی اور یقینی امر نہ رہا۔ علاوہ ازیں لفظ رؤیا رویت بصری کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ خصوصاً رات میں جسمانی آنکھ سے دیکھنے کے معنیٰ میں یہ لفظ اکثر استعمال ہوا ہے۔ دیکھئے دیوان متنبی میں ہے

مضی اللیل والفضل الذی لك لایمضی ورؤیاك احلٰی فی العیون من الغمض (دیوان متنبی ص ۱۸۸ قافیة الضاد)

ترجمہ: رات ختم ہوگئی اور تیرا فضل ختم ہونے والا نہیں اور تیرا دیدار جمال آنکھوں میں نیند سے زیادہ میٹھا ہے۔

☆ اس شعر میں لفظ "رؤیا" رویت بصری کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ علاوہ ازیں اسی آیت کی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے

هی رؤیا عین اریها رسول الله ﷺ لیلة اسری به الی بیت المقدس (بخاری شریف جلد اول ص ۵۵۰)

☆ کرمانی نے اس حدیث پر کہا "رؤیا عین"

قید به للاشعار بان رؤیا بمعنی الرؤیة فی الیقظة لا رؤیا النائم۔ (ك حاشیه ص ۵)

ترجمہ: رؤیا کو عین کے ساتھ یہ ظاہر کرنے کے لئے مقید فرمایا کہ لفظ "رؤیا" یہاں بحالت بیداری دیکھنے کے معنیٰ میں ہے۔ سونے والے کی خواب کے معنیٰ میں نہیں۔

دوسرا شبہ: بخاری شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث وارد ہے۔ جس میں حضرت انس نے تمام واقعہ معراج بیان کرنے کے بعد فرمایا فاستیقظ وهو فی المسجد الحرام یعنی حضور بیدار ہوئے تو آپ مسجد حرام میں تھے۔ بعض روایات میں بینا انا نائم وارد ہے۔ بعض احادیث میں وهو نائم فی المسجد الحرام آیا ہے۔ ایک دوسری روایت میں بینا انا عند البیت بین النائم والیقظان ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو بحالت خواب معراج ہوئی۔

☆ اس کا جواب امام ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اور امام بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں دیا ہے۔ ہم اسے نقل کیے دیتے ہیں۔ امام ابن حجر عسقلانی فاستیقظ وھو بالمسجد الحرام کے تحت فرماتے ہیں

واقله قوله فاستیقظ وھو عند المسجد الحرام فان حمل علی ظاھرہ جاز ان یکون نام بعد ان ھبط من السماء فاستیقظ وھو عند المسجد الحرام وجاز ان یوول قوله استیقظ ای افاق مما کان فیه فانه کان اذا اوحی الیه یستغرق فیه فاذا انتھی رجع الی حالته الاولی فکنی عنه بالاستیقاظ انتھی (فتح الباری جلد ۱۳ ص ٤١٠)

ترجمہ: اس کا قائل، راوی کا یہ قول ہے کہ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بیدار ہوئے تو آپ مسجد حرام میں تھے۔ اس قول کو ظاہر پر بھی حمل کرنا جائز ہے اور اس کی تاویل بھی کی جاسکتی ہے۔ ظاہر پر عمل کریں تو یہ کہیں گے کہ حضور ﷺ آسمان سے واپس تشریف لا کر مسجد حرام میں سو گئے۔ پھر جب آپ بیدار ہوئے تو مسجد حرام ہی میں تھے اور اگر تاویل کریں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضور ﷺ کو جب معراج کے حال سے افاقہ ہوا تو آپ مسجد حرام میں تھے کیونکہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وحی ہوتی تھی تو آپ اس میں مستغرق ہو جاتے تھے۔ جب وحی ختم ہوتی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حالت استغراق سے افاقہ ہو جاتا تھا۔ بالکل یہی کیفیت معراج کے وقت ہوئی کہ جب تک حضور ﷺ معراج میں رہے حضور ﷺ پر وہ استغراق کا حال جاری رہا۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مسجد حرام میں واپس تشریف لائے تو وہ حالت زائل ہوگئی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پہلی حالت کی طرف لوٹ آئے۔ راوی نے "استیقظ" کہہ کر اسی سے کنایہ کیا ہے۔ (فتح الباری جلد ۱۳ ص ۴۱۰)

☆ امام ابن حجر نے آگے چل کر اسی بارہ میں امام قرطبی کا قول نقل کیا ہے جس کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ بیدار ہونا اس نیند سے ہے جو معراج سے واپس تشریف لا کر حضور ﷺ نے فرمائی تھی۔ کیونکہ معراج تمام رات نہیں ہوئی وہ تو بہت ہی قلیل ترین وقت میں واقع ہوئی تھی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام معراج سے واپس تشریف لا کر مسجد حرام میں سو گئے۔ صبح اٹھے تو مسجد حرام ہی میں جلوہ گر تھے۔

☆ نیز احتمال ہے کہ استیقاظ بمعنی افاقہ ہو۔ کیونکہ ملاءِ اعلیٰ اور آیات کبریٰ کے مشاہدہ کا حال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایسا غالب تھا کہ بشریت اور عالم اجسام کی طرف سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بالکل غیر متوجہ ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ مسجد حرام میں پہنچنے تک یہی حال رہا۔ جب مسجد حرام میں جلوہ گر ہوئے تو حال بشریت کی طرف رجوع فرمایا اور حالت سابقہ سے افاقہ ہوا۔ اس افاقہ کو راوی نے استیقظ سے تعبیر کیا اور کہا کہ حضور ﷺ کو ملاءِ اعلیٰ اور آیات کبریٰ کے حال سے افاقہ ہوا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مسجد حرام میں تھے اور حضور ﷺ کا قول مبارک کہ میں سویا ہوا تھا تو اس سے شب معراج میں جبریل علیہ السلام کے آنے سے پہلے خواب استراحت فرمانا ہے کیونکہ حضور ﷺ جبریل علیہ السلام کے آنے سے پہلے سو رہے تھے۔ جبریل علیہ السلام نے آکر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جگایا۔ ایک اور روایت میں حضور ﷺ کا قول مبارک آیا ہے کہ انا بین النائم و الیقظان اتانی الملک میں سونے جاگنے کے درمیان تھا کہ میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معراج کرنے کے لئے جس وقت جبریل

علیہ السلام حاضر ہوئے تو اس وقت حضور علیہ السلام کی نیند مبارک ایسی ہلکی اور خفیف تھی کہ جسے سونے اور جاگنے کی درمیانی حالت سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ جب جبریل علیہ السلام آئے تو انہوں نے اس خفیف نیند سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بیدار کیا اور اس کے بعد بیداری میں حضور علیہ معراج پر تشریف لے گئے۔ (فتح الباری جلد ۱۳ ص ۴۱۷ مطبوعہ مصر و عمدۃ القاری جلد ۲۵ ص ۱۷۳ مطبوعہ مصر طبع جدید)

☆ لہٰذا ثابت ہوا کہ تینوں میں سے ایک روایت بھی معراج منامی کی دلیل نہیں اور منکرین کا شبہ بالکل بے بنیاد ہے۔ وللہ الحمد

تیسرا شبہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں

ما فقدت جسد رسول اللہ ﷺ لیلۃ المعراج

ترجمہ: معراج کی رات میں نے رسول اللہ ﷺ کا جسم مبارک گم نہیں پایا۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کو معراج بعثت کے ایک یا ڈیڑھ سال یا پانچ سال بعد اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ہوئی ہے۔ ان اقوال کے بموجب معراج مبارک ہجرت سے آٹھ سال یا ساڑھے گیارہ سال یا بارہ سال پہلے ہوئی اور حضرت عائشہ صدیقہ کی شادی مبارک ہجرت کے بعد ہوئی۔ جب کہ حضرت عائشہ صدیقہ کی عمر شریف ۹ برس تھی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں بر بنائے بعض اقوال معراج کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں اور اگر ان کی پیدائش مان بھی لی جائے تو بہر نوع حضور ﷺ کے پاس ان کا پایا جانا ہجرت کے بعد ہی ہے۔ پھر ان کا یہ فرمانا کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جسم مبارک معراج کی رات گم نہیں پایا کیونکر متصور ہو سکتا ہے؟ رہا یہ شبہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ان الفاظ سے بھی مروی ہے

ما فقد جسد رسول اللہ ﷺ لیلۃ المعراج

☆ تو اس کا جواب یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک یہ روایت بلا شبہ غیر ثابت اور مبنی بر خطا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ما فقدت اور فقد دونوں روایتیں از روئے درایت و روایت صحیح نہیں اس لئے اس سے معارضہ کرنا باطل ہے۔

☆ اور اگر بر تقدیر تسلیم اس حدیث کے یہ معنی مراد لئے جائیں کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا معراج مبارک کی سرعت اور اس کی قلیل ترین وقت میں ہونے کو بیان فرما رہی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا آنا جانا اس قدر تیزی اور سرعت کے ساتھ واقع ہوا کہ گویا جسم مبارک گم ہونے ہی نہیں پایا تو یہ معنی دیگر روایات کے مطابق صحیح قرار پائیں گے۔

چوتھا شبہ: یہ ہے کہ آیت قرآنیہ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى سے بھی سمجھا جاتا ہے کہ معراج خواب میں ہوئی۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں کوئی لفظ ایسا نہیں کہ جس کا ترجمہ نیند اور خواب میں کیا جائے۔ آیت کے معنی ہیں کہ حضور ﷺ کے قلب مبارک نے اس چیز کی تکذیب نہیں کی جسے چشم مبارک نے دیکھا۔ یعنی معراج کی رات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی چشم اقدس سے جو کچھ دیکھا اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کسی قسم کا وہم یا اشتباہ واقع نہیں ہوا اور اس کی دلیل یہ آیت ہے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (نہ کج ہوئی نگاہ نہ بہکی) لفظ بصر جسمانی نگاہ کے لئے آتا ہے۔ خواب میں دیکھنے کو بصر نہیں کہتے۔ الحمد للہ!

قائلین معراج منامی کے تمام شبہات کا ازالہ ہو گیا۔

نیچری اور مسئلہ معراج

☆ معراج کا واقعہ در حقیقت ایمان کے لئے کسوٹی کا حکم رکھتا ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، علم وقدرت، عظمت وحکمت پر کامل ایمان رکھتا ہے اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت، صداقت وکمالات کی دل سے تصدیق کرتا ہے وہ واقعہ معراج یا اسی قسم کے خرق عادات امور کا کبھی انکار نہیں کر سکتا۔ جب کہ قرآن وحدیث میں اس کا صاف اور واضح بیان بھی موجود ہے اور عہد رسالت سے لے کر ہر دور کے جمہور مسلمان اس کو بلا تاویل تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔

☆ رہے وہ شکوک وشبہات جنہیں فلاسفہ کی اتباع میں نیچری پیش کیا کرتے ہیں کہ جسم طبعی مادی مرکب من العناصر کا عناصر کی حدود سے تجاوز کرنا اور آسمانوں پر صعود کرنا محال ہے۔ نیز آسمانوں میں خرق والتیام بھی ناممکن ہے۔ پھر زمان ومکان کے بغیر کسی جسم کا پایا جانا بھی از قبیل محالات ہے۔ نیز رات کے قلیل ترین حصہ میں آسمانوں کی سیر کر کے واپس آنا کسی طرح ممکن نہیں۔

☆ اس قسم کے تمام شکوک وشبہات کا جواب یہ ہے کہ ان تمام امور کے محال ہونے سے ان کی مراد عقلی ہے یا عادی۔ بر تقدیر اول آج تک استحالہ عقلیہ پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکی۔ جس قدر دلائل فلاسفہ کی طرف سے پیش ہوئے ہیں ان سب کا مفاد استحالہ عادیہ ہے اور بس۔ معلوم ہوا کہ یہ جملہ امور متنازعہ فیہا از قبیل محالات عادیہ ہیں اور محال عادی ممکن بالذات ہوتا ہے اور ممکن بالذات حادث تحت قدرت ہے۔ لہٰذا یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت ثابت ہوئیں اور معراج کرانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالم عناصر سے آسمانوں پر لے جانا اور رات کے بہت تھوڑے حصے میں واپس لے آنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت وتصرف کا کرشمہ قرار پایا جس پر فلاسفہ کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے "سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی" فرمایا اور لے جانے کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی تا کہ اعتراض کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

معراج شریف کا محال ہونا اس کے وقوع کی دلیل ھے

☆ میں تو یہ عرض کروں گا کہ اگر فلاسفہ سفر معراج شریف کے استحالہ پر دلائل قائم نہ کرتے تو ہمارا مدعا ثابت نہ ہوتا۔ اس لئے کہ ہم معراج کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معجزہ کہتے ہیں اور معجزہ وہی ہے جس کا وقوع عادتاً محال ہو اور منکرین کو عاجز کرنے کے لئے ضروری تھا کہ پہلے اس کے استحالہ عادیہ کو ثابت کیا جائے تا کہ قدرت ایزدی سے اس کا ظہور ووقوع معجزہ قرار پا سکے۔

☆ اب ظاہر ہے کہ یہ کام کسی مسلمان سے تو ممکن نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر ایمان رکھنے کے باوجود معراج کے محال ہونے پر دلیلیں قائم کرے۔ لہٰذا جس اللہ نے اپنی قدرت سے معراج جیسے محال کو ممکن نہیں بلکہ واقع کر دیا۔ اسی قادرِ مطلق نے اپنی قدرتِ کاملہ سے فلاسفہ جیسے ملحدین اور بے دین لوگوں سے اس کے استحالہ پر دلیلیں قائم کرادیں تا کہ ادعاء استحالہ کے بعد اس کا وقوع اس کے معجزہ ہونے کی دلیل قرار پا سکے۔ وللّٰہ الحجۃ السامیۃ۔

☆ تعجب ہے کہ مادی ترقی کے اس دور میں بھی لوگوں کو مسئلہ معراج میں تردد ہے۔ جب کہ محض مادی اور برقی طاقت کے بل بوتے پر انسان مشرق و مغرب اور جنوب اور شمال کے قلابے ملا رہا ہے۔ زمین سے آسمانوں کی طرف ہوائی جہازوں کی پرواز، راکٹوں کا ستاروں تک پہنچنے کا ادعاء چند منٹ میں ہزاروں میل مسافت طے کرنے کا زعم اور محض برقی طاقت سے۔ لیکن معراج کے معاملے میں اس حقیقت کو قطعاً نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ قیوم اپنی قدرت کاملہ سے اپنے ایسے روحانی، نورانی محبوب کو راتوں رات لے گیا جس کی روحانیت کا مادہ پرست انکار بھی نہیں کر سکتے پھر براق پر لے گیا جو برق سے مشتق ہے۔ برق بجلی کو کہتے ہیں جس بجلی کے بل بوتے پر انسان ضعیف البنیان آج منٹوں میں ہزاروں میل مسافت طے کر سکتا ہے۔ فضائے عالم کو چیر کر آسمانوں اور ستاروں کی طرف بلند پروازی کا دعویٰ کر سکتا ہے اگر باقی تمام امور سے قطع نظر کر کے صرف اسی برقی طاقت کو مدنظر رکھ لیا جائے تب بھی مسئلہ معراج میں کسی قسم کا خلجان باقی نہیں رہتا۔

☆ باقی رہا آسمانوں کا خرق والتیام تو اس زمانہ میں لوگوں نے سرے سے آسمانوں ہی کا انکار کر دیا تو خرق والتیام کی کہاں گنجائش رہی۔

☆ ہمارے نزدیک تو آسمان ایسے اجسام لطیفہ ہیں جن میں خرق والتیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تفصیل کے لئے ہمارا رسالہ ''قرآن اور آسمان'' ملاحظہ کیجئے جس میں اجسام ساویہ کی لطافت پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

تصدیق صدیق

☆ جب حضور ﷺ نے قریش مکہ کے سامنے واقعہ معراج بیان فرمایا تو انہوں نے (معاذ اللہ) تمسخر کیا اور ابوجہل نے قریش مکہ کو جمع کر کے مذاق اڑایا۔ ہر طرف آدمی دوڑائے اور زیادہ سے زیادہ آدمی جمع کر کے تکذیب و تمسخر کے لئے واقعہ معراج سنایا گیا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس بلانے کے لئے آدمی بھیجے اور ان سے کہا کہ تمہارے رسول (ﷺ) فرماتے ہیں کہ میں راتوں رات مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں پر پہنچا اور تمام آسمانوں کی سیر کر کے واپس آ گیا۔ کیا ان کی ایسی بات کی بھی آپ تصدیق کریں گے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تو اس سے بھی زیادہ بعید چیزوں میں ان کی تصدیق کرتا ہوں۔ اگر انہوں نے فرمایا ہے تو اس کے حق ہونے میں کوئی شک نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور سید عالم ﷺ سے عرض کیا کہ ''حضور (ﷺ)'' میں نے بیت المقدس دیکھا ہوا ہے۔ حضور میرے سامنے اس کی صفت بیان فرمائیں۔ بیت المقدس منکشف ہو گیا اور حضور ﷺ نے مسجد اقصیٰ کی در و دیوار، اس کی ہیئت اور کیفیت وغیرہ امور بیان فرمائے۔ (مواہب اللدنیہ جلد ثانی)

☆ کفار قریش جو تکذیب و تمسخر کے درپے تھے کہنے لگے کہ ہم نے آسمان تو دیکھے نہیں لیکن مسجد اقصیٰ دیکھی ہے۔ آپ ہمارے سامنے اس کی پوری ہیئت، نوعیت و کیفیت بیان فرمائیں۔ حضور ﷺ بیان فرمانے لگے تو اثنائے بیان میں ایک انقباض کی سی حالت طاری ہو گئی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے حضرت عقیل ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے گھر کے قریب رکھ دیا۔ حضور ﷺ اسے دیکھتے جاتے تھے اور بیان فرماتے جاتے تھے۔ اس مقام پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علم کا انکار کرنا

غلط ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر علم نہ ہوتا تو حضورﷺ فرمادیتے تھے کہ مجھے ہر بات کا علم نہیں۔ علاوہ ازیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے سب کچھ بیان فرما چکے تھے۔ پھر علم نہ ہونے کے کیا معنی؟ باوجود علم کے بعض چیزوں کی طرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا التفات نہ تھا جس کی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ کیفیت لاحق ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبﷺ کی اس حالت اور کیفیت کو دور فرمانے کے لئے مسجد اقصیٰ حضورﷺ کے سامنے رکھ دی۔ اس میں حضورﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کمال اعزاز و اکرام ثابت ہوتا ہے کہ معمولی سی عدم توجہ کے باعث جو اضطرابی کیفیت لاحق ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کے ازالہ کے لئے خرق عادت کے طور پر اپنی قدرتِ کاملہ کو ظاہر فرمادیا اور جس طرح واقعہ معراج معجزہ تھا بالکل اسی طرح اس کی دلیل میں بھی معجزہ ظاہر فرمایا تا کہ اعجازی شان میں دعویٰ اور دلیل آپس میں مطابق ہو جائیں اور اہل ایمان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جو قادر و قیوم حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے پل جھپکنے سے پہلے بلقیس کا عظیم تخت لاسکتا ہے وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے اپنے حبیبﷺ کے سامنے مسجد اقصیٰ کو بھی ظاہر کرسکتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس صورت میں فلسطین کے رہنے والوں نے مسجد اقصیٰ کو گم کیوں نہیں پایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کی عظیم قدرت سے یہ بعید نہیں کہ ملک شام میں مسجد اقصیٰ دیکھنے والوں کے سامنے اس کی ایسی مثال قائم فرمائے جس کا دیکھنا مسجد اقصیٰ کے حکم میں ہو۔ **وما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز۔**

☆ جب حضورﷺ مسجد اقصیٰ کے متعلق ہر سوال کا مسکت جواب دے چکے تو کفارِ قریش حیران ہوئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کبھی مسجد اقصیٰ نہیں دیکھی۔ مجبوراً انہیں کہنا پڑا کہ مسجد اقصیٰ کے متعلق جو کچھ حضورﷺ نے فرمایا سب درست ہے لیکن اس خیال سے کہ شاید کسی سے سن کر بیان کر دیا ہو کفارِ قریش کہنے لگے کہ مسجد اقصیٰ کا نقشہ تو آپ نے ٹھیک ٹھیک بیان فرمادیا لیکن یہ بتایئے کہ مسجد اقصیٰ جاتے یا آتے ہوئے ہمارا قافلہ بھی آپ کو ملا ہے یا نہیں؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، ہاں (ایک شخص کا نام لے کر ارشاد فرمایا کہ) بنی فلاں کے قافلہ پر مقام روحاء پر میں گزرا۔ ان کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا وہ اسے تلاش کر رہے تھے اور ان کے پالان میں پانی بھرا ہوا ایک پیالہ رکھا تھا۔ مجھے پیاس لگی تو میں نے پیالہ اٹھا کر اس کا پانی پی لیا۔ پھر اس کی جگہ اس کو ویسے ہی رکھ دیا جیسے وہ پہلے رکھا ہوا تھا۔ جب وہ لوگ آئیں تو ان سے دریافت کرنا کہ جب وہ اپنا گم شدہ اونٹ تلاش کر کے اپنے پالان کی طرف آئے تھے تو کیا انہوں نے اس پیالہ میں پانی ڈالا تھا یا نہیں؟ انہوں نے کہا، ہاں ٹھیک ہے۔ یہ ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک شخص کا نام لے کر فرمایا کہ میں بنی فلاں کے قافلہ پر بھی گزرا اور فلاں اور فلاں (جن کا نام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذکر فرمایا لیکن راوی کو یاد نہیں رہا) دو آدمی مقام ذی طویٰ میں ایک اونٹ پر سوار تھے ان کا اونٹ میری وجہ سے بدک کر بھاگا اور وہ دونوں سوار گر پڑے۔ ان میں فلاں شخص کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ جب وہ آئیں تو دونوں سے یہ بات دریافت کر لینا۔ انہوں نے کہا، اچھا یہ دوسری نشانی ہوئی۔ پھر انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک قافلہ کی بات معلوم کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ میں اس قافلہ پر مقام تنعیم میں گزرا ہوں۔ انہوں کہا اس کی گنتی بتایئے اور وہ قافلہ کیا چیز لاد کر لا رہا ہے۔ اس کی ہیئت کیا ہے اور

اس میں کون کون لوگ ہیں؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، ہاں اس کی ہیئت ایسی اور ایسی ہے اور اس قافلے کے آگے بھورے رنگ کا اونٹ ہے۔ اس پر دھاری دار دو بوریاں لدی ہوئی ہیں اور سورج نکلتے ہی مکہ میں پہنچ جائے گا۔ انہوں نے کہا، یہ تیسری نشانی ہوئی۔ پھر پھر وہ پہاڑ کی گھاٹی کی طرف دوڑے کہتے تھے کہ محمد نے ایک چیز بیان کی ہے۔ پھر وہ کدئی پہاڑی پر آ بیٹھے اور انتظار کرنے لگے کہ سورج کب نکلے تاکہ ہم حضور ﷺ کی تکذیب کریں۔ (معاذ اللہ) ناگہاں ان میں سے ایک آدمی بولا خدا کی قسم! یہ سورج نکل آیا۔ دوسری طرف انہی کے ایک آدمی نے اسی وقت کہا۔ خدا کی قسم! یہ قافلہ بھی آ گیا۔ اس کے آگے بھورے رنگ کا اونٹ ہے۔ اس قافلہ میں فلاں فلاں آدمی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمایا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایمان نہ لائے اور یہ کہا کہ (معاذ اللہ) یہ کھلا جادو ہے۔

بیت المقدس میں باب محمد ﷺ

☆ ابن ابی حاتم نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ معراج کی رات جب حضور ﷺ کو جبریل علیہ السلام براق پر سوار کر کے بیت المقدس پہنچے اور حضور ﷺ اس مقام پر تشریف فرما ہوئے جسے باب محمد ﷺ کہا جاتا ہے تو جبریل علیہ السلام ایک پتھر کے پاس آئے جو اس جگہ تھا۔ جبریل علیہ السلام نے اس پتھر میں اپنی انگلی مار کر سوراخ کر دیا اور براق اس میں باندھ دیا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۶)

معراج شریف پر ایلیاء کے بطریق کی شہادت

☆ حافظ ابونعیم اصبہانی نے دلائل النبوۃ میں حضرت محمد بن کعب قرظی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت دحیہ بن خلیفہ رضی اللہ عنہ کو قیصر روم کی طرف بھیجا۔ راوی نے حضرت دحیہ کے جانے اور پہنچنے کا پورا واقعہ بیان کیا اور یہ بھی کہا کہ قیصر روم نے (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پیغام مبارک سن کر) ملک شام سے عرب کے تاجروں کو طلب کیا۔ حضرت ابوسفیان اور ان کے ہمراہی قیصر روم کے سامنے پیش کئے گئے۔ قیصر روم نے ان سے وہ مشہور سوالات کئے جنہیں بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ (اس وقت) ابوسفیان نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح قیصر روم کے سامنے حضور ﷺ کے امر کو (معاذ اللہ) حقیر و ذلیل کیا جائے۔ اس روایت میں ابوسفیان کا قول ہے کہ میں چاہتا تھا کہ ہرقل قیصر روم کے سامنے کوئی ایسی بات کروں جس سے حضور ﷺ قیصر روم کی نظروں میں گر جائیں۔ مگر مجھے خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میرے جھوٹ کی گرفت کرے اور میری تمام باتوں کو جھٹلا دے۔ اس طرح میں لوگوں میں بدنام ہو جاؤں اور میری سرداری پر دھبہ آئے۔ ابوسفیان نے کہا میں اسی فکر میں تھا کہ مجھے شب معراج کے بارے میں ان کا قول یاد آ گیا۔ میں نے فوراً کہا کہ اے بادشاہ (قیصر روم) کیا میں تجھے ایسی بات نہ بتاؤں جسے سن کر (معاذ اللہ) تو ان کے جھوٹا ہونے کو پہچان لے۔ بادشاہ نے کہا، وہ کیا بات ہے۔ ابوسفیان نے جواب دیا کہ ان کا کہنا ہے کہ میں ایک رات میں ارض حرم (مسجد بیت الحرام) سے چلا اور ایلیاء (بیت المقدس) کی مسجد اقصیٰ میں آیا اور اسی رات صبح سے پہلے مکہ واپس پہنچ گیا۔ ابوسفیان نے کہا کہ جس وقت میں یہ بات کر رہا تھا اس وقت عیسائیوں کا پیشوا جو مسجد اقصیٰ کا بڑا پادری تھا قیصر روم کے پاس کھڑا تھا بیت المقدس کے اس بطریق

نے کہا مجھے اس رات کا علم ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ تجھے کیا علم ہے؟ اس نے کہا کہ میری عادت ہے کہ میں ہر روز رات کو سونے سے پہلے مسجد کے تمام دروازے بند کردیا کرتا ہوں۔ اس رات میں نے تمام دروازے بند کردیئے۔ باوجود انتہائی کوشش کے ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہوسکا۔ میں نے اپنے کارندوں اور تمام حاضرین سے مدد لی۔ سب نے پورا زور لگایا اور ساری قوت صرف کردی مگر وہ دروازہ نہ ہلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کسی پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ بالآخر میں نے ترکھانوں کو بلایا انہوں نے اسے دیکھ کر کہا (ایسا معلوم ہوتا ہے) کہ اوپر کی عمارت نیچے آ گئی ہے اور دروازہ کی چھاؤں (اوپر کی چوکھٹ) کا اس پر دباؤ پڑ گیا ہے۔ اب رات میں کچھ نہیں ہوسکتا۔ صبح دیکھیں گے کہ کس طرف سے یہ خرابی واقع ہوئی ہے۔ بطریق نے کہا دروازے کے دونوں کواڑ کھلے چھوڑ کر ہم لوگ واپس چلے گئے۔ صبح ہوتے ہی میں وہاں آیا۔ یکا یک دیکھتا ہوں کہ مسجد کا دروازہ بالکل ٹھیک ہے گوشۂ مسجد کے پتھر میں سوراخ ہے اور سواری کے جانور باندھنے کا نشان اس میں نظر آ رہا ہے۔ (یہ منظر دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ آج رات باوجود انتہائی کوشش کے دروازہ کا بند نہ ہونا اور پتھر میں سوراخ کا پایا جانا پھر اس سوراخ میں جانور باندھنے کا نشان موجود ہونا حکمت سے خالی نہیں) میں نے اپنے ہمراہیوں سے کہا آج رات اس دروازہ کھلا رہنا صرف نبی معظم ﷺ کے لئے تھا۔ یقیناً اس نبی معظم ﷺ نے ہماری اس مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھی۔ پھر پوری حدیث بیان کی۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۴)

حدیث معراج کے راوی

☆ حدیث اسراء اور معراج کو مندرجہ ذیل صحابہ کرام و اسلاف عظام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے روایت فرمایا۔ جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے حافظ ابوالخطاب سے تفسیر ابن کثیر میں نقل فرمایا

☆ حضرت عمر فاروق، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت ابوذر، حضرت انس بن مالک، حضرت مالک بن صعصعہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابو سعید خدری، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت شداد بن اوس، حضرت ابی بن کعب، حضرت عبد الرحمٰن بن قرظ، حضرت ابوحبہ، حضرت ابولیلیٰ، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت جابر انصاری، حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت بریدہ اسلمی، حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت ابو امامہ، حضرت سمرہ بن جندب، حضرت ابو الحمراء، حضرت صہیب رومی، حضرت ام ہانی، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت اسما بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۴)

☆ بعض علماء نے ان حضرات کے علاوہ مندرجہ ذیل صحابہ کرام کا اضافہ بھی فرمایا

☆ حضرت صدیق اکبر، حضرت عثمان غنی، حضرت ابو درداء، حضرت بلال بن سعد، حضرت عبد اللہ بن زبیر، حضرت ابو سفیان، حضرت سیدہ ام کلثوم بنت رسول اللہ ﷺ رضی اللہ عنہم اجمعین

شب معراج شق صدر مبارک

☆ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ فرشتوں نے حضور ﷺ کا سینۂ اقدس اوپر سے نیچے تک چاک کیا اور قلب مبارک باہر نکالا

پھر اسے شگاف دیا اور اس سے خون کا ایک لوتھڑا نکال کر پھینکا اور کہا کہ آپ کے اندر یہ شیطان کا ایک حصہ تھا۔

خون کا لوتھڑا یا شیطان کا حصہ

☆ علامہ تقی الدین سبکی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں خون کا لوتھڑا پیدا فرمایا ہے اس کا کام یہ ہے کہ انسان کے دل میں شیطان جو کچھ ڈالتا ہے یہ لوتھڑا اس کو قبول کرتا ہے (جس طرح قوت سامعہ آواز کو اور قوت باصرہ مبصرات کی صورتوں کو اور قوت شامہ خوشبو، بدبو کو اور قوت ذائقہ ترشی، تلخی وغیرہ کو اور قوت لامسہ گرمی، سردی وغیرہ کیفیات کو قبول کرتی ہے اسی طرح دل کے اندر یہ منجمد خون کا لوتھڑا شیطانی وسوسوں کو قبول کرتا ہے۔ یہ لوتھڑا جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب مبارک سے دور کر دیا گیا تو حضور ﷺ کی ذاتِ مقدسہ میں ایسی کوئی چیز باقی نہ رہی جو القائے شیطانی کو قبول کرنے والی ہو۔ علامہ تقی الدین فرماتے ہیں اس حدیث پاک سے یہی مراد ہے کہ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی میں شیطان کا کوئی حصہ کبھی نہیں تھا۔

☆ اگر کوئی اعتراض کرے کہ جب یہ بات تھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مقدسہ میں اس خون کے لوتھڑے کو کیوں پیدا فرمایا کیونکہ یہ ممکن تھا کہ پہلے ہی ذاتِ مقدسہ میں اسے پیدا نہ فرمایا جاتا؟ تو جواب دیا جائے گا کہ اس کے پیدا فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ وہ اجزائے انسانیہ میں سے ہے۔ لہٰذا اس کا پیدا کرنا خلقت انسانی کی تکمیل کے لئے ضروری ہے اور اس کا نکال دینا یہ ایک امر آخر ہے جو تخلیق کے بعد طاری ہوا۔ (انتہیٰ)

☆ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس کی نظیر بدن انسانی میں اشیائے زائدہ کی تخلیق ہے جیسے قلفہ کا ہونا، ناخنوں اور مونچھوں کی درازی اور اسی طرح بعض دیگر زائد چیزیں (جن کا پیدا ہونا بدن انسانی کی تکمیل کا موجب ہے اور ان کا ازالہ طہارت ولطافت کے لئے ضروری ہے) مختصر یہ کہ ان اشیاء زائدہ کی تخلیق اجزائے بدن انسانی کا تکملہ ہے اور ان کا زائل کرنا کمال تطہیر وتنظیف کا مقتضیٰ ہے۔ (شرح شفاء لملاعلی قاری ج اول ص ۴۷۲) اقول وباللہ التوفیق چونکہ ذات مقدسہ میں حظ شیطانی باقی ہی نہ تھا اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہمزاد مسلمان ہو گیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ "ولکن اسلم فلا یأمرنی الا بخیر" میرا ہمزاد مسلمان ہو گیا لہٰذا سوائے خیر کے وہ مجھے کچھ نہیں کہتا۔ علامہ شہاب الدین خفاجی نسیم الریاض میں فرماتے ہیں کہ قلب بمنزلہ میوہ کے ہے جس کا دانہ اپنے اندر کے تخم اور گٹھلی پر قائم ہوتا ہے اور اس سے پختگی اور رنگینی حاصل کرتا ہے اسی طرح وہ منجمد خون قلب انسانی کے لئے ایسا ہے جیسے چھوہارے کے لئے گٹھلی۔ اگر ابتداءً اس میں گٹھلی نہ ہو تو وہ پختہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن پختہ ہو جانے کے بعد اس گٹھلی کو باقی نہیں رکھا جاتا بلکہ نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔ چھوہارے کی گٹھلی یا دانہ انگور سے بیج نکال کر پھینکتے وقت کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ جو چیز پھینکنے کے قابل تھی وہ پہلے ہی کیوں پیدا کی گئی؟ اس طرح اگر یہ بات ذہن نشین ہو جائے کہ قلب اطہر میں خون کا وہ لوتھڑا اسی طرح تھا جیسے انگور کے دانہ میں بیج یا کھجور کے دانہ میں گٹھلی ہوتی ہے اور قلب اطہر سے اس کو بالکل اسی طرح نکال کر پھینک دیا گیا جیسے کھجور اور انگور سے گٹھلی اور بیج کو نکال کر باہر پھینک دیا جاتا ہے تو یہ سوال ہی پیدا نہ ہو گا کہ اس لوتھڑے کو قلب اطہر میں ابتداءً کیوں پیدا کیا گیا؟

(نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض ج ثانی ص ۲۳۹)

☆ رہا یہ امر کہ فرشتوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ کیوں کہا کہ "ھٰذہ حظک من الشیطان" تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے یہ معنی نہیں کہ (معاذ اللہ) آپ کی ذات پاک میں واقعی شیطان کا کوئی حصہ ہے۔ نہیں اور یقیناً نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ذات پاک ہر شیطانی اثر سے پاک اور طیب و طاہر ہے بلکہ حدیث شریف کے معنی یہ ہیں اگر آپ کی ذات پاک میں شیطان کے تعلق کی کوئی جگہ ہو سکتی تو وہ یہی خون کا لوتھڑا تھا جب اس کو آپ کے قلب مبارک سے نکال کر باہر پھینک دیا گیا تو اس کے بعد آپ کی ذاتِ مقدسہ میں کوئی ایسی چیز باقی نہ رہی جس سے شیطان کا کوئی تعلق ممکن ہو۔ خلاصہ یہ کہ الفاظ حدیث کا واضح اور روشن مفہوم یہ ہے کہ اگر آپ کی ذاتِ مقدسہ میں شیطان کا کوئی حصہ ہوتا تو یہی خون کا لوتھڑا ہو سکتا تھا مگر جب یہ بھی نہ رہا تو اب ممکن ہی نہیں کہ ذاتِ اقدس سے شیطان کا کوئی تعلق کسی طرح سے ہو سکے۔ لہٰذا حضور ﷺ کی ذاتِ مقدسہ ان تمام عیوب سے پاک ہے جو اس لوتھڑے کے ساتھ شیطان کے متعلق ہونے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

☆ شق صدر مبارک کے بعد ایک نورانی طشت جو ایمان و حکمت سے لبریز تھا حضور ﷺ کے سینۂ اقدس میں بھر دیا گیا۔ ایمان و حکمت اگرچہ جسم و صورت سے متعلق نہیں لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ غیر جسمانی چیزوں کو جسمانی صورت عطا فرمائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایمان و حکمت کو جسمانی صورت میں متمثّل فرما دیا اور یہ تمثّل رسول اللہ ﷺ کے حق میں انتہائی عظمت و رفعت شان کا موجب ہے۔

شق صدر مبارک کی حکمت

☆ شب معراج حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سینۂ اقدس کے شق کیے جانے میں بے شمار حکمتیں مضمر ہیں جن میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ قلب اطہر میں ایسی قوت قدسیہ بالفعل ہو جائے جس سے آسمانوں پر تشریف لے جانے اور عالم سماوات کا مشاہدہ کرنے بالخصوص دیدارِ الٰہی سے مشرف ہونے میں کوئی دقت اور دشواری پیش نہ آئے۔

حیات النبی کی دلیل

☆ علاوہ ازیں شق صدر مبارک میں ایک حکمت بلیغہ یہ بھی ہے کہ صحابہ کرام کے لئے حضور ﷺ کی حیات بعد الموت پر دلیل قائم ہو گئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عادتاً بغیر روح کے جسم میں حیات نہیں ہوتی لیکن انبیاء علیہم السلام کے اجسام مقدسہ قبض روح کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں چونکہ روح حیات کا مستقر قلب انسانی ہے۔ لہٰذا جب کسی انسان کا دل اس کے سینہ سے باہر نکال لیا جائے تو وہ زندہ نہیں رہتا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کا قلب مبارک سینۂ اقدس سے باہر نکالا گیا پھر اسے شگاف دیا گیا اور وہ منجمد خون جو جسمانی اعتبار سے دل کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے صاف کر دیا گیا۔ اس کے باوجود بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بدستور زندہ رہے جو اس امر کی روشن دلیل ہے کہ قبض روح مبارک کے بعد بھی حضور ﷺ زندہ ہیں۔ کیونکہ جس کا دل بدن سے باہر ہوا اور وہ پھر بھی زندہ ہے اگر اس

کی روح قبض ہوکر باہر ہو جائے تو وہ کب مردہ ہوسکتا ہے۔

قلب مبارک میں دو آنکھیں اور کان

☆ جبریل علیہ السلام نے شق صدر مبارک کے بعد قلب اطہر کو جب زمزم کے پانی سے دھویا تو فرمانے لگے "قلب سدید فیه عینان تبصران واذنان تسمعان" "قلب مبارک ہر قسم کی کجی سے پاک ہے اور بے عیب ہے اس میں دو آنکھیں ہیں جو دیکھتی ہیں اور دو کان ہیں جو سنتے ہیں۔" (فتح الباری جلد ۱۳ ص ۴۱۰)

☆ قلب مبارک کے یہ کان اور آنکھیں عالم محسوسات سے وراء الوراء حقائق کو دیکھنے اور سننے کیلئے ہیں جیسا کہ خود حضور علیہ ﷺ نے فرمایا "انی اریٰ مالا ترون واسمع ما لا تسمعون" "میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے اور وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سن سکتے۔"

دائمی ادراک

☆ جب اللہ تعالیٰ نے بطور خرق عادات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب اطہر میں آنکھیں اور کان پیدا فرما دیئے ہیں تو اب یہ کہنا کہ وراء عالم محسوسات کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دیکھنا اور سننا احیاناً ہے دائمی نہیں قطعاً باطل ہو گیا۔ جب ظاہری آنکھوں اور کانوں کا ادراک دائمی ہے تو قلب مبارک کے کانوں اور آنکھوں کا ادراک کیونکر عارضی اور احیاناً ہوسکتا ہے؟ البتہ حکمت الٰہیہ کی بنا پر کسی امر خاص کی طرف حضور علیہ ﷺ کا دھیان نہ رہنا اور عدم توجہ اور عدم التفات کا حال طاری ہو جانا امر آخر ہے جس کا کوئی منکر نہیں اور وہ علم کے منافی نہیں ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل واضح ہوگئی کہ حضور علیہ ﷺ کی باطنی سماع اور بصارت عارضی نہیں بلکہ دائمی ہے۔

شق صدر مبارک اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نوری ہونا

☆ علامہ شہاب الدین خفاجی فرماتے ہیں کہ بعض لوگ یہ وہم کرتے ہیں کہ شق صدر مبارک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور سے مخلوق ہونے کے منافی ہے لیکن یہ وہم غلط اور باطل ہے ان کی عبارت یہ ہے کہ "وکونه مخلوقا من النور لا ینافیه کما توهم (نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض ج ۲ ص ۲۳۸)

نورانیت اور احوال بشریہ کا ظہور

☆ اقول وباللّٰه التوفیق جو بشریت عیوب و نقائص بشریت سے پاک ہو اس کا نور ہونا نورانیت کے منافی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نور سے مخلوق فرما کر مقدس اور پاکیزہ بشریت کے لباس میں مبعوث فرمایا۔ شق صدر ہونا بشریت مطہرہ کی دلیل ہے اور باوجود سینۂ اقدس چاک ہونے کے خون نہ نکلنا نورانیت کی دلیل ہے۔ "فلم یکن الشق بالة ولم یسل الدم" "شق صدر کسی آلہ سے نہ تھا نہ اس شگاف سے خون بہا" (روح البیان ج ۵ ص ۱۰۶)

☆ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خلقت نور سے ہے اور بشریت ایک لباس ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ جب چاہے اپنی حکمت کے مطابق بشری احوال کو نورانیت پر غالب کردے اور جب چاہے اپنی حکمت کے مطابق بشری احوال کو نورانیت پر غالب کردے اور جب چاہے نورانیت کو احوال بشریت پر غالب کردے۔ بشریت نہ ہوتی تو "شق" کیسے ہوتا اور نورانیت نہ ہوتی تو آلہ بھی درکار ہوتا اور خون

بھی ضرور رہتا۔

☆ جب کبھی خون بہا (جیسے غزوہ احد میں) تو وہاں احوال بشریہ کا غلبہ تھا اور جب خون نہ بہا (جیسے لیلۃ المعراج شق صدر میں) تو وہاں نورانیت غالب تھی۔

☆ جسمانی معراج کا بھی یہی حال ہے کہ تینوں میں سے کوئی چیز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتی لیکن کہیں بشریت کا ظہور، کہیں نورانیت کا اور کہیں حقیقت محمدیہ کا یعنی صورۃ حقیہ کا۔ ولکن کثیرا من الناس عنھا غفلون۔

آسمانوں کے دروازے اور ان کا کھلوانا

☆ آسمان اجسام لطیفہ ہیں اور ایسے ہی ان کے دروازے بھی لطیف ہیں اور ان سے عزت و کرامت کی وہ راہیں مراد ہیں جو بجز حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے کسی پر نہیں کھولی گئیں۔ اسی لئے جب جبریل علیہ السلام نے حضور علیہ السلام کا اسم مبارک نہیں لیا ساتوں آسمانوں میں سے کسی کا دروازہ نہیں کھولا گیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ عظمت مصطفویہ کا وہ چمکتا ہوا نشان ہے جو ابد الآباد تک نہیں مٹ سکتا۔

ایک اعتراض

☆ جبریل علیہ السلام جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معیت میں آسمانوں پر پہنچے تو ہر آسمان پر فرشتوں نے سوال کیا کہ کون ہے؟ جبریل علیہ السلام نے کہا "جبریل" فرشتوں نے کہا تمہارے ساتھ کون ہے؟ جب دیا محمد ﷺ پھر فرشتوں نے پوچھا کیا وہ بلائے گئے ہیں؟ جبریل علیہ السلام نے کہا ہاں۔ فرشتوں نے کہا مرحبا بہ اھلا اور دوسری روایت میں ہے نعم المجیء جاء. ان تمام سوالات و جوابات اور واقعہ کی نوعیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو معراج کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تشریف لے جانے سے پہلے کچھ علم نہ تھا۔

اعتراض کا جواب

☆ فرشتوں کو معراج شریف سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تشریف لانے کا علم نہ ہونا حدیث شریف کے خلاف ہے۔ بخاری شریف میں حدیث معراج کے یہ الفاظ موجود ہیں فیستبشر بہ اھل السماء یعنی حضور ﷺ کی خوش خبری آسمان والے سنتے تھے۔ (بخاری شریف ج دوم ص ۱۱۲۰)

☆ امام ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں اس کے تحت ارقام فرماتے ہیں

قولہ فاستبشر بہ اھل السماء کانھم کانوا اعلموا انہ سیعرج بہ فکانوا مترقبین لذٰلک۔

گویا فرشتوں کو بتا دیا گیا تھا کہ حضرت محمد ﷺ کو عنقریب معراج کرائی جائے گی تو وہ حضور ﷺ کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ (فتح الباری ج ۳ ص ۴۱۱)

☆ ہاں اس میں شک نہیں کہ بغیر بتائے آسمان والے نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ زمین میں کیا کرنا چاہتا ہے لیکن حضور ﷺ کے بارے میں چونکہ انہیں پہلے خوشخبری سنادی گئی تھی اس لئے وہ سب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔

☆ رہا سوال و جواب کا مسئلہ تو یہ بات دلائل کی روشنی میں آفتاب سے زیادہ روشن ہو چکی ہے کہ سوال ہمیشہ لاعلمی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ کبھی حکمت کی بناپر بھی ہوتا ہے۔ یہاں سوال و جواب میں مندرجہ ذیل دو حکمتیں ہیں

(۱) یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہفت سماوات میں عزت و کرامت کے مخصوص دروازے بجز حضرت محمد ﷺ کے کسی کے لئے نہیں کھولے جاسکتے۔ خواہ جبریل علیہ السلام ہی کیوں نہ ہوں۔

(۲) اگر فرشتے یہ نہ پوچھتے کہ "کیا وہ بلائے گئے ہیں؟" تو جبریل علیہ السلام نـعـم "ہاں" کہہ کر اقرار بھی نہ کرتے۔ جبریل علیہ السلام نے جب اس امر کا اقرار کرلیا کہ ہاں واقعی وہ بلائے گئے ہیں تو حضور ﷺ کی ایک اور فضیلت پر دلیل قائم ہوگئی اور وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بلایا جانا ہے۔ اگر یہ سوال و جواب نہ ہوتا تو حضور ﷺ کا بلایا جانا کیسے ثابت ہوتا؟

جبریل علیہ السلام کا آسمانوں پر حضور ﷺ کو حضرات انبیاء علیہم السلام سے متعارف کرنا

☆ جبریل علیہ السلام کے تعارف کرانے سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی لاعلمی ثابت نہیں ہوتی کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بیت المقدس میں تمام انبیاء علیہم السلام سے ملاقی ہو چکے تھے بلکہ بعض انبیاء علیہم السلام کی قبور سے گزرے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جبریل علیہ السلام کے تعارف کے بغیر جان لیا کہ یہ فلاں نبی کی قبر مبارک ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کثیب احمر پر موسیٰ علیہ السلام کی قبر شریف سے گزرے تو فرمایا میں نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ (صحیح مسلم ج اول)

☆ لہٰذا جبریل علیہ السلام کا تعارف حضور ﷺ کے عدم التفات کی وجہ سے ہے یا اپنی خادمانہ شان ظاہر کرنے کے لئے۔

موسیٰ علیہ السلام کا رونا

☆ معاذ اللہ کسی حسد کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نہیں روئے بلکہ رشک اور غبطہ کی بنا پر یا اپنی امت کے حال پر گریہ فرمایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نمازوں میں تخفیف طلب کرنے کا مشورہ دینا

☆ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ علم ہوتا کہ میری امت پچاس نمازیں نہ پڑھ سکے گی تو موسیٰ علیہ السلام کے بغیر کہے خود طلب تخفیف فرماتے لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے از خود ایسا نہ کیا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے کہنے سے واپس گئے اور نمازیں کم ہونے کی درخواست کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کو تجربہ کی بناء پر علم تھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نہ تھا۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باوجود عالم الغیب ہونے کے پچاس نمازیں فرض فرمائیں اور اولاً از خود کوئی تخفیف نہ فرمائی۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اس کا کوئی فعل خالی از حکمت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فعل میں حکمت تھی اور نبی کریم ﷺ کے خاموش رہنے میں بھی وہی حکمت تھی۔ حکمت کو لاعلمی کہنا جہالت ہے۔

☆ اس واقعہ میں یہ حکمت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حیاتِ ظاہری کے بعد بھی ہم دنیا والوں کے فائدہ کا وسیلہ بن گئے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اہل قبور خواہ انبیاء علیہم السلام ہی کیوں نہ ہوں دنیا والوں کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ جل شانہ نے اپنی حکمت بالغہ

سے ان کے اس قول کو رد فرما دیا اور وہ اس طرح کہ پینتالیس نمازیں معاف فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور معاف کروانے والے حضور محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معافی حاصل کرنے کے لئے بھیجنے والا اور معافی کا وسیلہ بننے والے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں جو صاحب قبر ہیں اور غالباً اسی حکمت کو ظاہر فرمانے کے لئے حضور ﷺ نے فرمایا فاذا ھو قائم یصلی فی قبرہ کہ جب مسجد اقصیٰ جا رہا تھا تو میں موسیٰ علیہ السلام کی قبر سے ہو کر گزرا۔ وہ اپنی قبر میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ خاص طور پر لفظ قبر ارشاد فرمانے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ اہل قبور کا دنیا ج والوں کو فائدہ پہنچانا ثابت ہو جائے اور وہ فائدہ بھی ایسا کہ تمام دنیا والے مل کر وہ فائدہ کسی کو نہیں پہنچا سکتے اگر سارا جہان بھی زور لگا لے تو فرائض کا ایک سجدہ بھی کم نہیں کرا سکتا لیکن موسیٰ علیہ السلام نے بالواسطہ پینتالیس نمازیں معاف کرائیں۔ اس کے علاوہ یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضور ﷺ کو نمازیں معاف کرانے کے لئے بار بار بھیج رہے تھے تا کہ حضور ﷺ ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں اور موسیٰ علیہ السلام حضور ﷺ کا دیدار کریں۔

سدرۃ المنتہیٰ

☆ ساتوں آسمانوں کے عجائب وغرائب اور آیاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ فرما کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سدرۃ المنتہیٰ پہنچے۔ سدرۃ المنتہیٰ بیری کا ایک درخت ہے اور علم خلائق کی منتہیٰ ہے۔ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے اذن طلب کیا کہ اے اللہ! تیرے محبوب ﷺ تشریف لا رہے ہیں ان کے جمال اقدس کی زیارت کرنے کی ہم کو اجازت مرحمت فرما۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تمام فرشتے سدرۃ المنتہیٰ جمع پر جمع ہو جائیں۔ جب میرے حبیب ﷺ کی سواری آئے تو سب زیارت کر لیں۔ چنانچہ ملائکہ کرام سدرۃ المنتہیٰ پر جمع ہو گئے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا "اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی" جب ڈھانک لیا سدرہ کو اس چیز نے جس نے کہ ڈھانک لیا یعنی شیٔ عظیم نے اور ملائکہ ربانی ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے "وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ" تیرے رب کے لشکر کو اللہ ہی جانتا ہے۔ حضور ﷺ نے درخت سدرہ کی طرف نظر اٹھائی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے درخت سدرہ کو ملائکہ سے ڈھکا ہوا پایا اور فرشتوں نے اللہ کے پیارے حبیب ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کر لیا۔ تفسیر درمنثور میں ہے

اخرج عبد بن حمید عن سلمۃ بن وھرام اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی قال استاء ذنت الملئکۃ الرب تبارک و تعالٰی ان ینظروا الی النبی ﷺ فاذن لھم فغشیت الملئکۃ السدرۃ لینظروا الی النبی ﷺ۔

ترجمہ: عبد بن حمید سلمیٰ بن وہرام نے اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی کی تفسیر میں روایت کرتے ہیں کہ ملائکہ نے اللہ تعالیٰ سے حضور ﷺ کو دیکھنے کی اجازت طلب کی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اجازت دے دی تو وہ سب سدرہ پر آ بیٹھے اور جمال محمدی دیکھنے کے لئے سدرہ کو ڈھانک لیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے سدرہ کے ہر پتہ پر ایک ایک فرشتہ کو دیکھا کہ وہ بحالت قیام سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ رہا ہے۔ (تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۱۲۶ اور روح المعانی پ ۲۷ ص ۴۴)

حضور ﷺ کا جنت میں تشریف لے جانا

☆ تفسیر ابن جریر میں ہے "حتّٰی دخلت الجنۃ فاذا فیھا ما لا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علٰی قلب

بشر۔ الحدیث (ابن جریر پ۱۵ص۱۱)

ترجمہ: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا میں جنت میں داخل ہوا تو یکا یک اس میں وہ تمام نعمتیں تھیں جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی بشر کے دل میں ان کا خیال آیا۔

☆ دوسری حدیث میں ہے "واللّٰہ ما نزل عن البراق حتّٰی رای الجنۃ والنار وما اعد اللّٰہ فی الاٰخرۃ اجمع" یعنی حضور علیہ السلام براق سے نہیں اترے۔ یہاں تک کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جنت ونار اور اللہ تعالیٰ نے آخرت میں جو کچھ تیار کر رکھا ہے سب کچھ نہ دیکھ لیا۔ آخرت کی ہر شئ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ملاحظہ فرمائی۔ (تفسیر ابن جریر پ۱۵ص۱۲)

☆ ان دونوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ جو لوگ آیۂ قرآنیہ "فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُم مِّن قُرَّةِ اَعْیُنٍ" پڑھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علم اقدس کی نفی کرتے ہیں وہ جھوٹے ہیں۔ آیت سے یا علم ذاتی کی نفی مراد ہے یا حضور علیہ السلام مخاطب ہونے کی وجہ سے اس کے عموم میں شامل نہیں۔ کیونکہ تفسیر ابن جریر کی ان دونوں حدیثوں سے صاف معلوم ہو گیا کہ آخرت کی کوئی چیز حضور علیہ السلام سے مخفی نہیں رہی۔

جنت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آگے حضرت بلال کے جوتوں کی آواز

☆ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اے بلال میں نے جنت میں اپنے آگے تیری جوتیوں کی آہٹ سنی ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جنت میں اس وقت نہ تھے مگر زمین کی آواز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سنی۔ تب بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے دور کی آواز سننا ثابت ہوا۔ اگر قیامت کے بعد ان کے چلنے کی آواز مراد ہو تو آواز پیدا ہونے سے پہلے سننا ثابت ہو گیا یہ پہلے سے بھی زیادہ کمال کا موجب ہے یا یوں کہیے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ زمین پر بھی تھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی کے طفیل اس وقت جنت میں بھی حضور علیہ السلام کے آگے چلے جس کی آواز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سنی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غلاموں کے لئے بیک وقت دو جگہ موجود ہونا ثابت ہوا۔ جن کے غلاموں کی یہ شان ہو ان کے آقا کی شان کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔

ایک جسم کا آن واحد میں دو جگہ حاضر ہونا

☆ سابقاً بحوالہ صحیح مسلم عرض کر چکا ہوں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام موسیٰ علیہ السلام کے مزار شریف سے گزرے تو وہ اپنی قبر انور میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی حال ہے کہ وہ زندہ ہیں اور اپنی قبورِ مقدسہ میں نمازیں پڑھتے ہیں۔ (رواہ البیہقی) اس کے باوجود مسجد اقصیٰ میں بھی سب موجود تھے حدیث شریف میں وارد ہے "قال جبریل صلّٰی خلفک کل نبی بعثہ اللّٰہ عزوجل (تفسیر ابن کثیر ج۳ص۶)

☆ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا، حضور! اللہ عزوجل کے ہر مبعوث فرمائے ہوئے نبی نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی۔

☆ لیکن جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام آسمانوں پر پہنچے تو ساتوں آسمانوں پر حضرات انبیاء علیہم السلام کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

نے ملاحظہ فرمایا۔ امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ فوائد معراج شریف بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ فوائد معراج میں سے ایک فائدہ یہ ہے "شهود الجسم الواحد في مكانين في آن واحد" یعنی آن واحد میں ایک جسم کا دو جگہ حاضر ہونا۔ (الیواقیت والجواہر ج ۲ ص ۳۶)

☆ اس کے بعد امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں جس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔

☆ میں نے آدم کو دیکھا، موسیٰ کو دیکھا، ابراہیم کو دیکھا اور اپنے اس کلام مبارک اطلاق رکھا اور روح کی قید لگا کر یہ نہیں فرمایا کہ میں نے آدم کی روح اور ابراہیم کی روح اور موسیٰ کی روح کو دیکھا (علی نبينا و عليهم الصلوٰة والسلام) مسجد اقصیٰ کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آسمان پر جس موسیٰ علیہ السلام سے دوبارہ ملاقات فرمائی وہ بعینہٖ وہی موسیٰ علیہ السلام ہیں جو اپنی قبر شریف میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے تو اے وہ شخص جو ایک جسم کے بیک وقت دو جگہ ہونے کا منکر ہے اس حدیث معراج پر تیرا ایمان کس طرح ہوگا؟ (الیواقیت والجواہر ج ۲ ص ۳۶)

ایک اعتراض اور اس کا جواب

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ معراج کا مسئلہ حاضر و ناظر ہونے کے منافی ہے کیونکہ جو ہر جگہ میں موجود ہو اس کے آنے جانے کے کیا معنی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ حضور سید عالم ﷺ کا حاضر و ناظر ہونا حضور ﷺ کی نورانیت اور روحانیت کی جہت سے ہے اور آنا جانا بشریت مقدسہ کی جہت سے لہٰذا کوئی منافات نہیں۔ یہی جواب حضور سید عالم ﷺ کے ہر قسم کے جسمانی آنے جانے اور سفر جہاد و ہجرت وغیرہ پر کیے ہوئے اعتراضات کے دفع کرنے کے لیے کافی ہے۔

حضور سید عالم ﷺ کا سدرۃ المنتہیٰ سے
عرش الٰہی پر جلوہ گر ہونا

امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ الیواقیت والجواہر میں فرماتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے استوا علی العرش کو اپنی مدح کا موجب قرار دیا اسی طرح اپنے حبیب ﷺ کو عرش پر لے جا کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت شان کا اظہار فرمایا۔ فرماتے ہیں
حيث كان العرش اعلٰى مقام ينتهٰى اليه من اسرى به من الرسل عليهم الصلوٰة والسلام قال وهٰذا يدل علٰى ان الاسراء كان بجسمه ﷺ.

(الیواقیت والجواہر ج ۲ ص ۳۷)

جبریل علیہ السلام کا پیچھے رہ جانا

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "ثم انطلق بی حتّٰی انتهيت الى الشجرة فغشيتني سحابة فيها من كل لون

فرفضتی جبریل و خورت ساجد اللّٰہ تعالٰی. (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۶)

☆ فرمایا پھر جبریل علیہ السلام مجھے لے چلے یہاں تک کہ میں سدرۃ المنتہٰی تک پہنچا۔ بادل کی طرح مجھے کسی چیز نے ڈھانک لیا تھا۔ اس میں ہر قسم کے رنگ تھے پھر جبریل علیہ السلام نے مجھے چھوڑ دیا اور میں اپنے رب کے لئے سجدہ کرتا ہوا گر پڑا۔ تفسیر نیشاپوری میں ہے "وذلک ان جبریل تخلف عنہ فی مقام (قال) لو دنوت انملة لاحترقت" (تفسیر نیشاپوری برحاشیہ تفسیر ابن جریر پ ۲۷ ص ۳۲)

☆ اور وہ یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایسی جگہ پیچھے رہ گئے جس کے متعلق انہوں نے کہا کہ اگر میں یہاں سے ایک انگلی کے ایک پورے کے برابر بھی آگے بڑھوں تو جل کر خاکستر ہو جاؤں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عرش پر جلوہ گر ہونے میں اختلاف

☆ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ علماء امت اس بارہ میں مختلف ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا منتہائے عروج کہاں تک ہوا۔ بعض کا قول ہے سدرۃ المنتہٰی بعض نے کہا جنت الماویٰ بعض نے کہا عرش بعض نے کہا فوق العرش بعض کا قول وراء فوق العرش الی طرف العالم جیسا کہ شرح عقائد نسفی نبراس اور شرح فقہ اکبر وغیرہ کے حوالہ سے بیان ہو چکا ہے۔ اگرچہ بعض علماء نے عرش اور فوق العرش جانے تک کی احادیث کو ضعیف قرار دیا ہے جیسا کہ زرقانی وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ بعض نے بالکل انکار کیا ہے لیکن محدث کبیر ابن ابی الدنیا نے روایت کیا "قال رسول اللّٰہ ﷺ مررت لیلة اسری بی برجل مغیب فی نور العرش (زرقانی ج ۶ ص ۱۰۶) معراج کی رات میں ایک شخص پر گزرا جو نور عرش میں غائب تھا۔ نورِ عرش سے حضور ﷺ کا گزرنا نورِ عرش سے آگے جانے کی دلیل ہے۔

☆ اور غالباً اسی روایت کی بنا پر امام قسطلانی شارح بخاری نے مواہب اللدنیہ میں فرمایا "ولما انتہٰی الی العرش تمسک العرش باذیالہ. (مواہب اللدنیہ ج ۲ ص ۳۴)

☆ یعنی جب حضور علیہ الصلوٰۃ عرش پر پہنچے تو عرشِ الٰہی نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مبارک داموں سے تمسک کیا الخ۔ سدرۃ المنتہٰی سے آگے جانا بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عرپر جلوہ گر ہونے کا مؤید ہے۔ ابن حاتم نے حضرت انس سے روایت کی کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سدرۃ المنتہٰی پر پہنچے تو سدرۃ المنتہٰی کو بادل کی طرح کسی چیز نے ڈھانک لیا جس میں ہر قسم کے رنگ تھے۔ پس جبریل علیہ السلام پیچھے رہ گئے۔ جبریل علیہ السلام کا پیچھے رہ جانا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سدرہ سے گزر جانا اس امر کی تائید کرتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام عرشِ الٰہی پر جلوہ گر ہوئے۔

☆ علامہ سید محمود آلوسی حنفی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سورۃ النجم کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ نجم سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

قال جعفر الصادق رضی اللّٰہ عنہ ھوا النبی ﷺ وھو بہ نزولہ من السماء لیلة المعراج وجوز علٰی ھٰذا ان یراد

بھویہ صعودہ و عروجہ علیہ الصلوٰۃ و السلام الٰی منقطع الأین.

ترجمہ: امام جعفر صادق نے فرمایا کہ نجم سے مراد نبی ﷺ ہیں اور ھویٰ سے مراد معراج کی رات حضور ﷺ کا اترنا ہے اور اس تقدیر پر جائز ہے کہ ھویٰ سے حضور ﷺ کا اوپر چڑھنا اور لامکان تک معراج کرنا مراد ہو۔ (تفسیر روح المعانی پ ۲۷ ص ۳۸)

بارگاہِ اسماء و صفات

☆ امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

اذا مر علی حضرات الاسماء الالٰھیۃ صار مختلفا بصفاتھا فاذا مر علی الرحیم کان رحیما او علی الغفور کان غفورا او علی الکریم کان کریما او علی الحلیم کان حلیما او علی الشکور کان شکورا او علی الجواد کان جواد او ھکذا فما یرجع من ذٰلک المعراج الا وھو فی غایۃ الکمال۔ (الیواقیت والجواھر ج ۲ ص ۳۶)

☆ یعنی حضور ﷺ شب معراج اسماءِ الٰہیہ کی بارگاہوں سے گزرے تو ان اسماء کی صفات کے ساتھ متصف ہوتے گئے۔ جب الرحیم پر گزرے رحیم بن گئے اور الغفور الکریم الحلیم الشکور الجواد پر گزرے تو غفور کریم حلیم شکور اور جواد ہو گئے اور اسی طرح دیگر اسماءِ الٰہیہ کی بارگاہوں سے گزرتے گئے اور وہ اسماء جن صفات سے متعلق ہیں ان صفات الٰہیہ سے متصف ہوتے گئے۔ جب معراج سے واپس تشریف لائے تو انتہائے کمال کے حال میں تھے۔

رفرف: امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب حضور ﷺ ایسے مقام پر پہنچے جہاں جبریل علیہ السلام کا منتہیٰ تھا تو جبریل علیہ السلام ٹھہر گئے۔ ایک سبز رنگ کا تخت ظاہر ہوا جس کا نام رفرف ہے۔ اس کے ساتھ ایک فرشتہ تھا جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو رفرف والے فرشتہ کے سپرد کر دیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جبریل علیہ السلام سے ہمراہی کے لئے فرمایا تو جبریل علیہ السلام نے عرض کیا لا اقدر ولو خطوت خطوۃ لاحترقت حضور میں آگے جانے پر قادر نہیں۔ اگر ایک قدم آگے بڑھوں تو جل کر خاک ہو جاؤں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام رفرف پر رونق افروز ہوئے۔ بالآخر رفرف اور اس پر مقرر کردہ فرشتہ بھی ایک مقام پر رہ گیا۔ پھر حضور ﷺ کو نور میں داخل کر دیا گیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بالکل تن تنہا رہ گئے۔ کوئی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ نہ تھا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی آواز

☆ امام شعرانی فرماتے ہیں اس وقت حضور ﷺ کو وحشت سی محسوس ہوئی تو حضور ﷺ کو ایک آواز معلوم ہوئی جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آواز سے مشابہ تھی۔ وہ آواز یہ تھی "قف یا محمد ان ربک یصلی" "اے محمد ﷺ توقف فرمائیے، آپ کا رب صلوٰۃ فرما رہا ہے۔" حضور ﷺ نے دل میں خیال فرمایا، کیا میرا رب نماز پڑھتا ہے۔ جب حضور ﷺ کے قلب اطہر میں اس خطاب سے تعجب کی کیفیت پیدا ہوئی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی آواز سے حضور ﷺ مانوس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ھو الذی یصلی علیکم و ملٰئکتہ" "اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے تم پر درود بھیجتے ہیں۔" امام شعرانی نے فرمایا "یعلم عند ذٰلک ما ھو المراد بصلاۃ الحق"

☆ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سن کر حضور علیہ ﷺ کو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ سے کیا مراد ہے۔ (الیواقیت والجواہر ج ۲ ص ۳۵)

حکمت ایزدی

☆ وحشت کے وقت کسی چیز کی طرف توجہ مبذول ہونا اور کسی امر پر تعجب کا لاحق ہونا وحشت دور ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ اس لئے بتقاضائے حکمت ایزدی صوت صدیق کے مشابہ "قف یا محمد ان ربک یصلی" کی آواز سن کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توجہ درود اور رحمت کے معنی کی بجائے نماز کے معنی کی طرف مبذول ہوئی تاکہ تعجب لاحق ہو اور اس تعجب اور توجہ کے سبب وحشت زائل ہو پھر آواز بھی انیس جلیس (حضرت ابوبکر صدیق) کی آواز کے مشابہ جو موجب استیناس ہے۔ چنانچہ وہ حکمت پوری ہوئی اور وحشت کا جو حال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر طاری تھا دور ہو گیا۔ اس کے بعد جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کا یہ حکم سنا "ھو الذی یصلی علیکم وملئکتہ" تو اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توجہ صلوٰۃ کے مرادی معنی کی طرف مبذول ہو گئی۔

وحشت میں حکمت

☆ امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ الیواقیت والجواہر ج ۲ ص ۳۵ پر فرماتے ہیں کہ شیخ اکبر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ جب حضور پر نور علیہ ﷺ کو نور میں داخل کیا گیا اور ہر طرف نور ہی نور نے حضور کو احاطہ میں لے لیا تو اس عالم تفرد میں حضور علیہ ﷺ پر وحشت کا حال طاری ہوا جو اس امر کی دلیل ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معراجِ جسمانی ہوئی ہے کیونکہ اگر محض روحانی معراج ہوتی روح مجرد کو وحشت کا حال طاری نہ ہوتا۔

ضروری تنبیہ

☆ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً مدارج النبوۃ میں ان ربک یصلی کا ترجمہ کیا ہے "پروردگارِ تو نمازی گزارد" بعض ناواقف لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہمارے بیانِ سابق سے یہ امر واضح ہو گیا کہ حضور علیہ ﷺ کی توجہ یصلی کے اس معنی کی طرف مبذول ہوئی تھی۔ لہٰذا حضرت شیخ دہلوی علیہ الرحمۃ کا ترجمہ بالکل صحیح ہے۔ البتہ یہ مرادی معنی نہیں۔ جیسا کہ ہم تفصیل میں لکھ چکے ہیں۔

بارگاہِ خداوندی

☆ جب عالم انوار سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام گزر گئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ خاص میں پہنچے اور ثم دنی فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنٰی مرتبہ پایا۔ پھر فاوحٰی الٰی عبدہٖ ما اوحٰی سے مشرف ہوئے اور دیدار الٰہی نصیب ہوا۔

☆ ان آیاتِ کریمہ پر کلام کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ قرآن مجید میں تین جگہ معراج شریف کا بیان وارد ہے

اول: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ الآیۃ

دوم: وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ

سوم: سورۂ النجم کی ابتدائی آیات۔ پہلی دو آیات پر کلام ہو چکا اب سورۂ النجم کی آیات معراج پر نہایت مختصر کلام ہدیہ ناظرین ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْمِرَّةٍ فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى۔ (سورۃ النجم پ ۲۷)

ترجمہ: ''قسم ستارہ وجود محمد کی جب یہ شب معراج اترے تمہارے صاحب نہ بہکے اور نہ بھٹکے اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے نہیں بولنا ان کا مگر وحی جوان کی طرف کی جاتی ہے۔ انہیں سکھایا سخت قوتوں والے زوروالے نے پھر برابر ہوا وہ اپنی اونچی جگہ میں اس حال میں کہ وہ آسمان بریں کے سب سے اونچے کنارے پر تھا پھر وہ نمد یک ہوا پھر زیادہ نزدیکی چاہی تو ہو گیا مقدار دو کمان کی یا زیادہ نزدیک۔ پھر وحی کی ہم نے اپنے بندے کی طرف جو وحی کی نہ غلطی کی دل نے اس چیز میں جو آنکھ نے دیکھی تو کیا تم جھگڑتے ہو ان سے ان کے دیکھنے پر اور بے شک انہوں نے دیکھا اس کو دوسری مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اس کے پاس جنت الماویٰ ہے۔ جب ڈھانپ رہا تھا سدرہ کو وہ جو ڈھانپ رہا تھا۔ نہ ٹیڑھی ہوئی نگاہ اور نہ بھٹکی۔ بے شک انہوں نے اپنے رب کی بہت بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

☆ ان آیات طیبات میں مفسرین کے کئی قول ہیں۔ النجم کے متعلق حسب ذیل اقوال وارد ہیں

(۱) نجم سے ثریا مراد ہے۔ (۲) نجم سے مطلقاً ستارے مراد ہیں۔

(۳) نجم سے وہ گھاس مراد ہے جس کی کوئی ساق نہ ہو اور اس کی بیلیں زمین پر پھیلتی ہوں۔ بعض کے نزدیک النجم سے قرآن مراد ہے۔

امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ النجم سے مراد حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ عرائس البیان میں ہے

قال جعفر بن محمد الصادق النجم محمد ﷺ۔ (عرائس البیان ج ۲ ص ۲۸۵)

☆ اور تفسیر معالم التنزیل میں ہے

وقال جعفر الصادق یعنی محمد ﷺ اذا نزل من السماء الی الارض لیلۃ المعراج۔ (تفسیر معالم التنزیل جز سادس ص ۲۱۲)

☆ اور صاحبکم سے مراد حضور سید عالم ﷺ ہیں اور شدید القوٰی سے مراد عام مفسرین کے نزدیک جبریل علیہ السلام ہیں لیکن حضرت امام حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شدید القوٰی اللہ تعالیٰ ہے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں ''فعن الحسن ان شدید القوٰی ھو اللّٰہ تعالٰی و جمع القوٰی للتعظیم ویفسر ذو مرۃ علیہ بذی حکمۃ ونحوہ مما یلیق ان یکون وصفالہ عزوجل۔'' (تفسیر روح المعانی پ ۲۷، ص ۴۴)

☆ اسکے بعد ''استوٰی'' اور ''ھو'' اور ''دنا'' اور ''فتدلّٰی'' اور ''کان'' اور ''اوحی'' کی ضمیریں اسی طرح اسکے بعد آنیوالی مرفوع اور منصوب ضمیریں عام مفسرین نے حضور ﷺ اور حضرت جبریل کی طرف راجع کیں جسکا مفاد یہ ہے کہ حضور ﷺ کو جبریل علیہ السلام کی نزدیکی حاصل ہوئی اور حضور ﷺ نے معراج کی رات جبریل علیہ السلام کو دیکھا۔ صاحب روح المعانی نے اس نہج پر تفسیر کرنے کے بعد

فرمایاوفی الأیات اقوال غیر ما تقدم

☆ یعنی ان آیتوں میں بیان سابق کے علاوہ بھی اقوال ہیں پھر حضرت حسن کی ایک روایت وارد کی جس کو ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا

وجعل ابو حبان الضمیرین فی قوله تعالٰی (فَاسْتَوٰی وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی) علیه له سبحانه ایضا وقال ان ذٰلك علٰی معنی العظمة والقدرة والسلطان ولعل الحسن یجعل الضمائر فی قوله سبحانه (ثم دنا فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنٰی فاوحٰی الٰی عبده ما اوحٰی) له عزوجل ایضا وکذا الضمیر المنصوب فی قوله تعالٰی (ولقد راٰه نزلة اخرٰی) فقد کان علیه الرحمة یحلف بالله تعالٰی لقد راٰی محمد ﷺ ربه وفسردنوه تعالٰی من النبی ﷺ برفع مکانته ﷺ عنده سبحانه وتدلیه جل وعلابجذبه بشراشره الٰی جناب القدس ویقال لهذا الجذب الفناء فی الله تعالٰی عند المتالهین وارید بنزوله سبحانهٗ نوع من دنوه المعنوی جل شانه ومذهب السلف فی مثل ذٰلك ارجاع علمه الٰی الله تعالٰی بعد نفی التشبیه۔

☆ ابوحبان نے اللہ تعالیٰ کے قول فَاسْتَوٰی وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی میں دونوں ضمیریں (مستتر اور بارز) اس تقدیر پر کہ شدید القوٰی اور ذو مرۃ سے اللہ تعالیٰ مراد ہو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے ہیں اور ابوحبان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا استویٰ عظمت اور قدرت اور غلبہ کے معنی میں ہے اور غالباً امام حسن بصری بھی ثم دنا سے ما اوحی تک اللہ تعالیٰ کے قول میں سب ضمیریں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مانتے ہیں اور اسی طرح ولقد راٰہ نزلة اخرٰی میں ضمیر منصوب بھی اللہ تعالیٰ کے لئے کرتے ہیں کیونکہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ قسم کھا کر کہتے تھے کہ بیشک محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے اور حضور ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کے معنی انہوں نے یہ بیان کئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقام اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کے معنی انہوں نے یہ بیان کئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بہت بلند ہے اور حضور ﷺ کی طرف اللہ تعالیٰ کی تدلی کے یہ معنی بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو اپنی جناب اقدس کی طرف بالکل جذب فرمالیا اور اللہ والوں کے نزدیک اسی جذب کو فنا فی اللہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزول سے ایک طرح کا قرب معنوی مراد ہے اور ایسے مسائل میں سلف کا مذہب یہ ہے کہ وہ تشبیہ کی نفی کرتے ہوئے اس کے علم کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ اس کے بعد صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ ثم دنا فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنٰی کی ضمیروں کو (جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانا جائز ہے) اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف بھی لوٹانا جائز ہے۔ جیسا کہ امام حسن بصری سے ان ضمیروں کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ہونا مروی ہے اور اس تقدیر پر معنی یہ ہیں کہ پھر قریب ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ہونا مروی ہے اور اس تقدیر پر معنی یہ ہیں کہ پھر قریب ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے رب سبحانہٗ وتعالیٰ سے تو اللہ تعالیٰ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دو کمانوں کی مقدار ہوا یا اس سے زیادہ قریب ہوگیا اور اوحی الٰی عبدہ ما اوحی کی ضمیریں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ (تفسیر روح المعانی پ ۲۷ ص ۴۴، ۴۵) اس کے متصل صاحب روح المعانی فرماتے ہیں تو علمه شدید القوٰی سے وهو بالافق الاعلٰی تک قول خداوندی کے یہ معنی ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جبریل علیہ السلام نے سکھایا اور جبریل علیہ

السلام آسمان کے اونچے کنارے پر تھے۔ اس کے بعد ثم دنا فتدلّٰی کی ضمیریں اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں اور ولقد راٰہ کی ضمیر منصوب بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہے یعنی اس تقدیر پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قرب پھر زیادتی قرب کی طلب اور رؤیت خداوندی کا ثبوت ہوا۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ اس کی تائید بخاری کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو شریک بن عبد اللہ کے طرق سے حضرت انس سے مروی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں ودنا الجبار رب العزۃ فتدلّٰی حتّٰی کان منه قاب قوسین او ادنٰی یعنی جبار رب العزت قریب ہوا پھر اس نے زیادتی قرب کو طلب فرمایا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ سے دو کمانوں کی مقدار ہو گیا یا اس سے زیادہ قریب پھر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف وحی فرمائی جس میں پچاس نمازوں کی فرضیت شامل تھی۔ (روح المعانی پ ۲۷ ص ۴۵، بخاری شریف ج ثانی ص ۱۱۲۰، مسلم ج اول ص ۹۲)

☆ اس کے بعد صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ مثبتین رؤیت جیسے حبر امت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے علاوہ حضرات نے اس حدیث سے استدلال فرمایا۔

محاکمہ: بیان سابق اور عبارات منقولہ سے یہ امر واضح ہو گیا کہ سورۂ النجم کی آیاتِ مذکورہ معراج آسمانی کے بیان میں نازل ہوئی ہیں اور حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا قرب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ سے (بلا تشبیہ) دو کمانوں کی مقدار ہو گیا یا اس سے زیادہ نزدیک ہو گیا۔ حدیث شریف جو بخاری مسلم دونوں نے روایت کی ہے اس معنی کی مؤید ہے۔ یہ حدیث جس میں اللہ تعالیٰ کے "دنو" اور "تدلّٰی" کا بیان ہے بخاری شریف میں جلد دوم صفحہ ۱۱۲۰ اور مسلم شریف میں جلد اول ص ۹۲ پر موجود ہے اور تفسیر آیت میں جو اللہ تعالیٰ اور جبریل علیہ السلام کی طرف ضمیریں راجع کرنے کا اختلاف تھا حدیث شریف نے اس کا فیصلہ کر دیا کہ اس میں صاف موجود ہے ودنا الجبار رب العزۃ فتدلّٰی (جبریل نہیں) بلکہ جبار رب العزت حضور ﷺ سے قریب ہوا اور اسی نے زیادتی کو طلب فرمایا۔ الخ

ایک سوال کا جواب

☆ اگر کہا جائے کہ وہ تمام احادیث اس بیان کے خلاف ہیں جن میں وارد ہے کہ جبریل علیہ السلام نے اپنی اصلی صورت حضور ﷺ کو دکھائی تو اسکا جواب امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر کبیر میں یوں ارقام فرمایا ہے کہ حضور ﷺ کا جبریل علیہ السلام کو انکی اصلی صورت میں دیکھنا حق اور ثابت ہے لیکن کسی حدیث میں یہ وارد نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ النجم کی ان آیات میں رؤیت جبریل مراد لی ہے۔ یہاں تک کہ حدیث کی مخالفت لازم آ جائے۔ (تفسیر کبیر ج ہفتم ص ۳۴۷) معلوم ہوا کہ کسی قسم کا تعارض نہیں ہے۔

حدیث شریک پر کلام

☆ اگر اعتراض کیا جائے کہ روایت شریک پر محدثین نے طعن و تشنیع کی ہے امام مسلم نے ان کی حدیث روایت کر کے فرمایا "وقدم فيه شيئا واخر وزاد ونقص" اسی طرح دیگر محدثین نے اس روایت کو ساقط قرار دیا۔ اس لئے اس سے استدلال صحیح نہیں۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک حدیث جب طرق متعددہ اور اسانید مختلفہ سے روایت ہوتی ہے تو بسا اوقات اسی میں کمی بیشی واقع ہو

جاتی ہے جسکے بے شمار نظائر خود صحیحین میں موجود ہیں ایک حدیث افک ہی کو لے لیجئے بہت سی کمی بیشی آپ کو ملے گی اگر اس کمی بیشی کو مطلقاً اسباب طعن میں شمار کر لیا جائے تو طرقِ متعددہ سے مروی ہونیوالی احادیث میں سے شاید ہی کوئی حدیث صحت کے درجہ کو پہنچے۔

☆ پھر یہ کہ جب رجال حدیث سب ثقہ ہیں اور صحیحین نے اس کو روایت بھی کیا اسکے بعد کس بناپر اسے نا قابل احتجاج کہا جاتا ہے۔

☆ لطف کا مقام یہ ہے کہ معراج منامی ثابت کرنے والے اسی روایت شریک سے استدلال کرتے ہیں اور انہیں اس وقت محدثین کے یہ جملہ مطاعن فراموش ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس روایت پر طعن کرتے وقت انہیں بخاری و مسلم کی صحت کا پاس لحاظ بھی باقی نہیں رہتا۔ ہماری نظر میں روایت شریک قابل استدلال ہے۔ اس لئے کہ صحیحین نے اسے روایت کیا اور اس میں طعن و تشنیع کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ رہا یہ امر کہ معراج کا قبل البعثت ہونا اس حدیث میں مروی ہے جو خلاف اجماع ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعثت سے پہلے فرشتوں کا آنا اس حدیث میں مذکور ہے معراج قبل البعثت ہرگز مذکور نہیں۔ قبل البعثت فرشتے آئے تھے مگر ویسے ہی واپس چلے گئے۔ پھر کسی دوسری شب آئے۔ دیکھئے اسی حدیث میں ہے "فلم یرھم حتٰی اتوہ لیلۃ اخرٰی" یعنی وحی سے پہلے ایک رات فرشتے آکر چلے گئے پھر حضور ﷺ نے اس کے بعد انہیں نہ دیکھا یہاں تک کہ وہ کسی اور شب میں آئے اور وہ شب بعثت کے بعد ہے جیسا کہ اسی روایت شریک میں موجود ہے کہ فرشتوں نے آسمان اول پر دریافت کیا کہ "وقد بعث" کیا وہ مبعوث ہو گئے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا "نعم" ہاں مبعوث ہو گئے۔ امام ابن حجر فرماتے ہیں "فانہ ظاھر فی ان المعراج کان بعد البعثۃ" (فتح الباری ج ۱۳ ص ۴۱۰)

☆ یعنی اس سوال و جواب سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں بھی معراج بعد البعثت ہی کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مخالفات کی تطبیق اور طعن و تشنیع کا جواب بھی صاحب فتح الباری کے کلام سے ظاہر ہے۔ "من شاء الاطلاع فلیرجع الیہ" اس روایت سے جو لوگ معراج منامی پر استدلال کرتے ہیں ان کا جواب حدیث معراج پر کلام کے ضمن میں قارئین کرام نے پڑھ لیا ہوگا، اعادہ کی حاجت نہیں۔ مختصر یہ کہ حدیث شریک سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ "دنا فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنٰی" میں اللہ تعالیٰ کا قرب اور زیادتی قرب مراد ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اپنے حبیب ﷺ سے اتنا قریب ہوا کہ جیسے دو کمانوں کی مقدار ہوتی ہے یا اس سے بھی زائد۔ یہ قرب جبریل علیہ السلام کا نہیں بلکہ رب جبار کا ہے۔

قاب قوسین

☆ قاب مقدار کو کہتے ہیں، قوس کے معنی ہیں کمان۔ اس کی حقیقت کا علم تو اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ ہی کو ہے لیکن قرب کو قاب قوسین سے تعبیر فرمانے کی حکمت یہ ہے کہ عرب میں دستور تھا کہ دو سردار آپس میں معاہدہ کرتے تھے تو دونوں اپنی کمانوں کو ملا کر ایک تیر پھینکا کرتے تھے جو اس بات کی دلیل ہوتا تھا کہ دونوں آپس میں ایسے متفق ہیں جو تیر ایک کی کمان سے نکلا وہی دوسرے کی کمان کا قرار پایا۔ ایک کی جنگ دوسرے کی جنگ اور ایک کی صلح دوسرے کی صلح متصور ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے حبیب مکرم ﷺ کو اپنا وہ قرب عطا فرمایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صلح کرنا اللہ تعالیٰ سے صلح کرنا ہے۔

قرب حقیقی

☆ قاب قوسین او ادنیٰ میں جس قرب کا بیان ہے صوفیاء کرام اسے فنائے تام سے تعبیر کرتے ہیں اس کی تجلیات جب مقربین پر پڑتی ہیں تو وہ انوار صفات سے متصف ہو جاتے ہیں۔ حضور ﷺ کی کیا شان ہو گی؟ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا نہ بتا سکتا ہے۔

رؤیت باری تعالیٰ

☆ ولقد راٰہ نزلۃ اخرٰی ضمیر منصوب کا مرجع اللہ ہے۔ (دیکھئے روح المعانی پ ۲۷ ص ۴۶) اور معنی یہ ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا۔ حدیث شریف میں وارد ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا ایک مرتبہ دل کی آنکھ سے دوسری مرتبہ سر کی آنکھ سے۔ رواہ الطبرانی (روح المعانی پ ۲۷ ص ۴۶ مواہب اللدنیہ ج دوم ص ۳۷)

ایک اعتراض کا جواب

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں اگر کوئی کہتا ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ کو دیکھا تو وہ بات سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جو شخص کہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کو دیکھا ہے اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے رؤیت باری کے منکر ہیں بلکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سورۂ النجم کی اس آیت ولقد راٰہ نزلۃ اخرٰی کے متعلق سوال کیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا انما رایت جبریل متھبطا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس کی حدیث سے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رؤیت باری کی نفی ثابت ہوتی ہے۔ اسی لئے امام قسطلانی شارح بخاری نے فرمایا کہ حدیث میں جو "دنو" اور "تدلی" مذکور ہے وہ سورۂ النجم میں مذکور "دنو" اور "تدلی" کا غیر ہے کیونکہ سورۂ النجم میں جبریل علیہ السلام کا "دنو" اور "تدلی" اور رؤیت مراد ہے پھر مسلم شریف میں حضرت ابو ذر کی حدیث ہے جس میں وارد ہے کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا کہ حضور آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا نور انی اراہ وہ نور ہے۔ میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں؟ علاوہ ازیں سر اقدس کی آنکھ سے رب تعالیٰ کو دیکھنے کی نفی حدیث میں بھی وارد ہے۔ جیسا کہ روح المعانی وغیرہ میں موجود ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کے راوی حضرت عبد اللہ بن عباس ہیں نیز یہ کہ رؤیت زمان و مکان، مسافت، جہت اور احاطۂ مرئی کے بغیر ناممکن ہے۔ اگر رؤیت عینی کو ثابت کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے لئے معاذ اللہ جہت، زمان، مسافت اور محدودیت سب کچھ ثابت ہو جائے گا۔

☆ حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنین ہیں۔ انہوں نے بڑی شدت سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے رؤیت باری کا انکار فرمایا اور آیۂ قرآنیہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ اور مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ سے استدلال کیا۔

☆ جواباً گزارش ہے کہ رؤیت باری کے مسئلہ پر ہم ذرا تفصیل سے کلام کرنا چاہتے ہیں سب سے پہلے ان بے دین فلاسفہ کے

مسلک پر کلام کرتے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رویت کو محال قرار دیا ہے۔ اول تو اس بات کو ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ فلاسفہ نے کسی چیز کی رؤیت کیلئے جو شرطیں ضروری قرار دی ہیں انکا ضروری ہونا عادتاً ہے عقلاً نہیں۔ یعنی عادت اسی طرح جاری ہے کہ مثلاً جہت مقابلہ زمان ومکان کے بغیر کسی چیز کا دیکھنا متحقق نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ خرق عادت کے طور پر ان شرائط کے بغیر بھی رؤیت کو واقع کرے اور معراج کی رات حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی رؤیت خرق عادت ہی کے طریقے پر ہوئی ہے۔ لہٰذا کوئی اعتراض وارد نہ ہوا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

☆ اگر اللہ تعالیٰ کا دیکھنا ممکن ہوتا تو جب موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا رب ارنی انظر الیک تو اللہ تعالیٰ لن ترانی کے ساتھ جواب نہ دیتا۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت امکان رؤیت باری تعالیٰ کی روشن دلیل ہے اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ سوال اس بات کی دلیل ہے کہ وہ رؤیت باری تعالیٰ کے امکان کا اعتقاد رکھتے تھے اگر اللہ تعالیٰ کا دیکھنا محال مانا جائے تو یہ اعتقاد گمراہی اور ضلالت قرار پائے گا کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہو اس کو ممکن ماننا سخت گمراہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام جو اللہ تعالیٰ کے کلیم اور اولوالعزم رسول ہیں۔ کس طرح گمراہی کا اعتقاد رکھ سکتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا دیکھنا ممکن ہے ورنہ موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام پر (معاذ اللہ) گمراہی اور ضلالت کا الزام عائد ہوگا اور الزام قطعاً باطل ہے۔ لہٰذا اس کا محال ہونا بھی باطل ہوا۔ وللہ الحمد!

☆ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا "وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" قیامت کے دن ایمان والوں کے چہرے اپنے رب کو دیکھ کر تر و تازہ ہوں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی رؤیت محال ہو تو قیامت کے دن مومن کیسے دیکھیں گے؟

☆ اس کے بعد قرآن کریم کی ان آیتوں پر کلام کرتا ہوں جن سے بظاہر رؤیت باری تعالیٰ کی نفی ثابت ہوتی ہے۔

پہلی آیت

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ.

☆ آنکھیں اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ سب آنکھوں کا ادراک فرماتا ہے۔ وہ لطیف و خبیر ہے۔ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی رؤیت کی نفی نہیں بلکہ ادراک کی نفی ہوتی ہے اور ادراک کے معنی رؤیت نہیں بلکہ ادراک احاطہ کو کہتے ہیں اور احاطہ کے معنی ہیں کسی چیز کو گھیر لینا۔ لہٰذا آیت کریمہ کے معنی ہوئے تمام آنکھیں اللہ تعالیٰ کو گھیرے میں نہیں لے سکتیں اور اللہ تعالیٰ سب آنکھوں کو محیط ہے اور سب کو اپنے علم وقدرت کے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ لہٰذا اس آیہ مبارکہ سے اس رؤیت کی نفی ثابت ہوئی جس سے اللہ تعالیٰ کا احاطہ ہو جائے لیکن رؤیت بلا احاطہ کی نفی اس سے ثابت نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک اس حدیث مبارکہ میں ثنائے الٰہی کے احصاء اور احاطہ کی نفی ہے معاذ اللہ مطلق ثنا کی نفی نہیں۔ ورنہ

لازم آئے گا کہ نعوذ باللہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی کوئی ثنا نہیں کی۔ پس ظاہر ہو گیا کہ جس طرح احاطہ ثنائے الٰہی کی نفی سے مطلق ثنائے الٰہی کی نفی ثابت نہیں ہو سکتی اسی طرح رؤیت بالاحاطہ کی نفی سے مطلق رؤیت کی نفی بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔

دوسری آیت

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ۔

☆ کسی بشر کے لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے لیکن وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے۔ اس آیت سے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دیدارِ الٰہی کی نفی نہیں ہوئی کیونکہ سیاقِ آیت نفی رؤیت کے لئے نہیں بلکہ بے حجاب نفی کلام کے لئے ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر سے بے حجاب کلام نہیں کرتا۔ رہا یہ امر کہ بغیر کلام کے اپنا دیدار بھی کسی کو دکھاتا ہے یا نہیں تو مضمون آیت کو اس سے کوئی تعلق نہیں اور کلام اس سے ساکت ہے۔

☆ علاوہ ازیں یہ حکم بشر من حیث ھو بشر کے لئے ہے اور جب انسلاخ عن البشریت کا حال طاری ہو اور بشریت کا کوئی حجاب باقی نہ رہے تو پھر یہ حکم نہیں۔ حضور ﷺ کو جب دیدارِ الٰہی ہوا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس وقت باوجود بشریت مقدسہ کے منسلخ عن البشریت تھے یعنی بشریت مقدسہ موجود تھی مگر قدرتِ ایزدی سے اوصاف اور خواص بشریت کا ظہور نہ تھا اور حجاب بشریت اٹھ چکا تھا۔ لہٰذا آیت مبارکہ سے حضور ﷺ کے حق میں رؤیت باری تعالیٰ کی نفی پر استدلال صحیح نہ ہوا۔ ملاحظہ فرمائیے (تفسیر عرائس البیان ج ۲ ص ۲۳۶ مطبوعہ نول کشور لکھنو)

☆ اب ان احادیث پر کلام کرتا ہوں جن سے نفی رؤیت باری تعالیٰ ثابت ہوتی ہے۔ منکرین رؤیت نے ان حدیثوں کو تو پیش کیا جن سے وہ بزعم خود رؤیت کی نفی سمجھتے ہیں لیکن ان احادیث کو دیکھا تک نہیں جن سے رؤیت باری تعالیٰ کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ دیکھئے طبرانی شریف میں موجود ہے "عن ابن عباس رضي الله عنهما انه يقول ان محمدا ﷺ رأى ربه مرتين مرة ببصره ومرة بفؤاده رواه الطبراني في الاوسط۔"

☆ امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ شارح بخاری شریف مواہب اللدنیہ میں اسی حدیث کے اسناد کے متعلق فرماتے ہیں "رجاله رجال الصحيح خلا جهور بن المنصور الكوفي وجهور بن المنصور قد ذكره ابو حبان في الثقات" "ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے بے شک ابن عباس فرماتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ نے دو مرتبہ اپنے رب کو دیکھا۔ ایک مرتبہ سر اقدس کی آنکھ سے اور ایک مرتبہ اپنے قلب مبارک کی آنکھ سے۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور اس کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں سوائے جمہور بن المنصور کوفی کے۔ ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔

رؤیت عینی اور رؤیت قلبی

☆ اس میں شک نہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نفی رؤیت باری میں حدیث مروی ہے اور دیگر صحابہ

کرام سے ثبوت رؤیت کے بارے میں بھی حدیثیں وارد ہوئی ہیں اور وہ تین قسم کی حدیثیں ہیں۔ ایک وہ ہے جس میں مطلق رؤیت کا ذکر ہے دوسری وہ ہے جس میں رؤیت عینی کی تصریح ہے تیسری وہ جس میں رؤیت قلبی کا ذکر وارد ہے۔ اسی وجہ سے مسئلہ رؤیت میں اختلاف واقع ہوا۔ بعض کا قول ہے کہ حضور علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو قلب مبارک کی آنکھ سے دیکھا اور بعض نے کہا سر اقدس کی آنکھ سے دیکھا اور بعض کا مذہب ہے کہ سر اقدس اور قلب مبارک کی آنکھوں سے دیکھا۔

رؤیت عینی کے قائلین

☆ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں "ثم ان القائلین برؤیۃ اختلفوا فمنھم من قال انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام رای ربہ سبحانہ بعینہ و روی ذلک ابن مردویۃ عن ابن عباس وھو مروی ایضا عن ابن مسعود و ابی ھریرۃ و احمد بن حنبل۔"

☆ یعنی پھر قائلین رؤیت اس مسئلہ میں مختلف ہیں۔ بعض کا مذہب ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کو اپنے سر اقدس کی آنکھ سے دیکھا اور بعض کہتے ہیں کہ قلب مبارک کی آنکھ سے دیکھا۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس سے سر اقدس کی آنکھ سے دیکھنے کو روایت کیا اور یہی قول حضرت "ابن مسعود" اور "ابو ہریرہ" سے مروی ہے اور امام "احمد بن حنبل" بھی اسی کے قائل ہیں رضی اللہ عنہم (روح المعانی پ ۲۷ ص ۴۶) اس کے بعد صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ بعض کا قول ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کو دل کی آنکھ سے دیکھا۔ یہ قول حضرت ابوذر اور محمد بن کعب قرظی سے منقول ہے۔ پھر آگے چل کر صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ بعض حضرات اس طرف گئے ہیں کہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو ایک دفعہ سر کی آنکھ سے اور ایک بار دل کی آنکھ سے دیکھا۔

☆ صاحب روح المعانی نے صوفیائے کرام کا مذہب نقل فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ معظم صوفیہ کا مذہب یہی ہے کہ وثم دنا فتدلّٰی میں اللہ تعالیٰ کا قرب اور طلب زیادتی قرب کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح "دنو" اور "تدلی" اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ السلام سے قرب اور زیادہ قرب طلب فرمایا اور اسی طرح وہ حضور ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ کے دیدار کو بھی ثابت کرتے ہیں۔ حضرت سہیل بن عبداللہ ستری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل فرمایا کہ حضور ﷺ اپنی ذات پاک کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوئے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے رہے۔ اس کے بعد صاحب روح المعانی اپنا مسلک بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرا مذہب بھی یہی ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنے رب سبحانہ وتعالیٰ کا دیدار کیا اور اللہ تعالیٰ اپنے حبیب علیہ السلام سے قریب ہوا اور بہت زیادہ قریب ہوا جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔ (روح المعانی پ ۲۷ ص ۴۷)

ثبوت رؤیت کی حدیثیں

حدیث نمبر۱: عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھما یقول ان محمدا ﷺ رای ربہٗ مرتین مرۃ ببصرہٖ ومرۃ بفؤادہٖ رواہ الطبرانی فی الاوسط باسناد صحیح۔ (مواہب اللدنیہ ج ۲ ص ۳۷)

☆ ''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے تھے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کریم کو دو مرتبہ دیکھا ایک مرتبہ اپنی ظاہری آنکھ سے اور دوسری مرتبہ اپنے قلب مبارک کی آنکھ سے۔''

حدیث نمبر ۲: عن ابن عباس قال اتعجبون ان تکون الخلة لابراهیم والکلام لموسیٰ والرؤیة لمحمد ﷺ اخرجه النسائی باسناد صحیح وصححه الحاکم ایضا من طریق عکرمه. (مواہب ج ۲ ص ۳۷)

☆ ''کیا تم تعجب کرتے ہو اس بات سے کہ خلت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ہو اور کلام موسیٰ علیہ السلام کے لئے اور رویت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لئے۔''

حدیث نمبر ۳: عن انس قال رأی محمد ربه رواه ابن خزیمة باسناد قوی. (مواہب ج ۲ ص ۳۷)

☆ ''حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا۔''

☆ امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ آپ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے اللہ تعالیٰ کا دیکھنا ثابت کرتے ہیں تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث کا کیا جواب دیں گے، وہ فرماتی ہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا تو حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ میں حضرت عائشہ کی حدیث کا جواب رسول اللہ ﷺ کی حدیث مبارک سے دوں گا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا رأیت ربی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول مبارک حضرت عائشہ کے قول سے بہت بڑا اور وزنی ہے۔ (فتح الباری)

☆ اور امام احمد ہی سے مروی ہے جب آپ سے دریافت کیا جاتا کہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟ تو آپ فرماتے راہ راہ حتّٰی انقطع نفسہٗ ہاں ہاں دیکھا ہے دیکھا ہے۔ مسلسل اسی طرح فرماتے رہے یہاں تک کہ آپ کا سانس منقطع ہو جاتا۔ (روح المعانی ماخوذ از فتح الملہم ج ۱ ص ۳۳۸)

☆ انور شاہ کشمیری صاحب فیض الباری سورۃ النجم کی تفسیر میں لکھتے ہیں "والرؤیة فیها عندی رویة ربه جل سبحانهٗ کما اختارهٗ احمد رضی اللہ عنہ (فیض الباری ج ۲ ص ۲۰)

☆ یعنی میرا مسلک یہ ہے کہ سورۃ النجم میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے اللہ تعالیٰ کی رویت مراد ہے جیسا کہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب ہے۔

حدیث ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

☆ حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضور ﷺ سے پوچھا حضور! آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا؟ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا نور انی اراہ میں نے اسے جہاں بھی دیکھا وہ نور ہی نور ہے۔ اسی طرح ان کی دوسری حدیث ہے جو اس کے بعد مسلم جلد اول میں مذکور ہے۔ حضرت ابو ذر فرماتے ہیں کہ میرے سوال رویت کے جواب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا

رایت نورا میں نے نوردیکھا۔ ان دونوں حدیثوں میں لفظ نور سے نور کے متعارف معنی مراد نہیں کیونکہ نور ایک عرض ہے۔ (معاذاللہ) اللہ تعالیٰ عرض و جوہر سے پاک ہے بلکہ یہاں نور سے تجلی ذات مراد ہے اور معنی یہ ہیں کہ میں نے جہاں دیکھا تجلی ذات کو دیکھا۔

☆ حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب رؤیت باری تعالیٰ کے عدم امکان پر آیۂ کریمہ "لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ" سے استدلال کیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا ویحک ذلک تجلّٰی بنورہ الذی ھو نورہٗ. تجھ پر افسوس ہے۔ عدم ادراک تو اس وقت ہے جب کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس نور کے ساتھ تجلی فرمائے جو اس کا نور ہے یعنی غیر متناہی ظہور کی تجلی فرمائے جس کا ادراک اور احاطہ ناممکن ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رؤیت تو غیر متناہی ظہور کا احاطہ نہیں ہے جس کے عدم امکان کو آیت "لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ" سے ثابت کیا جائے۔ (روح المعانی پ ۲۷ ص ۴۵)

تطبیق

☆ جن احادیث میں رؤیت کی نفی وارد ہے وہ سب اس رؤیت پر محمول ہیں جو احاطہ کے ساتھ ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا آیت کریمہ "لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ" سے استدلال فرمانا اس کا روشن قرینہ ہے کیونکہ ادراک احاطہ کو کہتے ہیں احاطہ کی نفی مطلق دیکھنے کی نفی کو مستلزم نہیں۔ اسی طرح رؤیت عینی کی نفی میں جو حدیثیں آئی ہیں ان سب کا مفاد بھی نفی احاطہ ہے جمعا بین الادلۃ کیونکہ بیان سابق میں حضور علیہ السلام کے لئے اللہ تعالیٰ کی رؤیت عینی کے ثبوت میں صاف اور واضح حدیثیں (جن کی سندیں صحیح اور نہایت قوی ہیں) قارئین کرام کے سامنے ہم پیش کر چکے ہیں۔ نفی اثبات کی معارض ہے اب رفع تعارض کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ نفی کی تمام حدیثیں رؤیت بالاحاطہ پر حمل کی جائیں ورنہ تعارض رفع نہ ہو سکے گا اور اگر اس طرح رفع تعارض نہ کیا جائے تو پھر اصولی طور پر ہماری طرف سے وہی جواب ہوگا جو صاحب تفسیر مظہری نے دیا ہے وہ فرماتے ہیں "قلت وقول ابن مسعود وعائشة شهادة على النفي و شهادة الاثبات ارجح." (تفسیر مظہری ج ۹ پ ۲۷ ص ۱۰۷)

☆ یعنی (ثبوت رؤیت کے مقابلہ میں) حضرت ابن مسعود اور حضرت عائشہ کا قول شہادت علی النفی ہے اور ظاہر ہے کہ شہادت علی الاثبات راجح ہوتی ہے۔ لہٰذا نفی رؤیت کا قول مرجوح قرار پائے گا۔

☆ اس کی نظیر حضور سید عالم علیہ السلام کا کعبہ مطہرہ میں نماز پڑھنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے (خانہ کعبہ کے اندر) نماز پڑھنے کی نفی کرتے ہیں اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو ثابت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھی۔ نفی اور اثبات دونوں کی حدیثیں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ محدثین نے اس تعارض کو اسی طرح اٹھایا کہ اثبات نفی پر راجح ہے۔ لہٰذا ثبوت کی حدیث نفی کی حدیث پر راجح ہوگی۔

رؤیت قلبی کے معنی

☆ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رؤیت قلبی کے یہ معنی ہیں کہ حضور علیہ السلام کے قلب مبارک میں ایک ایسا علم حاصل ہو گیا جسے رؤیت قلبی

سے تعبیر کیا گیا یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب مبارک پر اللہ تعالیٰ نے ایسی تجلی فرمائی جس تجلی کی وجہ سے قلب مبارک میں رؤیت جیسی حالت پیدا ہو گئی لیکن اہل حق کے نزدیک رؤیت قلبیہ سے یہ مراد ہے کہ چشم سر کی بینائی قلب مبارک میں رکھ دی گئی جو بینائی سر اقدس کی مبارک آنکھ کو حاصل تھی بالکل بلا تفاوت بعینہٖ وہی بینائی قلب مطہر کو حاصل ہو گئی۔ قلب مبارک ہو بہو چشم ظاہری کی طرح دیکھتا تھا۔ کیونکہ دیکھنے کے لئے عقلاً ظاہری آنکھ کا ہونا شرط نہیں۔ اللہ تعالیٰ جس عضو میں چاہے آنکھ کی طرح بینائی پیدا کر سکتا ہے اگرچہ عادت الٰہیہ اسی طرح جاری ہے کہ آنکھ ہی میں بینائی کو پیدا فرماتا ہے لیکن وہ خرق عادت پر بھی قادر ہے اور بلاشبہ اس قادر قیوم نے خرق عادت کے طور پر شب معراج اپنے حبیب ﷺ کے قلب اطہر میں چشم مبارک کی بینائی پیدا فرما دی اور حبیب ﷺ نے سر مبارک اور قلب اطہر دونوں سے اپنے رب کریم کو یکساں دیکھا۔ دیکھئے امام قسطلانی شارح بخاری مواہب اللدنیہ شریف میں فرماتے ہیں "ثم ان المراد برؤية الفؤاد رؤية القلب لا مجرد حصول العلم لانه ﷺ كان عالما بالله على الدوام بل مراد من اثبت لهٗ انه راٰه بقلبه ان الرؤية التى حصلت لهٗ خلقت له فى قلبه كما تخلق الرؤية بالعين لغيره والرؤية لا يشترط لها شىء مخصوص عقلا ولو جرت العادة بخلقها فى العين. انتہٰی (مواہب اللدنیہ ج ۲ ص ۳۷)

☆ "پھر (مخفی نہ رہے کہ) "رؤیت فواد" سے "دل کا دیکھنا" مراد ہے۔ نہ یہ کہ صرف علم حاصل ہو گیا کیونکہ حضور ﷺ علی الدوام عالم باللہ ہیں جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے لئے رؤیت قلبیہ ثابت کی ہے ان کی مراد یہ ہے کہ جس طرح کسی کی آنکھ میں بینائی پیدا کی جاتی ہے اسی طرح حضور ﷺ کے قلب مبارک میں بینائی پیدا کر دی گئی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ کی رؤیت حاصل ہوئی اور رؤیت کے لئے عقلاً کسی خاص جزو بدن کا ہونا یا کسی مخصوص شے کا پایا جانا قطعاً ضروری نہیں۔ اگرچہ عادتاً بینائی آنکھ میں ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ خرق عادت کے طور پر آنکھ کے علاوہ کسی اور عضو میں بینائی پیدا کر دے۔

☆ علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تقریر اس امر کی روشن دلیل ہے کہ رؤیت قلبیہ اور رؤیت عینیہ دونوں کا مفاد ایک ہے۔ وللہ الحمد!

مسئلہ رؤیت میں حرفِ آخر

☆ امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے مواہب اللدنیہ میں استاذ عبدالعزیز مہدی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بیان نقل کیا ہے۔ جس کا اردو خلاصہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

☆ "حضور ﷺ جب سفر معراج سے واپس تشریف لائے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہر ایک کو اس کی عقل اور مرتبہ کے موافق حالات بتائے۔ کفار کو جو سب سے نیچے اور انتہائی پستی میں تھے صرف عالم اجسام کی باتیں بتائیں۔ مثلاً مسجد اقصیٰ کا حال جو انہیں پہلے سے معلوم تھا یا راستے میں قافلہ کے حالات بتائے جو جلد ہی ان کے سامنے آ گئے جن کی وجہ سے ان کے دل اس واقعہ میں حضور ﷺ کی تصدیق کے لئے مجبور ہو گئے اس کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے (واقعاتِ معراج بیان کرنے میں) کچھ ترقی فرمائی اور آسمانوں پر تشریف لے جانے اور وہاں کے عجائب و غرائب کا مشاہدہ فرمانے کو بیان فرمایا لیکن ہر صحابی کو اس کے حسب حال خبر دی۔ جو جس

مرتبہ کا تھا اس سے اسی کے لائق کلام فرمایا اور ساتویں آسمان تک بغیر تنگی اور مزاحمت کے حالات بیان فرمائے۔"

☆ (واقعات بیان فرماتے ہوئے) حضور علیہ ﷺ جب مقام جبریل علیہ السلام پر پہنچے تو افق مبین کی بات بیان فرمائی اور اس کے مافوق مقام "دنا فتدلّٰی" اور "فاوحی الی عبدہٖ ما اوحی" کا وہ بلند مقام جہاں مخلوقات کے تصورات بھی ختم ہو جاتے ہیں اور ما سوا اللہ کی تمام صورتیں ساقط ہو جاتی ہیں، اس بارگاہِ اقدس کی خبر بھی صحابہ کرام کو (ان کے مرتبہ اور مقام کے لائق) دی۔ یہ بیان معراج گویا سننے والے صحابہ کرام کے لئے بمنزلہ معراج تھا۔ اس لئے ہر ایک نے اس سے اپنے مرتبہ کے موافق حصہ پایا۔ کوئی مقام جبریل تک رہا کوئی رؤیت فواد اور بصیرت تک پہنچا اور کسی کو رؤیت عینی کے بیان کا حصہ نصیب ہوا۔ اس لئے کسی نے کہا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا اس نے بھی سچ کہا کسی نے کہا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اس کی بات بھی حق ہے۔ پھر جس کے حصہ میں رؤیت قلبی کا بیان آیا اس نے رؤیت قلبی کو بیان کیا اور جس نے رؤیت عینی کی بات سنی اس نے صاف کہا کہ محمد مصطفیٰ علیہ ﷺ نے اپنے سر اقدس کی مبارک آنکھوں سے اپنے رب تعالیٰ کو دیکھا۔ مختصر یہ کہ ہر ایک نے اپنے مرتبے اور مقام کی بات کی اور یقیناً سچی بات کی۔ جب یہ حقیقت واضح ہوگئی تو بخوبی معلوم ہو گیا کہ رؤیت جبریل علیہ السلام اور رؤیت باریت تعالیٰ نیز رؤیت قلبیہ اور رؤیت عینیہ کے جملہ مقامات اور ان کے بارے میں اختلاف اقوال سب صحیح ہیں۔ عبداللہ بن مسعود، عائشہ صدیقہ، کعب قرظی، ابوذر غفاری، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اجمعین سب حق پر ہیں۔ (مواہب اللدنیہ جلد ثانی ص ۳۷، ۳۸)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شاہد ہونا

☆ امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو شاہد بنا کر بھیجا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے "يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا۔" (س احزاب آیت ۴۵)

ترجمہ☆ "اے پیارے نبی (علیہ ﷺ) ہم نے آپ کو شاہد اور مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا۔"

☆ چونکہ شاہد کے لئے مشاہدہ ضروری ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہفت سماوات اور وہاں کے موجودات ومخلوقات کا مشاہدہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کرایا۔ دوزخ وجنت سب کچھ دکھایا تا کہ دوستوں دشمنوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ جزا وسزا تیار کر رکھی ہے وہ اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دکھائے۔ جب تمام موجودات کا مشاہدہ کرا دیا پھر اپنی بارگاہِ اقدس میں بلا کر اپنا جمال بھی دکھایا۔ زمینوں کا مشاہدہ بھی حضور ﷺ نے فرمایا۔ حدیث شریف میں وارد ہے "ان اللّٰه زوىٰ لى الارض فرايت مشارقها و مغاربها" اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو سمیٹ لیا۔ میں نے اس کی مشرقوں اور مغربوں کو دیکھا بلکہ ساری دنیا کو حضور ﷺ نے ملاحظہ فرمایا۔ حدیث شریف میں وارد ہے "ان اللّٰه قد رفع لى الدنيا فانا انظر اليها والىٰ ما هو كائن فيها الىٰ يوم القيٰمة كانما انظر الىٰ كفى هذا رواه الطبرانى عن ابن عمر رضى اللّٰه عنهما۔ (مواہب اللدنیہ ج ۲ ص ۱۹۲)

☆ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے لئے ساری دنیا کو ظاہر فرما دیا تو میں ساری دنیا کو دیکھ رہا ہوں اور جو کچھ اس میں قیامت تک

ہونے والا ہے سب کچھ دیکھ رہا ہوں جس طرح اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھ رہا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ اللہ نے شب معراج سب چیزیں دکھا کر اپنی ذات پاک بھی اپنے حبیب ﷺ کو دکھادی تا کہ ان کا مشاہدہ ہونا متحقق ہو جائے۔

فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی

☆ پس وحی کی اللہ نے اپنے بندے (محمد مصطفیٰ ﷺ) کی طرف وہ جو وحی کی (خازن)۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ وحی فرمائی وہ بلاواسطہ ہے۔ روح البیان میں ہے قال جعفر الصادق فاوحٰی الٰی عبدہٖ ما اوحٰی بلا واسطۃ فیما بینہٗ وبینہ سرا الٰی قلبہٖ. (روح البیان ج ۹ ص ۲۲۱)

☆ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے عبد مقدس ﷺ کی طرف بلاواسطہ وحی فرمائی جو پوشیدہ طور پر ان کے قلب اطہر پر واقع ہوئی۔

☆ وہ وحی کیا تھی؟ اللہ تعالیٰ نے اسے لفظ ''ما'' سے تعبیر فرما کر اس حقیقت کو ظاہر فرمادیا کہ وہ ایسی عظیم الشان وحی تھی جو تفصیل سے بے نیاز ہے۔ اجمالی طور پر ہم اس مقام پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ دین و دنیا کی جسمانی و روحانی، ظاہری و باطنی نعمتیں اور علوم و معارف جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو اپنی حکمت کے مطابق دے سکتا تھا وہ سب کچھ دے دیا۔ البتہ ہر نعمت اور ہر علم و حکمت کا ظہور اپنے اپنے وقت پر ہوا اور ہوتا رہے گا۔ دیکھئے شفاعت بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دی گئی اور اس میں آج تک کسی مسلمان نے اختلاف نہیں کیا لیکن دنیا جانتی ہے کہ اس کے ظہور کا وقت روز محشر ہوگا۔ معلوم ہوا کہ اگر کسی وقت کسی کمال کا ظہور نہ ہو تو اس عدم ظہور سے عدم وجود لازم نہیں آتا۔

☆ یوں کہنے کے لئے تو یہ بات بہت معمولی اور مختصر سی نظر آتی ہے مگر اس کی گہرائی پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ منکرین کمالاتِ نبوت کے بے شمار اعتراضات کا جواب یہی معمولی سی بات ہے۔

حدیث شریک کی طرف مراجعت

☆ ہمارے ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ حدیث شریک پر کلام کرتے ہوئے ہم اتنی دور نکل آئے۔ ہم نے یہ بتانا تھا کہ بخاری و مسلم میں روایت شریک حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے واقعہ معراج میں مروی ہے۔ ''ودنا الجبار رب العزۃ فتدلّٰی حتّٰی کان منہ قاب قوسین او ادنٰی۔'' (بخاری ج ۲ ص ۱۱۲۰، مسلم ج اول ص ۹۲) ''پھر قریب ہوا جبار رب العزۃ اور اس نے زیادہ نزدیکی طلب کی یہاں تک کہ ہو گیا وہ رب العزۃ حضور ﷺ سے مقدار دو کمانوں کی یا اس سے بھی زیادہ قریب ہوا۔ اس حدیث میں نزدیک ہونے کا اور زیادہ نزدیکی طلب کرنے کا اور دو کمانوں کی مقدار یا اس سے زیادہ نزدیکی کا فاعل ''جبار رب العزۃ'' عبارۃ النص میں مذکور ہے اور ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ حدیث بیان معراج میں ہی وارد ہے جو لوگ اس حدیث کو نا قابل احتجاج ثابت کرنے کیلئے اعتراضاً یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسمیں بہت سی کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر ہے اور ساتھ ہی ثقات کی بھی مخالفت اس میں پائی جاتی ہے۔ اسکا تفصیلی جواب بیان سابق میں ناظرین کرام نے پڑھ لیا ہوگا امام ابن حجر عسقلانی شارح بخاری نے فتح الباری میں اس بحث کو صاف کر دیا ہے۔

☆ حدیث شریک جب اعتراضات سے بے غبار ہو گئی تو یہ امر متعین ہو گیا کہ جس طرح سورۂ النجم کی ابتدائی آیات واقعۂ معراج کے بیان میں ہیں اسی طرح حدیث شریک بھی اسی واقعۂ معراج میں وارد ہوئی ہے لہٰذا ضروری ہو گیا کہ حدیث شریک کی منقولہ عبارت ودنا الجبار رب العزة فتدلّٰی حتّٰی کان منه قاب قوسین او ادنٰی کو سورۂ النجم کی آیت "ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی" کی تفسیر قرار دیا جائے اور جس طرح حدیث شریک میں تینوں فعلوں کا فاعل جبار رب العزة ہے اسی طرح سورۂ النجم میں بھی "دَنَا فَتَدَلّٰی" اور "کَانَ" تینوں فعلوں کی ضمیریں رب العزة کی طرف لوٹائی جائیں۔ امام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث شریک پر خطابی کے اعتراضات کے مسکت جوابات دیتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں "وقد اخرج الاموی فی مغازیه و من طریق البیهقی عن محمد بن عمرو عن ابی سلمة عن ابن عباس فی قوله تعالٰی و لقد راٰه نزلة اخرٰی. قال دنا منه ربه وهٰذا سند حسن وهو شاهد قوی لروایة شریک. (انتہیٰ فتح الباری ج ۱۳ ص ۴۱۳)

☆ "اموی نے اپنے مغازی میں اخراج کیا اور بیہقی کے طریقہ سے محمد بن عمرو سے مروی ہے۔ وہ ابوسلمہ سے اور ابوسلمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے راوی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قول "وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی" کے بارے میں کلام کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا "نزدیک ہوا حضرت محمد ﷺ سے رب تعالیٰ ان کا" اور یہ سند حسن ہے اور یہ روایت شریک کے لئے شاہد قوی ہے۔ انتہیٰ کلامہ۔ آگے چل کر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ خطابی کے ایک اور اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خطابی کا یہ قول بھی درست نہیں کہ شریک نے تدلی میں ثقات کی مخالفت کی ہے کیونکہ اس کی موافقت ذکر کر چکا ہوں۔

☆ پھر فرماتے ہیں "وقد نقل القرطبی عن ابن عباس انه قال دنی اللّٰه سبحانه وتعالٰی" (فتح الباری ج ۱۳ ص ۴۱۴)

☆ یعنی امام قرطبی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا وہ فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ نزدیک ہوا" انتہیٰ کلامہٗ۔

☆ الحمدللہ! اہل علم کیلئے یہ مسئلہ بالکل بے غبار ہو گیا اور بلا تشبیہ و تمثیل اللہ تعالیٰ کا اپنے حبیب ﷺ سے نزدیک ہونا اور زیادہ نزدیکی طلب فرمانا حتیٰ کہ قوسین کی مقدار یا اس سے بھی زیادہ نزدیک ہو جانا اچھی طرح ثابت ہو گیا اور سورۂ النجم کی آیات واضح ہو گئیں۔

وہم کا منشا

☆ جن لوگوں کو حدیث شریک میں وہم ہوا ان کے وہم کا اصل منشا یہ ہے کہ "دنو" "تدلی" کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہ جانا اس لئے وہم میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ "دنو" اور "تدلی" بہ نسبت نبی کریم ﷺ ہے۔ اللہ تعالیٰ تمثیل و تشبیہ سے پاک ہے۔

☆ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ معترضین حضرات نے صرف حدیث شریک ہی کو کیوں ہدف ملامت بنا لیا ہے حالانکہ دوسری متفق علیہ حدیثوں میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے افعال کی اسناد وارد ہیں جو بلا تاویل اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں ہو سکتے۔ دیکھئے حدیث میں وارد ہے "ینزل ربنا الی السماء" اور دوسری حدیث میں ہے "من تقرب بنی شبرا تقربت منه ذراعا." اب بتائیے اللہ تعالیٰ کا آسمان کی طرف نازل ہونا اور بالشت بھر اور ہاتھ کے قریب ہونا بلا تاویل کیونکر صحیح ہو سکتا ہے اور اگر یہاں تاویل جائز

ہے تو حدیث شریک میں کیوں نا جائز ہوئی۔

☆ الحمدللہ! ہماری اس تقریر سے روایت شریک بالکل بے غبار ہوگئی اور اس میں کوئی خدشہ باقی نہیں رہا۔

لفظ معراج

☆ معراج سیڑھی کو کہتے ہیں۔ ایک نورانی سیڑھی جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کا حبیب ﷺ بہتر جانتے ہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے قائم کی گئی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو آسمانی معراج براق پر نہیں بلکہ سیڑھی پر ہوئی ہے۔ جیسا کہ ابن اسحٰق نے روایت کیا اور امام بیہقی نے بھی دلائل النبوۃ میں روایت فرمایا۔ (زرقانی ج ۶ ص ۳۳)

☆ فقیر راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اگر حضور ﷺ براق کی پشت پر سوار ہو کر سیڑھی پر صعود فرمائیں تو اس میں حضور سید عالم ﷺ کے لئے مزید اکرام ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے براق اور سیڑھی دونوں کا ہونا امر بعید نہیں۔

تکرار شق صدر مبارک

☆ علامہ تلمسانی نے فرمایا کہ حضور ﷺ کا شق قلب مبارک دو مرتبہ ہوا۔ ایک مرتبہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دائی حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تھے بچپن کے زمانہ میں تاکہ حظ شیطانی نکل جائے اور دوسری مرتبہ اسراء کے وقت تاکہ عالم ملکوت بالخصوص دیدارِ الٰہی کیلئے حضور ﷺ کی قوت بالفعل ہو جائے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ نزولِ قرآن کے قریب بھی شق صدر مبارک واقع ہوا۔ بعض نے کہا کہ بچپن میں قلب مبارک کا شق صدر ہونا اس لئے تھا کہ حضور ﷺ کا قلب اطہر قلوب انبیاء علیہم السلام کی مثل ہو جائے اور ایک مرتبہ لیلۃ المعراج میں تاکہ قلب انور قلوب ملائکہ کی طرح ہو جائے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں کہتا ہوں کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ کا شق صدر مبارک نزولِ وحی سے پہلے ہوا تاکہ قلب مبارک رسولوں کے دلوں کیطرح ہو جائے۔

قافلوں کی حدیثیں

☆ بیانِ سابق میں حدیث عیر معالم التنزیل ج ۴ ص ۱۱۲ سے نقل کر چکا ہوں۔ یہ حدیث طبرانی، ابن مردویہ، بیہقی، ابن ابی حاتم، ابو نعیم وغیرہ نے بہت طول کے ساتھ روایت کی ہے۔ بعض مصنفین نے عدم تدبر کے باعث قافلوں کی حدیثوں میں تخالف سمجھا ہے لیکن دراصل کوئی تخالف نہیں۔ خاتمۃ المحدثین امام زرقانی رحمۃ اللہ علیہ زرقانی شریف ج ۶ ص ۱۲۶ پر فرماتے ہیں "ولا خلف لانہ مر بعیرین بل بثلاثۃ فکان احدھا تاخرت." (مواہب اللدنیہ ج ۲ ص ۴۰)

☆ یعنی احادیث "عیر" میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ حضور ﷺ دو نہیں بلکہ تین قافلوں سے گزرے۔ جن سے ایک قافلہ (جو حسب پیش گوئی حضور ﷺ شام کو غروب شمس سے پہلے مکہ میں آنے والا تھا) پیچھے رہ گیا تھا (جس کی وجہ سے سورج روک دیا گیا اور جب تک وہ قافلہ مکہ معظمہ میں داخل نہ ہو گیا سورج غروب نہ ہوا)

☆ تینوں قافلوں کا اجمالی تذکرہ امام زرقانی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرماتے ہیں

وقد روی الطبرانی وابن مردویۃ عن ام ھانی قالوا اخبرنا عن عیرنا فقال اتیت علٰی عیر بنی فلان بالروحاء قد ضلوا

ناقة لهم فانطلقوا فی طلبها فانتهیت الٰی رحالهم فلیس بها منهم احد واذا قدح ماء فشربت منه ثم انتهیت الٰی عیر بنی فلان فیها جمل علیه غررتان غرارة سوداء وغرارة بیضاء فلما حاذیت العیر نفرت وصرع ذٰلک البعیر وانکسر م انتهیت الٰی عیر بنی فلان فی التنعیم یقدمهم جمل اورق علیه مسح اسود وغرارتان سودا وان وهاھی ذه تطلع علیکم من الثنیة فاستقبلوا الابل فقالوا هل انکسر لکم ناقة حمراء قالوا نعم قالوا فهل کان عندکم قصعة من ماء فقال رجل انا واللّٰہ وضعتها فما شربها احد منا ولا اهریقت فی الارض ۔(زرقانی ج ٦ ص ١٢٦)

☆ ''طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ قریش مکہ نے حضور ﷺ سے کہا (اگر آپ واقعی بیت المقدس سے ہو کر آئے ہیں تو) ہمارے قافلوں کا حال بتائیے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ایک قافلہ جو بنی فلاں کا تھا (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نام بتایا تھا، راوی کو نام یاد نہیں رہا) میں اس مقام روحا میں گزرا ان کی ایک اونٹنی گم ہو گئی تھی وہ لوگ اس کی تلاش میں گئے ہوئے تھے میں ان کے پالانوں اور سامان کی طرف آیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ پانی کا ایک پیالہ وہاں رکھا ہوا تھا میں نے اسے پی لیا۔ پھر اس کے بعد میں دوسرے قافلہ تک پہنچا جو بنی فلاں کا تھا (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نام بتایا تھا راوی کو یاد نہیں رہا) اور یہ قافلہ مقام ذی طویٰ میں تھا جیسا کہ تفسیر معالم التنزیل کے حوالہ سے بیان میں گزر چکا ہے یا مقام ذی مر میں جیسا کہ تفسیر مظہری پ ۱۵ص ٦ پر مرقوم ہے۔ اس میں ایک اونٹ تھا جس پر دو بوریاں لدی ہوئی تھیں ایک سیاہ (دھاری دار) تھی اور دوسری سفید (دھاری دار) جب میں قافلہ سے ہو کر گزرا تو قافلہ میں ایک اونٹ بھاگا وہ گر پڑا اور اس کا پاؤں ٹوٹ گیا پھر میں تیسرے قافلے تک پہنچا جو مقام تنعیم میں ملا۔ وہ بنی فلاں کا قافلہ تھا اس قافلے کے آگے آگے ایک بھورے رنگ کا اونٹ چل رہا تھا۔ اس پر ایک سیاہ فام حبشی سوار ہے اور دو سیاہ (دھاری دار) بوریاں غلہ کی اس پر لدی ہوئی ہیں اور وہ بالکل قریب آ گیا ہے (کدئی کی پہاڑی سے) عنقریب طلوعِ شمس کے ساتھ چمکنے والا ہے (بیضاوی کشاف مظہری وغیرہ تفاسیر کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ قریش نے اسی قافلہ کے انتظار میں آدمی بٹھا دیئے تھے اور کچھ لوگ سورج کے انتظار میں مقرر کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ ایک طرف سے آواز آئی کہ سورج نکل آیا۔ فوراً دوسری طرف سے آواز آئی قافلہ آ گیا۔)''

☆ جس قافلہ کا اونٹ گم ہو گیا تھا اس کا واقعہ جو ابن ابی حاتم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں ''قد اضلوا بعیرا لهم قد جمعه فلان قال ﷺ فسلمت علیهم فقال بعضهم هٰذا صوت محمد۔'' (زرقانی ج ٦ ص ١٢٦)

☆ ''قافلہ والوں کا جو اونٹ گم ہو گیا تھا اسے فلاں شخص پکڑ کر لایا تھا (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آدمی کا نام بتایا تھا راوی کو یاد نہیں رہا) حضور ﷺ نے فرمایا میں نے ان قافلہ والوں پر سلام کہا تو ان میں سے بعض نے کہا، یہ محمد ﷺ کی آواز ہے۔

حوالہ جات

☆ شب معراج قافلوں سے ملنے کی حدیثیں محدثین ومفسرین نے کہیں طول اور کہیں اختصار کے ساتھ مختلف عبارات میں نقل فرمائیں۔ جن کتابوں سے ان حدیثوں کو ہم نے اس مضمون میں اخذ کیا ہے ان کے نام مع حوالہ صفحات حسب ذیل ہیں

(۱) تفسیر ابن جریر پ۱۵ص۵
(۲) تفسیر ابن کثیر ج۳ص۲۳
(۳) تفسیر بیضاوی ج اص ۴۷۴
(۴) تفسیر کشاف ج۲ص۲۲۳
(۵) تفسیر معالم التنزیل ج۴ص۱۱۲
(۶) تفسیر خازن ج۴ص۱۱۲
(۷) تفسیر سراج منیر ج۲ص ۴۷۵
(۸) تفسیر مظہری پ۱۵ص۶
(۹) تفسیر روح البیان ج۵ص ۱۲۷
(۱۰) تفسیر روح المعانی پ۱۵ص۶
(۱۱) زرقانی شرح مواہب ج۶ص۱۲۶
(۱۲) مواہب اللدنیہ ج۲ص۴۰

ماحصل

☆ خلاصہ کلام یہ کہ یہ تین قافلے تھے۔ایک کے متعلق حضور علیہ نے فرمایا تھا کہ وہ سورج طلوع ہوتے ہی آ جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا(تفسیر مظہری پ۱۵ص۶)

☆ دوسرے کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ نصف النہار کے وقت آئے گا وہ حضور کے فرمان کے مطابق عین نصف النہار کے وقت آیا (مواہب اللدنیہ ج۲ص۴۰)

☆ تیسرے کی بابت ارشاد فرمایا تھا کہ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے مکہ میں داخل ہوگا۔ جب سورج غروب کا وقت قریب آیا اور وہ قافلہ نہ پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے سورج کو روک لیا یہاں تک کہ قافلہ مکہ معظمہ میں پہنچ گیا (مواہب اللدنیہ ج۲ص۴۰)

☆ ہر قافلہ کے متعلق حضور نبی کریم علیہ نے جو نشانیاں بتائی تھیں جب وہ قافلے واپس آئے اور کفارِ مکہ نے ان سے دریافت کیا تو انہوں نے تصدیق کی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بتائی ہوئی ایک ایک نشانی کو صحیح تسلیم کیا لیکن ایمان نہ لائے اور معاذ اللّٰہ ان ھٰذا الا سحر مبین کہہ کر شقاوت ازلیہ کا ثبوت دیا۔ (تفسیر مظہری وغیرہ)

بیت المقدس کا منکشف ہونا

☆ مسند امام احمد و دیگر کتب حدیث میں وارد ہے کہ جب مسجد اقصیٰ کا نقشہ بیان فرماتے ہوئے بتقاضائے حکمت حضور علیہ کی توجہ ہٹی تو اللہ تعالیٰ نے ملک شام سے مسجد اقصیٰ کو ہٹا کر مکہ معظمہ میں حضرت عقیل بن ابی طالب کے گھر کے ساتھ رکھ دیا اور اس طرح عظمت محبوب کا اظہار فرمایا کہ مسجد اقصیٰ سے میرے حبیب علیہ کی معمولی سی توجہ کا ہٹ جانا مسجد اقصیٰ کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کا موجب ہو سکتا ہے۔

☆ اس مقام پر یہ شبہ درست نہیں کہ دیگر روایات میں "فجلی لی" یعنی میرے لئے بیت المقدس منکشف ہوگیا یا اس کے ہم معنی الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں۔ لہٰذا تعارض ہو گیا کیونکہ تعارض اس وقت ہوتا ہے جب ایک بات دوسری بات کے منافی ہو اور ظاہر ہے کہ بیت المقدس کا منکشف ہونا اس کے دار عقیل بن ابی طالب کے پاس رکھے جانے کے منافی نہیں بلکہ اس کا لازم ہے۔ اس لئے کہ جو چیز

کہیں سے لاکر ہمارے سامنے رکھی جائے گی وہ ضرور ہم پر منکشف ہوگی۔

☆ جن لوگوں نے امام احمد کی روایت (یعنی مسجد اقصیٰ کے مکہ معظمہ میں لاکر رکھے جانے کی) تاویل کی اور اسے وجودِ مثالی یا صورتِ مثالیہ کے معنی میں لیا انہوں نے تدبر سے کام نہیں لیا۔

قلب مبارک میں آنکھیں اور کان

☆ حضور ﷺ کے مبارک دل میں دو آنکھیں اور دو کان ایسے ہیں جنہیں ایک حدیث میں تسمعان اور تبصران سے تعبیر کیا گیا اور دارمی اور ابونعیم کی روایت میں حضرت جبریل علیہ السلام کا یہ قول مروی ہے کہ قلب وکیع فیه عینان تبصران واذنان سمیعتان۔

☆ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قلب مبارک نہایت قوی ہے جس میں دو کان سمیع ہیں اور دو آنکھیں بصیر ہیں۔ (شرح شفا لعلی القاری جلد اول ص ۴۷۳)

☆ جن کے دل میں کان اور آنکھیں سمیع و بصیر ہیں آج لوگ ان کے سمیع و بصیر ہونے میں تعجب کرتے ہیں۔ فیا للعجب۔

حکمت اور ضرورت

☆ بعض امور حکمت پر مبنی ہوتے ہیں لوگ انہیں ضرورت پر محمول کر کے غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ مثلاً شب معراج بطریق اور اس کے تمام عمال وغیرہ کی انتہائی کوششوں کے باوجود مسجد اقصیٰ کا دروازہ بند نہ ہوسکا۔ اب اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ دروازہ کھلے رہنے کی ضرورت تھی اگر بند ہو جاتا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مسجد میں کیسے داخل ہوتے؟ تو اس کا یہ سمجھنا قطعاً غلط ہوگا اس لئے کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جبریل علیہ السلام تھے اور ظاہر ہے کہ ان کے لئے پہاڑوں کا اٹھا لینا بھی کوئی دشوار نہیں۔ ایک بند دروازہ کا کھول لینا کیا مشکل ہوسکتا ہے؟ معلوم ہوا کہ دروازہ کا کھلا رہنا ضرورت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس حکمت کی بنا پر تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مسجد اقصیٰ تشریف لے جانے پر ایک عظمت والا نشان قائم ہو جائے۔ اسی طرح سفر معراج میں اکثر امور کے متعلق حضور ﷺ کا جبریل علیہ السلام سے دریافت فرمانا اور ان کا بتانا ضرورت کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس کی حکمت کی بنا پر تھا کہ وہ سوال و جواب مذکور ہو اور امت کو بھی ان امور کا علم ہو جائے۔ نیز یہ کہ اجنبی مقامات پر جانے والوں کے لئے یہ سوال و جواب کی سنت قائم ہو جائے اور اس کے طرق و آداب متعین اور مشروع ہو جائیں۔

معراج جسمانی پر تبصرہ

☆ بیان سابق میں ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم میں آیت اسراء کا پہلا جملہ "سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ" معراج جسمانی کی دو دلیلوں پر مشتمل ہے ایک "سبحان" دوسرا "عبد" جس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت چھپائی نہیں جا سکتی کہ مشرکین مکہ نے جو واقعہ معراج کا انکار کیا اور اس پر تمسخر اڑایا یہ بھی معراجِ جسمانی کی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خواب دیکھنے کا ذکر فرماتے تو اس پر نہ کسی کو تعجب ہوسکتا تھا نہ تمسخر اور انکار کے لئے کوئی گنجائش ہوسکتی تھی۔ یہ بھی عظمت رسول کا

چمکتا ہوا نشان ہے کہ دشمنوں کا انکار اور تمسخر بھی حضور ﷺ کے ایک بہت بڑے کمال یعنی معراج جسمانی کی دلیل بن گیا۔

سفر معراج کی تمثیل

☆ یہ تمام عالم کارخانہ قدرت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا مالک حقیقی ہے اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے محبوب، اگر کوئی شخص کسی بڑے کارخانے کا مالک ہو جس میں ہر قسم کی مشینری لگی ہوئی ہو اور اس سے ہر قسم کا کام ہو رہا ہو کہیں کپاس سے بنولے نکل رہے ہوں کہیں روئی دھنی جا رہی ہو کسی مشین میں سوت کاتا جا رہا ہو اور کسی میں کپڑا بنا جا رہا ہو کسی حصہ میں آٹا پس رہا ہو اور کارخانہ تیزی سے چل رہا ہو ہر مشین کا ہر پرزہ اپنا کام کر رہا ہو کہ یکا یک مالک کا محبوب مالک کے بلانے پر آجائے اور اسی وقت مالک حکم دے کہ میرے محبوب کے اعزاز میں کارخانہ بند کر دیا جائے اور اسی وقت کارخانہ بند ہو جائے تو ظاہر ہے کہ ہر مشین اسی وقت بند ہو جائے گی اور اسی وقت کارخانہ بند ہو جائے تو ظاہر ہے کہ ہر مشین اسی وقت بند ہو جائے گی اور سارا کام یک دم رک جائے گا۔ کارخانہ بند ہوتے وقت جتنے بنولے کپاس سے نکل کر نیچے گر چکے تھے وہ اسی طرح پڑے رہیں گے اور جو کپاس کے اندر تھے وہ اس کے اندر ہی رہیں گے بنولہ جو دانہ کچھ نکل چکا تھا اور کچھ باقی تھا وہ اسی حال میں ٹھہرا رہے گا۔ روئی، سوت، آٹا اور دانہ ہر چیز اپنے حال پر ٹھہری رہے گی۔ اگر وہ کارخانہ ہزار برس بھی بند پڑا رہے تو بھی کوئی چیز اسے اس حال سے نہ بدلے گی اور جب کارخانہ دوبارہ چالو ہو گا تو پھر ہر چیز اپنے حسب حال تغیر پذیر ہونے لگے گی جو دانہ درمیان میں ٹھہرا ہوا تھا وہ نیچے گرنے لگے گا۔ سوت کا جو تار ایک مقام پر ٹھہرا ہوا تھا آگے بڑھنے لگے گا۔ روئی کا جو حصہ درمیان میں رکا ہوا تھا باہر آنے لگے گا۔ بالکل اسی طرح شب معراج جب اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو بلایا تو اس کارخانہ عالم کو یک دم بند کر دیا سوائے اپنے حبیب ﷺ کے اور ان چیزوں کے جنہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے متحرک پایا۔ تمام کائنات کو اسی طرح ٹھہرا دیا جس طرح کارخانہ بند ہونے سے اس کی ہر چیز ٹھہر جاتی ہے۔ چاند اپنی جگہ ٹھہر گیا سورج اپنی جگہ رک گیا۔ زمانے اور زمانیات کی حرکت بند ہو گئی (سوائے ان کے جن کا استثناء ہم عرض کر چکے ہیں) حرارت و برودت اسی درجہ پر ٹھہر گئی جس پر وہ بند ہوتے وقت پہنچی تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بستر مبارک کی حرارت بھی ٹھہر گئی تھی جہاں وضو فرمایا تھا وہاں وضو شریف کا پانی بہنا بند ہو گیا۔ حجرہ شریف کی زنجیر مبارک ہلتے ہوئے جس جگہ پہنچی تھی وہیں رک گئی۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام واپس تشریف لائے تو کارخانہ قدرت بحکم مالک حقیقی فوراً چالو ہو گیا اور ہر چیز از سر نو اپنے مراحل کو طے کرنے لگی۔ چاند سورج اپنے اپنے منازل پر چلنے لگے۔ حرارت و برودت اپنے درجات طے کرنے لگی جو چیزیں حرکت سے سکون میں آ گئی تھیں مائل بہ حرکت ہونے لگیں۔ وضو شریف کا پانی بہنے لگا۔ (روح المعانی پ ۱۵ ص ۱۲، روح البیان جلد ۵ ص ۱۲۵)

☆ بستر مبارک کی حرارت اپنے درجات طے کرنے لگی حجرہ شریف کی زنجیر مبارک ہلنے لگی۔ کائنات میں نہ کوئی تغیر آیا اور نہ کسی کو احساس ہوا کیونکہ تغیر اور احساس دونوں حرکت کے بغیر ناممکن ہیں اور حرکت کا وجود ہی نہ تھا تو احساس و تغیر کیسے ہوتا؟

معراج پر لوگوں کا تعجب

☆ لوگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آسمانوں پر جانے سے تعجب کرتے ہیں اور مجھے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واپس آنے پر تعجب ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اصل نور ہے اور قاعدہ ہے کہ کل شیء یرجع الٰی اصلہٖ پر اتو مسلک ہے کہ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمین پر جلوہ افروز ہونے سے اللہ تعالیٰ کی حکمتیں متعلق نہ ہوتیں تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام آسمانوں پر ہی رہتے لیکن اللہ جل شانہٗ نے عالم اجسام کو فیضیاب کرنے کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جسمانیت عطا فرمائی اور ایک مدت معینہ تک ظاہری طور پر اس عالم ناسوت میں جلوہ گر رکھا۔

معراج جسمانی اور بشریت

☆ جو لوگ حضور ﷺ کے کھانے پینے، چلنے پھرنے و دیگر اوصافِ بشریت کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور ہونے کی نفی میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں انہیں غور کرنا چاہیے کہ جس طرح کھانا پینا وغیرہ ان کے نزدیک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور نہ ہونے کی دلیل ہے اسی طرح تمام عالم عناصر سے اوپر جانا زمین کے بغیر ٹھہرا رہنا، ہوا اور سانس کا محتاج نہ ہونا، کرۂ نار سے صحیح سالم گزر جانا اور آن کی آن میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ اور آسمانوں پر جا کر واپس آ جانا ان ہی کے اصول پر بشر نہ ہونے کی دلیل ہو سکتا ہے کیونکہ جس طرح نور کا کھانا پینا ناممکن ہے اسی طرح بشر کا آسمانوں پر جانا ہوا کے بغیر زندہ رہنا آگ سے صحیح سالم گزر جانا ایک آن میں آسمانوں پر جا کر واپس آ جانا بھی ناممکن ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو بشریت بھی عطا فرمائی ہے اور نورانیت بھی۔ عالم بشریت میں ظہور بشریت کا غلبہ ہے اور عالم انوار میں ظہور نورانیت کا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مقدسہ ایک مستقل معجزہ ہے

☆ معجزہ کے معنی یہ ہیں کہ نبی کے دعوائے نبوت کے ساتھ اس کی ذات سے ایسے کام یا صفت کا ظاہر ہونا جو عادت کے خلاف ہو اور مخلوقات میں سے کوئی شخص ایسا کام نبی کا مدمقابل ہو کر نہ کر سکے اسے معجزہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ صفت مدمقابل کو نبی کے سامنے عاجز کر دیتی ہے۔ جب تک کوئی کام خلافِ عادت نہ ہو تو معجزہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً انسان اور بشر کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ عادت جاری فرمائی ہے کہ وہ زمین پر ٹھہرے گا۔ ہوا میں سانس لے کر زندہ رہے گا۔ جسمانی اور مادی غذا کے بغیر زندہ نہ رہے گا۔ وہ زمین پر ہی چلے گا، آسمانوں پر جانا اس کے لئے خرق عادت اور خلافِ عادت ہے۔

☆ اسی طرح نورانی مخلوق کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ عادت مقرر فرمائی ہے کہ وہ چشم زدن میں آسمانوں سے زمینوں پر آئے اور آنِ واحد میں زمینوں سے آسمانوں پر جائے۔ مادی غذا گوشت، روٹی وغیرہ نہ کھائے۔ پانی پینا اور ہوا میں سانس لینا، نورانی مخلوق کی عادت نہیں۔ نوری شخص آگ، ہوا، مٹی کے بغیر بھی زندہ رہے گا۔ اس کے لئے زمین پر چلنا، روٹی کھانا، پانی پینا، ہوا میں سانس لینا سب خرق عادت، خلافِ عادت ہے۔

☆ حضور سید عالم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بشریت بھی عطا فرمائی اور نورانیت بھی۔ آیت قرآنیہ "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" اور "فانا بشر" حضور ﷺ کی بشریت کی دلیل ہے اور آیت قرآنیہ "قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ" اور حدیث پاک "اللّٰھم اجعلنی نورا" حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نورانیت کی دلیل ہے۔ جب دونوں صفتیں حضور ﷺ میں ثابت ہوئیں تو یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ جس طرح آسمانوں پر تشریف لے جانا، مادی غذا کھانے پینے اور ہوا کے بغیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زندہ رہنا حضور ﷺ کی بشریت مطہرہ کے لئے خرقِ عادت ہونے کے باعث بہت بڑا کمال اور عظیم الشان معجزہ ہے بالکل اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کھانا پینا، چلنا پھرنا اور دیگر اوصاف بشریت کا ذات مقدسہ میں پایا جانا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نورانیت کے لئے خرق عادت ہونے کی وجہ سے معجزہ ہے۔

☆ خلاصہ یہ کہ نورانی اوصاف بشریت کے اعتبار سے معجزہ ہیں اور بشری اوصاف نورانیت کے لحاظ سے معجزہ ہیں اور آقائے نامدار ﷺ کی ذات پاک بشریت اور نورانیت کی جامع ہونے کی وجہ سے سراپا معجزہ ہے۔

ایام طفولیت مبارکہ میں شق صدر کے بعد سینۂ اقدس کو ٹانکے لگائے گئے

☆ صحیح مسلم جلد اول ص ۹۲ پر حضرت انس سے مروی ہے کہ حضور ﷺ بچوں کے ساتھ (اپنی شان کے لائق) کھیل رہے تھے جبریل علیہ السلام آئے اور انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو زمین پر لٹا کر سینۂ اقدس چاک کیا۔ قلب مبارک کو باہر نکال کر اس سے منجمد خون نکالا اور زمزم کے پانی سے دھو کر سینۂ اقدس میں رکھ کر سینۂ مبارک بند کر دیا۔ وہ بچے (جن کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کھیل رہے تھے) بھاگے ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رضاعی ماں (حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے پاس آئے اور کہنے لگے "ان محمد قد قتل" محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے۔ لوگ دوڑے ہوئے آئے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا رنگ مبارک بدلا ہوا تھا حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کے سینۂ اقدس میں سوئی (سے سیئے جانے) کا نشان دیکھتا تھا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شق صدر مبارک کے متعلق روحانی، کشفی، منامی وغیرہ کی تمام تاویلات قطعاً باطل ہیں بلکہ یہ "شق" اور چاک کیا جانا حسی، حقیقی اور امر واقعی ہے کیونکہ سینۂ اقدس میں سوئی سے سیئے جانے کا نشان چمکتا ہوا نظر آتا تھا پھر حدیث پاک میں صاف الفاظ موجود ہیں کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سینۂ اقدس چاک کیا گیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ کھیلنے والے لڑکے دوڑے ہوئے حضور کی رضاعی ماں (حلیمہ سعدیہ) کے پاس آئے اور کہا کہ محمد (ﷺ) قتل کر دیئے گئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سینۂ مبارک کے چاک ہونے اور قلب اطہر کے نکالے جانے اور اس سے منجمد خون کے باہر نکالے جانے کا واضح ذکر اور حضور ﷺ کے متغیر اللون ہونے کا بیان اس حقیقت کو بے نقاب کر رہا ہے کہ یہ واقعہ بالکل حسی ہے اس کو معنوی کہنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

☆ اس تفصیل کو ذہن نشین کر لینے کے بعد بیان سابق میں ہمارا یہ قول بالکل بے غبار ہو جاتا ہے کہ شق صدر مبارک بچپن میں ہو یا جوانی میں، عند البعثت ہو یا بوقت معراج حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد وفات حیاتِ حقیقی کے ساتھ زندہ رہنے کی قوی دلیل ہے

کیونکہ انسان کا دل اس کی روح حیات کا مستقر ہوتا ہے اس کا سینے سے باہر آ جانا روح حیات کا بدن سے نکل جانا ہے۔ گویا اس واقعہ میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح قلب مبارک کے سینۂ اقدس سے باہر ہو جانے کے باوجود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ ہیں اسی طرح وہ روحِ مقدس کے قبض ہو جانے کے بعد بھی زندہ رہیں گے اور یہ واقعہ حضور ﷺ کے عظیم ترین معجزات میں سے ہے۔

فائدہ جلیلہ

☆ فضیلت شق صدر حضور ﷺ کے طفیل باقی انبیاء علیہم السلام کو بھی عطا ہوئی جیسا کہ تابوت بنی اسرائیل کے قصہ میں طبرانی کی طویل روایت میں یہ الفاظ ہیں "کان فیه الطشت التی یغسل فیها قلوب الانبیاء" (فتح الملہم ج ا ص ۱۰۰)

☆ یعنی تابوت سکینہ میں وہ طشت بھی تھا جس میں انبیاء علیہم السلام کے دلوں کو دھویا جاتا تھا چونکہ دیگر انبیاء علیہم السلام کو بھی حضور ﷺ کی تبعیت میں حیاتِ حقیقی جسمانی عطا فرمائی گئی لہٰذا شق صدر اور قلب مبارک کا دھویا جانا بھی ان کو عطا کیا گیا تا کہ ان کی حیات بعد الوفات پر بھی اسی طرح دلیل قائم ہو جائے جس طرح رسول اللہ ﷺ کی حیات بعد الممات پر دلیل قائم کی گئی اور اس طرح بلا تخصیص وتقیید مطلقاً حیاتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ثابت ہو جائے۔

قلب مبارک کا دھویا جانا

☆ قلب اطہر کا زمزم سے دھویا جانا کسی آلائش کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ حضور سید عالم ﷺ سید الطیبین والطاہرین ہیں۔ ایسے طیب و طاہر کہ ولادت باسعادت کے بعد بھی حضور سید عالم ﷺ کو غسل نہیں دیا گیا۔ لہٰذا قلب اقدس کا زمزم سے دھویا جانا محض اس حکمت پر مبنی تھا کہ زمزم کے پانی کو وہ شرف بخشا جائے جو دنیا کے کسی پانی کو حاصل نہیں بلکہ قلب اطہر کے ساتھ ماءِ زمزم کو مس فرما کر وہ فضیلت عطا فرمائی گئی جو کوثر و تسنیم کے پانی کو بھی حاصل نہیں۔

جبریل علیہ السلام کی حاجت

☆ عمدۃ المفسرین علامہ اسمٰعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ جب سدرہ سے آگے بڑھے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا "یا جبرائیل! هل لک من حاجة الی ربک" (اے جبریل! رب کی طرف کوئی حاجت ہو تو بتاؤ) جبریل علیہ السلام نے عرض کیا "یا محمد! سل اللّٰه ان ابسط جناحی علی الصراط لامتک حتّٰی یجوزوا علیه" (اے آقا محمد مصطفیٰ (ﷺ) آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لئے یہ سوال کریں کہ قیامت کے دن آپ کی امت جب پل صراط سے گزرے تو میں ان کے قدموں کے نیچے اپنے پر بچھا دوں تا کہ وہ آسانی سے گزر جائیں)۔ (روح البیان جلد خامس ص ۲۲۱)

☆ جبریل علیہ السلام سے حضور ﷺ کے اس فرمانے میں یہ حکمت تھی کہ جب ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نمرود نے آگ میں ڈالنا چاہا تو جبریل علیہ السلام نے عرض کیا، اے ابراہیم! کوئی حاجت ہو تو بتلائیے۔ ابراہیم علیہ السلام نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا "اما الیک فلا" تمہاری طرف سے کوئی حاجت نہیں۔

☆ حضور ﷺ نے شب معراج جبریل علیہ السلام سے ان کی حاجت دریافت فرما کر اپنے جد کریم سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے وہ بدلہ اتار دیا۔

شب معراج موسیٰ علیہ السلام اور امام غزالی رضی اللہ عنہ کا مکالمہ

☆ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ شمائم امدادیہ میں فرماتے ہیں کہ منقول ہے کہ شب معراج کو جب آنحضرت ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے استفسار فرمایا کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل جو آپ نے کہا ہے کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔ حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی حاضر ہوئے اور سلام باضافہ الفاظ وبرکاتہ ومغفرتہ وغیرہ عرض کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ طوالت بزرگوں کے سامنے کرتے ہو۔ آپ (امام غزالی) نے عرض کیا آپ سے حق تعالیٰ نے صرف اس قدر پوچھا تھا ما تلک بیمینک یا موسیٰ تو آپ نے کیوں اتنا طول دیا کہ ھی عصای اتوکؤا علیھا واھش بھا علیٰ غنمی ولی فیھا ماٰرب اخریٰ۔ الآیۃ۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ادب یا غزالی۔ ادب کروائے غزالی (شمائم امدادیہ مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ)

☆ صاحب نبراس شارح عقائد نسفیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرہ آفاق کتاب نبراس شرح عقائد نسفیہ میں فرماتے ہیں کہ امام قطب زماں ابوالحسن شاذلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ حضور ﷺ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام سے یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ کیا آپ کی امتوں میں غزالی جیسا کوئی عالم ہے۔ بعض لوگ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ پر انکار کیا کرتے تھے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خواب میں انہیں کوڑے مارے۔ وہ بیدار ہوئے تو کوڑوں کا اثر ان کے جسم پر تھا۔ (نبراس ص ۳۸۸)

☆ اسی واقعہ کو امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے محاضرات میں سیدنا امام شاذلی صاحب "حزب البحر" رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح نقل فرمایا کہ میں ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ میں سوگیا خواب میں دیکھتا ہوں کہ مسجد اقصیٰ کے باہر وسط حرم میں ایک تخت بچھایا گیا اور فوج در فوج مخلوق کا اژدھام ہونا شروع ہوا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کیسا اجتماع ہے؟ معلوم ہوا کہ تمام رسل وانبیاء علیہم السلام حضور سید عالم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں منصور حلاج کی سوء ادبی کے بارے میں شفاعت کے لئے حاضر ہو رہے ہیں۔ میں نے جو تخت دیکھا تو اس پر ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تنہا رونق افروز ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ وعیسیٰ ونوح علیہم السلام سب زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں ٹھہر گیا اور ان مقدس حضرات کی باتیں سننے لگا۔ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت محمد ﷺ سے عرض کیا، حضور! آپ نے فرمایا ہے کہ میری امت کے علماء انبیاءِ بنی اسرائیل کی طرح ہیں تو ان میں سے کوئی ایک عالم دکھائیں۔ حضور ﷺ نے امام غزالی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف اشارہ فرمایا، موسیٰ علیہ السلام نے ان سے ایک سوال کیا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے دس جواب دیئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا جواب سوال کے مطابق ہونا چاہیے۔ ایک سوال کا جواب دینا تھا آپ نے دس جواب کیوں دیئے؟ امام غزالی نے عرض کیا۔ حضور (معاف فرمائیں) اللہ تعالیٰ نے آپ سے

بھی ایک ہی سوال کیا تھا "وما تلک بیمینک یا موسیٰ! (اے موسیٰ! تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟) آپ نے اس کے کئی جواب دیئے کہ یہ میری لکڑی ہے۔ میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں اور اس کے علاوہ میرے اور کام بھی اس سے سرانجام ہوتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کے سوال کا ایک جواب کافی تھا کہ یہ میری لکڑی ہے۔ امام شاذلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں یہ منظر دیکھ کر حضور نبی کریم ﷺ تنہا تخت پر جلوہ افروز ہیں اور تمام رسل وانبیاء بالخصوص حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام، موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام، نوح نجی اللہ علیہ السلام، عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام جیسے اولوا العزم انبیاء علیہم السلام سب حضور ﷺ کے سامنے زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں کتنی بڑی عظمت اور جلالت محمدی کا مظاہرہ ہے میں سوچ بچار میں لگا ہوا تھا اور اپنے دل میں (بحالت خواب) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قدر ومنزلت پر متعجب تھا کہ ناگہاں کسی نے مجھے پاؤں سے ٹھوکر ماری جس کی ضرب سے میں بیدار ہو گیا۔ میں نے اسے جو دیکھا تو وہ مسجد اقصیٰ کا منتظم تھا اور اس وقت مسجد اقصیٰ کی قندیلیں روشن کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا، کیا تعجب کرتا ہے؟ یہ سب حضور ﷺ ہی کے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ سن کر مجھ پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ نماز کے لئے جماعت کھڑی ہوئی تو اس وقت مجھے افاقہ ہوا۔ میں نے اس منتظم مسجد اقصیٰ کو تلاش کیا مگر آج تک اسے نہ پایا۔ (روح البیان ج ۵ ص ۷۵)

ایک شبہ کا ازالہ

☆ شاید کسی کے دل میں شبہ پیدا ہو کہ امام غزالی نے موسیٰ علیہ السلام کو (معاذ اللہ) لاجواب کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ محض اس لئے پیدا ہوا کہ مکالمہ کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی حیثیت ملحوظ نہ رہی۔

☆ اصل واقعہ یہ ہے کہ موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اس وقت بحیثیت ممتحن تھے اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے امتحان دینے والے طالب علم کی حیثیت سے کھڑے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بطور امتحان سوال فرمایا اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا صحیح جواب دیا۔

☆ اگر کوئی طالب علم ممتحن کے سوال کا صحیح اور معقول جواب دے دے تو کوئی عقل مند یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے ممتحن کو لاجواب کر دیا بلکہ طالب علم کو کامیاب کہا جائے گا۔ لہٰذا امام غزالی کے متعلق یہ کہنا قطعاً غلط ہو گا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو لاجواب کر دیا بلکہ یہی کہا جائے گا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ بارگاہِ کلیمی میں امتحانی دے کر خود کامیاب ہو گئے۔

ایک اور شبہ کا ازالہ

☆ اس مقام پر یہ شبہ بھی غلط ہو گا کہ واقعی قاعدہ بھی چاہتا ہے کہ جواب سوال کے مطابق ہو اور ایک سوال کے متعدد جوابات بظاہر خلافِ اصول ہیں۔ ایسی صورت میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے جوابات اور ساتھ ہی موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے جوابات سب محل نظر ہو جائیں گے۔

☆ اس شبہ کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جواب کا سوال کے مطابق ہونا یقیناً ضروری ہے لیکن جوابات کا تعدد مطابقت کے خلاف

نہیں۔ البتہ یہ سوال ضرور ہوسکتا ہے کہ ایک سوال کے کئی جواب دینے میں کیا حکمت ہوگی؟ جس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی حکمت کلام کو لمبا کرنا ہے تاکہ شرف مکالمہ زیادہ دیر تک حاصل ہوتا رہے۔ گویا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ جواب دیا کہ اے کلیم اللہ! جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخاطب کر کے سوال کیا تھا کہ اے موسیٰ! تمہارے داہنے ہاتھ میں یہ کیا چیز ہے؟ تو آپ نے اللہ تعالیٰ کے اس خطاب کو اپنے لئے باعث عزت وافتخار جانا اور یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کلام فرما کر مجھے اپنا کلیم بنایا۔ لہٰذا ایک سوال کے کئی جواب دے کر کلام کو لمبا کردوں تاکہ لذت مکالمہ دیر تک حاصل ہوتی رہے۔ علیٰ ہذا القیاس اے کلیم الٰہی! جب آپ نے مجھے مخاطب فرما کر سوال فرمایا تو آپ کے خطاب کو میں نے اپنے لئے باعث صد عزت وافتخار جانا اور یہ محسوس کیا کہ میں کیسا خوش نصیب ہوں کہ خدا کے کلیم سے ہم کلام ہو رہا ہوں۔ آپ نے کلیم اللہ ہونے پر فخر کیا اور میں نے کلیم اللہ کے کلیم ہونے کو موجب شرف جانا اور لذت مکالمہ سے زیادہ دیر تک کیف اندوز ہونے کے لئے کلام کو لمبا کر دیا۔

تحفہ معراجیہ

نماز مسلمانوں کے لئے معراج شریف کا تحفہ ہے اس کی کئی وجوہ ہیں

۱۔ خدا کے دربار میں حاضری معراج کا نقشہ ہے۔

۲۔ نماز معراج شریف کے موقع پر فرض ہوئی۔

۳۔ التحیات میں معراج کے انوار وتجلیات پائے جاتے ہیں۔

☆ اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی معراج تو یہ تھی کہ حضور ﷺ اللہ کے دیدار سے مشرف ہوئے اور بے حجاب خدا کا جمال دیکھا لیکن حضور ﷺ کے سوا اس دنیا کی حیاتِ ظاہری میں جسمانی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کسی کو نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ہماری معراج حضور نبی کریم ﷺ تک پہنچ جانا ہے اس طرح کہ ہم کو حضور ﷺ سے اتنا قرب حاصل ہوجائے کہ ہم اس دنیا میں بحالت بیداری حضور ﷺ کا جمال مبارک اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

☆ اس حکمت کے لئے تشہد میں "السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہٗ" کے الفاظ رکھے ہیں۔ نماز میں اپنے قصد وارادہ سے غیر اللہ کو بلانا اور پکارنا نماز کے فساد کا موجب ہے مگر نبی کریم ﷺ کو خطاب کے صیغہ سے پکارنا واجب ہے۔ معلوم ہوا کہ مومن بحالت نماز حضور ﷺ کی حضوری سے مشرف ہوتا ہے۔ اب اگر وہ اپنی پاکیزگی، طہارت اور محبت واخلاص کو اس درجہ قوی کر لے کہ "السلام علیک ایھا النبی" کہتے وقت اس کی بصیرت نورِ جمالِ محمدی کو دیکھ سکے تو بس یہی اس کی معراج ہے کیونکہ حضور ﷺ تک پہنچنا اللہ تعالیٰ تک پہنچنا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دیکھنا اللہ تعالیٰ کا دیکھنا ہے۔ اسی لئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں "واحضر فی قلبک النبی ﷺ وشخصہ الکریم وقل السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہٗ۔" (احیاء العلوم جلد اول ص ۱۷۵)

☆ یعنی نماز پڑھتے ہوئے اپنے دل میں حضور ﷺ کو حاضر کرو اور اسی حال میں "السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہٗ" کہو اللّٰھم اجعلنا من الواصلین۔ آمین!

ام المومنین کی حدیث

☆ بعض لوگ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اس حدیث سے غلط نتیجہ نکال لیتے ہیں۔ اس لئے اس کی وضاحت ضروری ہے۔

☆ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں جو تجھ سے بیان کرے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کو دیکھا اس نے اللہ پر بہت بڑا بہتان باندھا اور جو شخص یہ کہے کہ حضور ﷺ ما فی غد یعنی آئندہ ہونے والے واقعات کا علم رکھتے تھے یا یہ بیان کرے کہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی وحی میں سے کچھ چھپالیا اس نے بھی اللہ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔

☆ اس حدیث میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تین مسئلے بیان فرمائے ہیں۔ ایک رؤیت باری تعالیٰ کا، دوسرا ما فی غد کا، تیسرا قرآن کریم اور احکام الٰہی کے چھپا لینے کا۔ رؤیت باری تعالیٰ پر ہم تفصیل سے کلام کر چکے ہیں۔ احکام خداوندی و قرآن مجید کو چھپالینا معاذ اللہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں ہرگز متصور نہیں ہوسکتا لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے علوم و معارف اپنے حبیب ﷺ کو عطا فرمائے ہیں وہ سب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے امت کو پہنچا دیئے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ تبلیغ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوا اس میں سے کوئی بات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چھپا کر نہیں رکھی ورنہ امت کا علم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مساوی ہوجائے گا جس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

☆ اس کے بعد ما فی غد کے علم کی طرف آیئے۔ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ کے بتانے سے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آئندہ آنے والے واقعات کا علم نہیں بلکہ ان کا مطلب بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر بتائے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ما فی غد کا علم ثابت کرنا اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنا ہے۔ ہمارے اس بیان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت مالک بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب مسلمان ہوکر حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو انہوں نے حضور ﷺ کے سامنے ایک نعتیہ قصیدہ پڑھا جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ما فی غد کا علم ثابت کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سنا اور اس پر انکار نہ فرمایا بلکہ قصیدہ سن کر ان کے حق میں کلماتِ خیر ارشاد فرمائے اور انعام میں حلہ پہنایا۔ ہم وہ پورا قصیدہ امام ابن حجر عسقلانی صاحب فتح الباری رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "الاصابہ" سے نقل کرتے ہیں

(۱) ما ان رایت ولا سمعت بواحد	فی الناس کلھم کمثل محمد
(۲) او فی فاعطی للجزیل لمجتدی	ومتیٰ تشاء یخبرک عما فی غد
(۳) واذا الکتیبۃ غردت ابناؤھا	بالسمھری وضرب کل مھند

(۴)فکانہٗ لیث علی اشبالہٖ وسط الاناء ة حادر فی مرصد

(۱) میں نے تمام لوگوں میں کوئی ایک شخص محمد ﷺ کی مثل نہ آنکھ سے دیکھا نہ کان سے سنا۔

(۲) انہوں نے وعدہ پورا فرمایا اور حاجت مند کو عطائے کثیر سے نوازا (اور اے مخاطب) جب تو چاہے تو تجھے مافی غد (ہر آئندہ ہونے والے واقعہ) کی خبر دیں گے۔

(۳) اور جب لشکر کے سپاہی خوشی اور طرب میں گانے گاتے ہوئے مضبوط نیزوں اور ہندی تلواروں کی ضرب کے ساتھ حملہ آور ہوتے ہیں۔

(۴) گویا وہ رسول اللہ ﷺ (اپنے غلاموں پر) ایسے ہوتے ہیں جیسے بہادر شیر اپنے بچوں پر۔ وہ پورے حلم و وقار کے درمیان اپنی نگہبانی کے مقام پر نہایت قوی اور مضبوط رہتے ہیں۔ فقال لہ خیرا و کساہ حلة

☆ حضور ﷺ نے یہ نعتیہ اشعار سن کر مالک بن عوف صحابی کے حق میں کلماتِ خیر فرمائے اور انہیں حلہ پہنایا۔ (الاصابہ جلد ۳ ص ۳۴۲)

☆ اسی طرح حضرت سواد بن قارب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو جاہلیت کے زمانہ میں کاہن تھے اور جن ان کے تابع تھا۔ ان کے جن نے مسلسل تین راتوں میں سواد بن قارب کو نیند سے بیدار کر کے بتایا کہ مکہ میں رسول معظم ہادیٔ برحق قبیلہ بنی ہاشم سے پیدا ہو چکے ہیں اور (وہ ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے ہیں) اکثر جنات بھی ان پر ایمان لے آئے ہیں تم بھی چلو اور ان پر ایمان لے آؤ۔ مسلسل تین راتیں اسی طرح گزریں بالآخر حضرت سواد بن قارب کے دل میں اسلام جاگزیں ہوگیا۔ سواد بن قارب فرماتے ہیں، میں مدینہ پہنچا تو حضور ﷺ نے مجھے دیکھتے ہی یہ فرمایا خوش آمدید ہو تمہیں اے سواد بن قارب قد علمنا ما جاء بک تمہارے آنے کا سبب ہم خوب جانتے ہیں۔ میں نے عرض کیا، حضور میں نے کچھ شعر کہے ہیں سن لیجئے۔ اجازت پا کر میں نے اپنے یہ شعر حضور ﷺ کو سنائے۔

اتانی رئیی بعد لیل وھجعة فلم اک فیما قد بلیت بکاذب

ثلاث لیال قولہ کل لیلة اتاک نبی من لؤی بن غالب

فشمرت عن ساقی الازار و وسطت بی الذعلب الوجناء عند السباسب

فاشھد ان اللّٰہ لا رب غیرہ وانک مامون علی کل غائب

وانک ادنی المرسلین شفاعة الی اللّٰہ یا بن الاکرمین الاطایب

فمرنا بما یاتیک یا خیر مرسل وان کان فیما جاء شیب الذوائب

فکن لی شفیعا یوم لا ذو شفاعة سواک بمغن عن سواد بن قارب

☆ ''رات کا کچھ حصہ گزرنے اور سونے کے بعد میرے پاس میرا جن آیا جو میرے تابع ہے تو میں اپنے تجربہ میں جھوٹا نہ ہوا۔ میرا جن تین راتوں تک یہی کہتا رہا۔ تیرے پاس قبیلہ لوی بن غالب سے ایک نبی آ گئے ہیں۔ میں نے اپنی پنڈلیوں سے اپنا تہبند اونچا کیا

اور اپنی سواری میں ایک مضبوط اونٹنی کو لیا جو نہایت تیز اور میدانوں کو قطع کرنے والی ہے تو میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں اور بے شک آپ ہر غیب پر امین ہیں اور بیشک اے آقا بزرگوں اور پاکوں کی اولاد تمام رسولوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف شفاعت کے سب سے زیادہ حق دار آپ ہی ہیں تو اے رسولوں کے سردار آپ کے پاس جو احکام آتے ہیں آپ ہمیں ان کا امر فرمائیں۔ اگرچہ ان میں زلفوں کا بڑھاپا ہی کیوں نہ ہو۔ آپ اس دن میرے شفیع ہوں۔ جس دن کوئی شفاعت کرنے والا نہ ہوگا۔ سواد بن قارب کو عذاب الٰہی سے بچانے والا آپ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔"

☆ قال فضحک النبی ﷺ حتی بدت نواجذہ. سواد بن قارب فرماتے ہیں کہ میرے اشعار سن کر حضور ﷺ مسکرائے۔ یہاں تک کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دندان مبارک ظاہر ہو گئے۔ (عینی شرح بخاری ج ۷ ص ۸)

☆ دیکھئے حضرت مالک بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے مافی غد کا علم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے تسلیم کیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان پر انکار نہیں فرمایا۔ اسی طرح حضرت سواد بن قارب رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر غیب پر آپ امین ہیں۔ اس پر بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انکار نہ فرمایا بلکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خوش ہوئے اور مسکرائے ان دونوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ مافی غد کا علم بھی حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے دینے سے ہے اور ہر غیب کی امانت بھی بہ عطاء الٰہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ثابت ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ جن احادیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مافی غد کے علم یا کسی علم کی نفی وارد ہوئی ہے تو وہاں علم ذاتی کی نفی مراد ہے۔

نکتہ: سواد بن قارب نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہر غیب پر امین بتایا ہے۔ معلوم ہوا کہ غیب اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور چونکہ اجازت مالک کے بغیر امانت میں تصرف کرنا خیانت ہے اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اگر کسی کے پوچھنے کے باوجود بھی غیب کی کوئی بات نہ بتائی تو اس سے حضور ﷺ کی لاعلمی ثابت نہیں ہوتی بلکہ حضور ﷺ کا امین ہونا ثابت ہوتا ہے۔ وللہ الحمد!

ملک و ملکوت اور آیات

☆ اگر سوال کیا جائے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام ملک وملکوت دکھائے اور حضور ﷺ کو صرف بعض آیات! تو میں عرض کروں گا کہ ایاتنا میں اضافت استغراقیہ ہے اور ظاہر ہے کہ کل آیات ان سب کا مجموعہ ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یا سننے، چکھنے، سمجھنے وغیرہ سے! ثابت ہوا کہ دیکھنے کے قابل جو آیات ہیں وہ کل آیات کا بعض ہیں۔ لہٰذا من تبعیضیہ احتراز کے لئے نہیں بلکہ بیان واقع کے لئے ہے۔

☆ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملکوت السمٰوات والارض ابراہیم علیہ السلام کو دکھائے لیکن حضور ﷺ کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو خود اپنا جمال دکھایا جیسا کہ تفصیلاً گزر چکا ہے۔

خواتیم سورۂ بقرہ

☆ مسلم شریف میں جو حدیث وارد ہے کہ معراج کی رات اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو خواتیم سورۂ بقرہ بھی عطا فرمائیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ قرآن کریم کے حاصل کرنے میں جبریل علیہ السلام کے قطعاً محتاج نہ تھے بلکہ جبریل علیہ السلام اپنی متعلقہ خدمت کو انجام دینے کے لئے بارگاہِ محمدی میں حاضر ہونے کے محتاج تھے۔ حضور ﷺ تو بلاواسطہ جبریل علیہ السلام بھی اپنے رب کا کلام لے سکتے ہیں جس کی دلیل شب معراج خواتیم سورۂ بقرہ کا لینا ہے۔ پھر وہ آیتیں مدینہ منورہ میں بھی نازل ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ایک علم کا بار بار دیا جانا درست ہے اور تکرار عطا عظمت علم کی دلیل ہے۔

معراج سے واپسی

☆ حضور سید عالم ﷺ براق پر تشریف لائے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے فراکب البراق و عاد الٰی مکۃ بغلس. یعنی حضور ﷺ براق پر سوار ہوئے اور رات کی تاریکی میں مکہ معظمہ واپس تشریف لائے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۳)

معراج کا سنہ، مہینہ اور تاریخ

☆ سنہ معراج کے بارے میں محدثین کے اقوال حسب ذیل ہیں

(۱) ہجرت سے ایک سال پہلے (۲) ہجرت سے ڈیڑھ سال پہلے

(۳) ہجرت سے ایک سال اور کچھ پہلے (۴) ہجرت سے پانچ سال پہلے

(۵) بعض محدثین کا قول ہے کہ بعثت کے پانچ سال بعد معراج ہوئی

☆ اسی طرح مہینہ میں بھی حسب ذیل اقوال ہیں

(۱) ربیع الاول (۲) ربیع الآخر (۳) رجب المرجب

(۴) رمضان المبارک (۵) شوال المکرم

☆ دن میں بھی اختلاف ہے کہ کون سے دن کی رات میں حضور ﷺ کو معراج ہوئی۔ ایک قول ہے کہ پیر کی رات میں معراج ہوئی۔ دوسرا قول ہے کہ جمعہ کی رات میں ہوئی۔ و اللہ اعلم! (نسیم الریاض ج ۲ ص ۲۶۶)

☆ اسی طرح تاریخ کے متعلق بھی حسب ذیل اقوال ہیں

(۱) ۱۷ ررمضان المبارک (۲) ۱۷ رربیع الاول شریف

(۳) ۲۷ ررجب المرجب (ماثبت بالسنۃ ۱۹۱، روح البیان ج ۵ ص ۱۰۶)

قول مشہور

☆ اس بارے میں قول مشہور یہ ہے کہ معراج شریف ۲۷ ررجب المرجب شب دوشنبہ کو ہوئی۔ (ماثبت بالسنۃ ۱۹۱، روح البیان ج ۵ ص ۱۰۶)

شب معراج کی فضیلت

☆ امت کے حق میں شب اسریٰ سے لیلۃ القدر زیادہ افضل ہے اور حضور نبی کریم ﷺ کے حق میں شب معراج لیلۃ القدر سے زیادہ افضل ہے۔ (مواہب اللدنیہ ج دوم ص ۴)

ایک اعتراض اور اس کا جواب

☆ علماء نے لکھا ہے کہ لیلۃ الاسراء میں کسی عمل کی ارجحیت کے بارے میں کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی۔ اسی واسطے نہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کے لئے اس رات کو مقرر فرمایا۔ نہ صحابہ کرام نے اسے کسی عبادت کے لئے معین کیا۔ لہٰذا شب معراج منانا اور اس میں ذکر معراج کا اہتمام کرنا بدعت ہے۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر صحابہ کرام یا ان کے بعد کسی زمانہ میں اس رات میں ذکر معراج کے اہتمام کا رواج ہوتا تو اس مہینہ اور تاریخ میں اتنا شدید اختلاف نہ ہوتا۔ اختلافِ اقوال اس امر کی روشن دلیل ہے کہ بزرگان سلف کے نزدیک شب معراج کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

☆ اس کے جواب میں عرض ہے کہ اگر معترض کی مراد یہ ہے کہ شب معراج میں خصوصیت کے ساتھ نیکی اور عبادت کا مشروع ہونا کسی حدیث میں مشروع نہیں ہوا تو ہمیں اس سے اختلاف نہیں لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ شب معراج میں معراج کا اہتمام بھی ناجائز اور بدعت ہے۔ ارشادِ خداوندی "وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ" اور "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" اس امر کی روشن دلیل ہے کہ جن دنوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے خاص اور اہم واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ان کو یاد دلانا عین منشاء قرآن کے مطابق ہے۔

☆ نیز اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر ارشادِ خداوندی کی تکمیل ہے۔ واقعہ معراج سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی شان قدرت کے ظہور کا اور کون سا واقعہ ہوگا؟ اور شب معراج اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں اپنے حبیب ﷺ کے وسیلہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت کو عطا فرمائیں ان کا انکار کون کر سکتا ہے؟ پھر اس رات کی یاد دہانی، اس کا ذکر اور بیان ہماری پیش کردہ آیاتِ قرآنیہ کی روشنی میں کیونکر بدعت قرار پا سکتا ہے؟ رہا یہ امر کہ سلف میں اس کا رواج نہ تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ عدم نقل عدم وجود کو مستلزم نہیں۔ اس لئے محض منقول نہ ہونے سے اس کا عدم ثابت نہیں ہوتا اور ہمارے لئے اتنا کافی ہے کہ اس کی ممانعت کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں اور اس میں ایسا کوئی کام شامل نہیں جس پر شرع مطہرہ میں نہی وارد ہوئی ہو۔ اس کی دلیل خلافت صدیقی میں قرآن مجید کا جمع کیا جانا ہے۔ جس کے متعلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تھا کیف تفعل شیئا لم یفعله رسول اللّٰه ﷺ پھر حضرت زید بن ثابت نے صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما دونوں سے عرض کیا کیف تفعلون شیئا لم یفعلهٗ رسول اللّٰه ﷺ (آپ وہ کام کیسے کریں گے جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا؟)

☆ فاروقِ اعظم نے صدیق اکبر کو پھر صدیق اکبر نے زید بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہی جواب دیا ھو واللّٰه خیر (بے شک حضور ﷺ نے نہیں کیا لیکن) خدا کی قسم وہ خیر ہے۔ (بخاری شریف ج ۲ ص ۷۴۵)

☆ معلوم ہوا کہ جس کام سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے منع نہ فرمایا ہو اور اس میں خیر کا پہلو پایا جائے تو وہ بظاہر بدعت معلوم ہوتا ہے لیکن بباطن حسن اور خیر ہے۔ لہٰذا اگر بفرض محال یہ ثابت بھی ہو جائے کہ سلف صالحین میں شب معراج کے اہتمام کا رواج نہ تھا تب بھی اس اہتمام اور ذکر معراج کو بدعت اور ناجائز نہیں کہہ سکتے تاوقتیکہ اس اہتمام میں کوئی ایسا عمل نہ کیا جائے جو شرعاً ممنوع ہو۔ اور ہم آیاتِ قرآنیہ کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں کہ ایام اللہ کا یاد دلانا اور نعمائے الٰہیہ کا بیان منشاء قرآن کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا شب معراج منانا اور اس میں واقعاتِ معراج بیان کرنا جائز، مستحب اور باعث رحمت و برکت ہے۔ اس کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں صاحب معراج ﷺ کی دشمنی اور عداوت ہو۔ نعوذ باللّٰہ من ذٰلک۔

☆ رہا یہ امر کہ شب معراج کے بارے میں اختلافِ اقوال اس امر کی دلیل ہے کہ سلف کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی ورنہ اختلاف نہ ہوتا۔

☆ تو اس کے متعلق عرض کروں گا کہ اگر دن، تاریخ اور مہینہ کے اختلاف کو اس بات کی دلیل مان لیا جائے کہ سلف کے نزدیک اس رات کی کوئی اہمیت نہ تھی، نہ ان کے زمانے میں اس کے منانے کا کوئی رواج تھا تو سنہ معراج کا اختلاف اس بات کی دلیل بن جائے گا کہ معراج سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی۔ اگر ہوتی تو اس کے سنہ میں اختلاف نہ ہوتا۔ ہمارے نزدیک سنہ معراج کا اختلاف اس بات کی روشن دلیل ہے کہ معراج کے دن، تاریخ اور مہینہ کے بارے میں اختلافِ اقوال محض اختلافِ روایات پر مبنی ہے۔ بیانِ معراج کے اہتمام اور شب معراج کی اہمیت سے اس کو متعلق کرنا درست نہیں۔ کیونکہ دن، تاریخ اور مہینہ کو شب معراج منانے اور بیانِ معراج کے اہتمام میں دخل ہو سکتا لیکن سنہ معراج اس اہتمام سے بالکل غیر متعلق ہے لیکن اس کے باوجود بھی اس میں اختلافِ شدید موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ اختلافِ اقوال کو شب معراج منانے اور اس کے اہتمام سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر بقول معترض ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ اختلافِ اقوال اسی وجہ سے ہے کہ سلف کے زمانے میں شب معراج منانے کا کوئی رواج نہ تھا اور ان کے نزدیک شب معراج کی کوئی اہمیت نہیں تھی تو میں دریافت کروں گا کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ و دیگر عبادات و اکثر و بیشتر معاملات میں سلف کے درمیان شدید اختلافات واقع ہوئے۔ مثلاً نماز میں رفع یدین، آمین بالجہر، قرأت خلف الامام، رکعت وتر، تعداد تراویح، تعین یوم عاشورہ، تکبیراتِ عیدین وغیرہ بے شمار مسائل میں صحابہ کرام، تابعین مجتہدین کے درمیان اختلاف اقوال کسی سے مخفی نہیں تو کیا اس اختلاف اقوال کی بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ سلف صالحین کے زمانہ میں روزہ نماز وغیرہ کا کوئی رواج نہ تھا اور ان کے نزدیک ان فرائض و واجبات اور امورِ مسنونہ اعمال حسنہ کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ کوئی ذی ہوش ایسی بات کی جرأت نہ کر سکے گا۔ معلوم ہوا کہ اختلافِ اقوال عدم رواج یا عدم اہتمام کی وجہ سے نہیں بلکہ اختلافِ روایات کی وجہ سے ہے۔

دیارِ عرب میں رجبی شریف

☆ روح البیان اور ماثبت السنۃ کی عبارت سے واضح ہے کہ لوگوں میں شب معراج منانے کا دستور تھا۔ بالخصوص دیارِ عرب کے

باشندے اس مبارک رات کی عظمت واہمیت کے قائل تھے۔ دیکھئے روح البیان میں ہے

وهي ليلة سبع وعشرين من رجب ليلة الاثنين وعليه عمل الناس۔ (روح البيان ج ۵ ص ۱۰۳)

ترجمہ☆ ''شب معراج رجب کی ۲۷ تاریخ ہے اور اسی پر لوگوں کا عمل ہے۔''

☆ معلوم ہوا کہ لوگ اس رات کچھ نہ کچھ کرتے تھے اور ما ثبت بالسنۃ میں ہے اعلم انهٔ قد اشتهر بديار العرب فيما بين الناس ان معراجهٔ ﷺ بسبع وعشرين من رجب وموسم الجبية فيه متعارف بينهم. الخ (ما ثبت بالسنۃ ص ۱۹۱)

''جاننا چاہئے کہ دیارِ عرب میں لوگوں کے درمیان مشہور ہے کہ حضور ﷺ کی معراج شریف ۲۷ رجب کو ہوئی اور رجبی کا موسم عرب میں اہل عرب کے درمیان مشہور و متعارف ہے۔''

☆ الحمد للہ! رجبی شریف کے منانے کو بدعت کہنے والوں کا قول باطل ہو گیا اور حق کی وضاحت ہو گئی۔

والحمد للّٰہ علیٰ احسانہٖ۔

ختم نبوت

اگر بارگاہِ نبوت سے کسی کو فیض نہ پہنچے اور آفتابِ نبوت کی شعاعیں کس کے دل کو نہ چمکائیں تو اس کو ہرگز کوئی فضل و کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کے دل میں کوئی نور پیدا ہو سکتا ہے۔ ہر فضل و کمال کا سرچشمہ صرف نبوت اور رسالت ہے۔

ختم نبوت

☆ مرزائیوں نے مرزا صاحب کی نبوت غیر تشریعی ثابت کرنے کے لئے بعض اکابر صوفیائے کرام مثلاً شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اور امام عرانی علیہ الرحمۃ کی عبارات سے استدلال کیا ہے۔ تحقیق مقام کے لئے ہمیں سب سے پہلے مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں مرزا صاحب کے عجیب متضاد بیانات ہیں۔ کہیں تو مرزا صاحب اپنے آپ کو غیر تشریعی نبی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جس جس جگہ میں نے نبوت اور رسالت سے انکار کیا ہے صرف ان معنوں سے کیا ہے کہ میں مستقل طور پر کوئی شریعت لانے والا نہیں ہوں اور نہ میں مستقل طور پر نبی ہوں مگر ان معنوں سے کہ میں نے اپنے رسول مقدا سے باطنی فیوض حاصل کر کے اور اپنے لئے اسی کا نام پا کر اسی کے واسطہ سے خدا کی طرف سے علم غیب پایا ہے۔ رسول اور نبی ہوں مگر بغیر کسی جدید شریعت اس طور کا نبی کہلانے سے میں نے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ ان ہی معنوں سے خدا نے مجھے رسول اور نبی کہہ کر پکارا ہے سو اب بھی میں انہی معنوں سے نبی اور رسول ہونے سے انکار نہیں کرتا۔ الخ (اشتہار ایک غلطی کا ازالہ ص ۴) اس عبارت میں مرزا صاحب نے صاف لفظوں میں غیر تشریعی نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اب اس کے خلاف نبوت تشریعی کا دعویٰ ملاحظہ فرمائیے۔

☆ اگر کہو کہ صاحب الشریعت افتراء کر کے ہلاک ہوتا ہے نہ ہر ایک مفتری تو اول تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ خدا نے افتراء کے ساتھ شریعت کی کوئی قید نہیں لگائی ماسوائے اس کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر اور نہی بیان کئے اور اپنی امت کے لئے ایک قانون مقرر کیا وہی صاحب الشریعۃ ہو گیا۔

☆ پس اس تعریف کی رو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہیں اور نہی بھی ص ۶ ۷ اربعین ۴۔

☆ اس عبارت میں مرزا صاحب نے کھلے لفظوں میں اپنے آپ کو صاحب الشریعۃ کہا ہے۔ کہیں سرے سے مکر جاتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے اپنی نبوت کا صفایا کر دیتے ہیں فرماتے ہیں "نبوت کا دعویٰ نہیں بلکہ محدثیت کا دعویٰ ہے جو کہ بحکم خدا کیا گیا۔" (ازالہ اوہام طبع دوم ص ۱۱۴)

☆ لاہوری مرزائی عام مسلمانوں کو گمراہ کرنے کیلئے مرزا صاحب کی وہ عبارتیں پیش کر دیتے ہیں جن میں نبوت کا انکار معلوم ہوتا ہے۔

☆ اور قادیانی مرزائی ! عوام کو بہکانے کے لئے غیر تشریعی نبوت والی عبارتیں دکھا دیتے ہیں۔ مرزائی اگر مرزا صاحب کو سچا سمجھتے ہیں تو قطعی طور پر انہیں صاحب شریعۃ مانتے ہوں گے کیونکہ اربعین کی عبارت منقولہ بالا میں مرزا صاحب نے غیر مبہم طور پر اپنے آپ کو صاحب شریعت قرار دیا ہے۔

☆ لیکن ختم نبوت کے دلائل سے تنگ آ کر قادیانی مرزائی اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ مرزا صاحب غیر تشریعی نبی ہیں۔ صرف تشریعی نبوت ختم ہوئی، غیر تشریعی جاری ہے۔

☆ نبوت کی دو قسمیں "تشریعی و غیر تشریعی" جن معنی میں مرزائیوں نے بیان کی ہیں وہ قرآن و حدیث اور دلائل شرعیہ کے بالکل خلاف ہیں۔ کوئی نبی ایسا نہیں ہوا جو صاحب الشریعت نہ ہو۔ مرزائیوں کو نبوت کی اس تقسیم کے دعویٰ کی دلیل میں نہ کوئی قرآن کی آیت ہاتھ آئی نہ کوئی حدیث البتہ حضرات صوفیائے کرام مثلاً شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اور امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کی بعض عبارات سے انہوں نے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کی۔ اول تو مرزائیوں کو شرم و حیا سے کام لینا چاہئے کہ جن صوفیاء کرام کو مرزا صاحب نے ملحد اور زندیق قرار دیا ہے ان ہی کے اقوال و عبارات کو مرزا صاحب کی نبوت کی دلیل میں پیش کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو "رسالہ تحریر اور خط" مرزا صاحب نے ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کو وحدت الوجود کا حامی بتایا اور وحدت الوجود کے قائلین کو ملحد اور زندیق کہا۔

☆ قبل اس کے کہ ہم ان حضرات صوفیاء کی عبارات پیش کر کے اس مسئلہ کو واضح کریں اور مرزائیوں کی افتراء پردازی کا جواب لکھیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر صوفیاء کے مسلک اور ان کے مقصد کو بوضاحت بیان کر دیں۔

☆ حقیقت یہ ہے کہ صوفیائے کرام کی مقدس جماعت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ تزکیہ باطن و صفائی قلب کے بعد اپنے دل و دماغ اور روح کو انوارِ معرفت سے منور کریں اور فیوض و برکات سے مستفیض ہو کر خدائے تعالیٰ کی معرفت اور اس کا قرب حاصل کریں ظاہر ہے

کہ یہ فیوض و برکات اور انوار و کمالات آفتابِ نبوت ہی کی شعاعیں ہیں اور حضور سید عالم ﷺ کی نبوت اور رسالت ہی کا فیض ہے۔ اگر بارگاہِ نبوت سے کسی کو فیض نہ پہنچے اور آفتابِ نبوت کی شعاعیں کسی کے دل کو نہ چمکائیں تو اس کو ہرگز کوئی فضل و کمال حاصل نہیں ہو سکتا نہ اس کے دل میں کوئی نور پیدا ہو سکتا ہے۔ ہر فضل و کمال کا سرچشمہ صرف نبوت اور رسالت ہے۔

☆ اس مقام پر یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ جب نبوت حضور ﷺ پر ختم ہو گئی اور آپ نے بابِ نبوت کو مسدود فرما دیا تو شاید وہ تمام فیوض و برکات بھی بند ہو گئے جو بارگاہِ نبوت سے وابستہ تھے اور نبوت کا دروازہ بند ہو جانے کی وجہ سے کسی کو مقامِ نبوت سے کسی قسم کا کوئی فیض نہیں پہنچ سکتا۔ اگر یہ صحیح ہو اور ختم نبوت کا یہی مفہوم لیا جائے کہ نبوت کا دروازہ بند ہو جانے سے مقامِ نبوت کے تمام فیوض و برکات بند ہو گئے تو صوفیائے کرام کا ریاضت و مجاہدہ کرنا اور صفائی باطن اور تزکیہ نفس کر کے مقامِ نبوت کے فیوض و برکات اور آفتابِ رسالت کے انوار سے مستفیض و مستنیر ہونے کی امید رکھنا بھی لغو و بے معنی ہو گا اور اس طرح صوفیائے کرام کا تمام سلسلہ تصوف اور جد و جہد سب بیکار اور لغو ہو جائے گی۔ اس شبہ کو دور کرنے اور مقصد تصوف کو کامیاب بنانے کے لئے صوفیائے کرام کا فرض تھا کہ وہ یہ بتائیں کہ ختم نبوت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مقامِ نبوت اس طرح ختم ہو گیا کہ اب کسی کو کوئی فضل و کمال نبوت کے دروازہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ شبہ وسوسۂ شیطانی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ فیضانِ نبوت جاری ہے اور ہر صاحب فضل و کمال کو اس کی استعداد کے موافق جو کمال ملا ہے یا ملے گا اس کا سرچشمہ مقامِ نبوت ہی ہے اور ختم نبوت کے معنی صرف یہ ہیں کہ کسی کو امر و نہی کے ساتھ مخاطب نہیں کیا جائے گا اور شریعت نہیں دی جائے گی۔ اس کو امر و نہی کے ساتھ مخاطب کرنا ہی تشریع ہے۔ عام اس سے کہ وہ امر و نہی قدیم ہو یا جدید شریعت و نبوت میں کچھ فرق نہیں۔ نبوت شریعت ہے اور شریعت نبوت۔ کوئی نبی ایسا نہیں ہوا جس کو اللہ تعالیٰ نے کسی امر و نہی سے مخاطب نہ فرمایا ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا "فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ۔" (پ: البقرۃ، آیت: ۲۱۰) ہر نبی تبشیر اور انذار پر مامور ہوتا ہے اور یہی شریعت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد نبی نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ مقامِ نبوت کے فیوض و برکات بند ہو گئے لیکن فیوض و برکات نبوت جاری ہونے کا یہ مطلب بھی لینا بالکل غلط اور باطل ہے کہ فیضانِ نبوت سے کوئی نبی بن سکتا ہے۔ دیکھئے تمام عالم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی رحمتوں سے مستفید ہو رہا ہے اور بارگاہِ الوہیت سے ہر قسم کے فیوض و برکات بندوں کو حاصل ہو رہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بندے فیضانِ الوہیت سے الوہیت کا درجہ بھی پا سکتے ہیں۔ حضرات صوفیائے کرام نے اپنی عبارات میں غیر مبہم طور پر اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ فیضانِ نبوت جاری ہونے سے ہماری مراد یہ نہیں کہ نبوت اور شریعت جاری ہے بلکہ امر و نہی کا دروازہ قطعاً مسدود ہو چکا ہے اور جو شخص رسول اللہ ﷺ کے بعد اس بات کا دعویٰ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی بات کا امر فرمایا ہے یا کسی نہی سے مخاطب کیا ہے تو ایسا شخص مدعی نبوت و شریعت ہے۔ اگر وہ احکام شرع کا مکلف ہے تو ہم ایسے شخص کی گردن مار دیں گے۔ ملاحظہ ہو (الیواقیت والجواہر جلد دوم ص ۳۸)

فان قال ان اللّٰه امرنی بفعل المباح قلنا له لا یخلوا ان یرجع ذالك المباح واجبا فی حقك او مندوبا وذالك عین نسخ الشرع الذی انت علیه حیث صیرت بالوحی الذی زعمته المباح الذی قرره الشارع مباحا مامور ابه یعصی العبد

بتر که وان ابقاه مباحا کما کان فی الشریعة فای فائدة لهذا الامر الذی جاء به ملك وحی هذا المدعی۔ الخ۔

☆ اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک مباح کام کا امر فرمایا ہے تو ہم اس سے کہیں گے کہ یہ امر دو حال سے خالی نہیں یا یہ کہ جس مباح کام کا اللہ تعالیٰ نے تجھے امر فرمایا ہے وہ تیرے حق میں واجب ہو گیا مندوب، یہ دونوں صورتیں اس شریعت کے حق میں ناسخ قرار پائیں گی جس پر تو قائم ہے۔ اس لئے کہ جس کام کو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مباح رکھا تھا تو نے اسے اپنی وحی مزعوم کے ساتھ مامور بہ یعنی ضروری اور واجب (یا مستحب) قرار دے لیا، جس کے ترک سے بندہ گنہگار یا تارک افضل ہوتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس امر مباح کو تیرے حق میں مباح ہی رکھا جیسا کہ وہ شرعاً پہلے سے مباح تھا تو تیری اس وحی اور امر سے کیا فائدہ ہوا؟

☆ اس کے بعد امام شعرانی فتوحاتِ مکیہ سے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت نقل فرماتے ہیں

وقال الشیخ ایضًا فی الباب الحادی والعشرین من الفتوحات من قال ان اللّٰہ تعالٰی امرہ بشیء فلیس ذٰلك بصحیح انما ذالك تلبیس لان الامر من قسم الکلام وصفته وذالك باب مسدود دون الناس۔ الخ

☆ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فتوحاتِ مکیہ کے اکیسویں باب میں فرماتے ہیں جو شخص اس بات کا دعویٰ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کوئی امر فرمایا ہے تو یہ ہرگز صحیح نہیں، یہ تلبیس ابلیس ہے۔ اس لئے کہ امر کلام کی قسم سے ہے اور یہ دروازہ لوگوں پر بند ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں

فقد بان لك ان ابواب الاوامر الالٰهية والنواهی قد سدت وکل من ادعاها بعد محمد ﷺ فهو مدع شریعة اوحی لها الیه سواء وافق شرعنا او خالف فان کان مکلفا ضربنا عنقهٗ والاضربنا عنه صفحا۔

☆ یہ بات تم پر بخوبی واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کا دروازہ بند ہو چکا ہے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد جو شخص بھی اس امر کا مدعی ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے امر و نہی پہنچا ہے وہ مدعی شریعت ہے عام اس سے کہ جن اوامر ونواہی کا وہ مدعی ہے وہ ہماری شرع کے موافق ہو یا مخالف، وہ بہر کیف مدعی شریعت ہی قرار پائے گا۔ اگر وہ عاقل و بالغ ہے تو ہم اس کی گردن مار دیں گے ورنہ اس سے پہلو تہی کریں گے۔ (الیواقیت والجواہر ج ۲ ص ۳۸ طبع مصر)

☆ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ صاحب فتوحاتِ مکیہ اور امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کی ان تصریحات سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ جو شخص اس امر کا مدعی ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے امر و نہی کے ساتھ مخاطب فرمایا ہے وہ مدعی شریعت ہے نیز یہ کہ حضراتِ صوفیاء کرام کے نزدیک شریعت کے معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر و نہی ہونے کے سوا کچھ نہیں۔ اب مرزا صاحب کی تصریحات سامنے رکھ کر دیکھ لیجئے کہ وہ من جانب اللہ امر و نہی پانے کے مدعی ہیں یا نہیں۔

☆ اربعین ۴ ص ۶ ۷ کی یہ عبارت ہم تفصیل سے نقل کر چکے ہیں کہ مرزا صاحب نے فرمایا یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر اور نہی بیان کئے اور اپنی امت کے لئے ایک قانون مقرر کیا وہی صاحب الشریعۃ ہو گیا۔

☆ بس اس تعریف کی رو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہیں اور نہی بھی۔

☆ مرزا صاحب کی اس عبارت سے دو باتیں بالکل واضح ہو گئیں۔ ایک یہ کہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اور امام شعرانی

رحمۃ اللہ علیہ نے شریعت کے جو معنی بیان فرمائے ہیں مرزا صاحب نے ان پر مہر تصدیق ثبت فرمادی۔ دوسری یہ کہ مرزا صاحب حضرات صوفیاء کرام اور خود اپنی تصریح کے مطابق مدعی شریعت ہیں۔

☆ اب میں ان مرزائی دوستوں سے دریافت کرتا ہوں جنہوں نے شیخ اکبر محی الدین عربی رحمۃ اللہ علیہ اور امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان حضرات کے نزدیک نبوت تشریعی ختم ہو گئی، غیر تشریعی جاری ہے لہٰذا مرزا صاحب کا غیر تشریعی نبی ہونا درست ہو گیا۔ کس حد تک ان عبارات سے آپ کو فائدہ پہنچا؟ صوفیاء تو آپ کے لئے اغیار کا حکم رکھتے ہیں۔

☆ خود مرزا صاحب جو آپ کے غم خوار ہیں اور جن کی نبوت غیر تشریعی کی خاطر آپ نے اس قدر پاپڑ بیلے انہوں نے بھی آپ کا ساتھ نہ دیا اور بول اٹھے کہ میری وحی میں امر بھی ہیں اور نہی بھی اور اس طرح میں صاحب شریعۃ ہوں۔

مدعی سست گواہ چست والا معاملہ ہوا۔

☆ ناظرین کرام نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ نبوت تشریعی کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر و نہی پانا۔

☆ چونکہ وحی منجانب اللہ امر و نہی کے ساتھ مخاطب ہونا ہے اس لئے ہر نبی تشریعی ہوتا ہے۔ اب اس کے بالمقابل نبوت غیر تشریعی کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں رہتے کہ من جانب اللہ تعالیٰ امر و نہی کا خطاب پانے کے علاوہ جس قدر فضائل و کمالات ہیں مثلاً ولایت، قطبیت، غوثیت، عرفان و قرب الٰہی، مدارج سلوک وغیرہ انوار و برکاتِ نبوت غیر تشریعی ہیں کیونکہ ان سب کا سرچشمہ مقام نبوت ہی ہے۔

☆ اس لئے اگر صوفیاء نے یہ کہہ دیا کہ نبوت غیر تشریعی جاری ہے یعنی نبوت کے فیوض و برکات بند نہیں ہوئے امت مسلمہ انوار و برکاتِ نبوت سے فیض یاب ہو رہی تو یہ قول اپنے مرادی معنی کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔

☆ مرزائیوں کا یہ کہنا کہ ہم مرزا صاحب کو غیر تشریعی نبی مانتے ہیں مسلمانوں کو دھوکا اور فریب دینا ہے۔

☆ مرزا صاحب نے اپنے دعوے کے منکرین کو جہنمی، نا مسلمان اور غیر ناجی کا فرقہ قرار دیا ہے۔

☆ ''ہر ایک شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہے۔'' (مکتوبات مرزا بنام ڈاکٹر عبد الحکیم درحقیقۃ الوحی ص ۱۶۳)

☆ ''جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا رسول کو بھی نہیں مانتا۔'' (حقیقۃ الوحی ص ۱۶۳)

☆ ''(اے مرزا) جو شخص تیری پیروی نہ کرے گا اور بیعت میں داخل نہ ہو گا وہ خدا رسول کی نافرمانی کرنے والا اور جہنمی ہے۔'' (رسالہ معیار الاخیار ص ۸)

☆ ''خدا تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لئے اس (میری وحی) کو مدار نجات ٹھہرایا۔'' (حاشیہ اربعین ص ۷)

☆ ان عبارات سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے منکرین کو کافر جہنمی قرار دیا۔ اب مرزا صاحب کی

اس عبارت کو بھی پڑھ لیجئے، نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

☆ ''یہ نتیجہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اپنے دعوے کے انکار کرنے والوں کو کافر کہنا، یہ صرف ان نبیوں کی شان ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت اور احکام جدیدہ لاتے ہیں۔ لیکن صاحب شریعت کے ماسوا جس قدر ملہم اور محدث گزرے ہیں کہ وہ کیسی ہی جناب الٰہی میں اعلیٰ شان رکھتے ہوں اور خلعت مکالمہ الٰہیہ سے سرفراز ہوں ان کے انکار سے کوئی کافر نہیں بن جاتا۔'' (تریاق القلوب حاشیہ ص ۳۲۵ طبع دوم)

☆ مرزا صاحب اپنے منکیرین کو کافر بھی کہہ رہے ہیں اور یہ بھی فرما رہے ہیں کہ صرف اس نبی کا منکر کافر ہوتا ہے جو شریعت اور احکام جدیدہ لائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا صاحب احکام جدیدہ اور شریعت کے مدعی ہیں۔

☆ قارئین کرام ازراہِ انصاف بتائیں کہ مرزا صاحب کی نبوت تشریعی کے دعوے میں اب بھی کچھ کلام کی گنجائش ہے۔

☆ پھر مرزائیوں کا یہ کہنا کہ مرزا صاحب غیر تشریعی نبوت کے مدعی ہیں سراسر دجل وفریب نہیں تو کیا ہے؟

تعارف حدیث

فضیلت حدیث	ضرورت حدیث
حجیت حدیث	کتابت حدیث
تدوین حدیث	فضیلت حفظ حدیث

علم اصول حدیث کی بعض ضروری اصطلاحات

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا اجمالی تعارف

امام بخاری وامام مسلم کے مختصر حالات

فضیلت حدیث

(۱) حدیث کی فضیلت کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ اس کے قائل صاحب لولاک، باعث تخلیق کائنات، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جن کے فضائل ومکارم اور محامد ومدائح کا احصا کسی بشر کے لئے ممکن نہیں۔

(۲) امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو شخص رضائے الٰہی کا متمنی ہو اس کے لئے میرے علم میں علم حدیث سے افضل کوئی علم نہیں۔ حدیث وہ علم ہے جس کی طرف لوگ اپنے کھانے پینے اور شب وروز کی تمام ضروریات میں محتاج ہیں۔

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، نضر اللّٰہ امرء سمع مقالتی فحفظها ووعاها واداها فرب حامل فقه الی من هو افقه منه رواه الشافعي والبيهقي۔

یعنی خوشحال کرے اللہ اس آدمی کو جس نے میری بات سنی اور اس کو یاد رکھا اور دل کی گہرائیوں میں اسے محفوظ کر کے دوسرے تک پہنچا دیا کیونکہ اکثر حامل فقہ ایسے شخص کی طرف فقہ لے جانے والا ہوتا ہے جو اس سے زیادہ فقیہ ہے۔

(۴) اسی مضمون کی حدیثیں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بروایت ابی داؤد، ترمذی، دینار، ابن حبان مروی ہیں۔

(۵) مسلمانوں میں حدیثیں پھیلانا سنن دین کی اشاعت اور جماعت مسلمین کی عظیم خیر خواہی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کام انبیاء علیہم السلام کے معمولات سے ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنی احادیث روایت کرنے والوں کو اپنا خلیفہ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے طبرانی نے اوسط میں روایت کی۔

(۶) امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تدریب الراوی میں فرمایا کہ علم حدیث اشرف العلوم ہے کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ کے ساتھ تعلق اور رابطہ کا موجب ہے۔ اس علم میں حضور ﷺ کے اس اقوال وافعال سے بحث کی جاتی ہے۔

(۷) اس کے اشرف العلوم ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ باقی علوم شرعیہ کے لئے اس کی طرف ضرورت واقع ہوتی ہے۔ علم فقہ میں اس کی احتیاج ظاہر ہے اور علم تفسیر میں حدیث کی ضرورت اس لئے ہے کہ جب تک رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل پر نظر نہ کی جائے، کلام الٰہی سے مرادِ خداوندی ظاہر نہیں ہوتی یعنی قرآن کریم کا علم حدیث کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ معنی کو بغیر جانے عمل ممکن نہیں۔ اس لئے تفسیر قرآن اور عمل بالقرآن دونوں کا مدار حدیث پر ہے۔ موقوف علیہ موقوف پر مقدم ہوتا ہے لہٰذا علم حدیث علم تفسیر پر مقدم اور اس سے اشرف ہے۔

(۸) شرافت وفضیلت علم حدیث کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہر علم کی فضیلت اس کے موضوع کی فضیلت کے مطابق ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ علم حدیث کا موضوع رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ ہے اور حضور ﷺ افضل الخلق ہیں۔ لہٰذا علم حدیث بھی افضل العلوم قرار پائے گا۔

ضرورتِ حدیث

☆ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید ایسی جامع کتاب ہے جس میں عقائد واعمال، عبادات واخلاق، حلت وحرمت کے احکام اور بنی نوع انسان کی تمام جسمانی اور روحانی ضرورتوں کے پورا ہونے اور دونوں جہان کی فوز وفلاح حاصل کرنے کے اصول موجود ہیں لیکن یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ ان اصولوں کی ایسی تشریحات جو پیش آنے والی ضروریات کے تمام جزئیات پر منطبق ہو جائیں قرآن مجید میں مذکور نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک وہ تشریحات سامنے نہ آ جائیں اس وقت تک قرآنی اصول کے مطابق عمل نہیں ہو سکتا اور کوئی شخص اپنی زندگی کو اصول قرآنیہ کے مطابق بسر نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کو بحیثیت مسلمان ہونے کے حدیث کی اشد ضرورت ہے۔

استدراک

☆ اگر اس مقام پر یہ شبہ وارد کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو کتاب مفصل قرار دیا ہے اور اس کے حق میں "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" فرمایا ہے تو ایسی صورت میں یہ کہنا کہ اصول قرآنیہ کے لئے قرآن کے علاوہ کسی تشریح کی ضرورت ہے کیونکر صحیح ہوگا؟

☆ تو ہم جواباً عرض کریں گے کہ قرآن مجید میں جہاں تبیان و تفصیل اور بیان وغیرہ کے الفاظ وارد ہیں ان کا یہ مطلب نہیں کہ اصول قرآن کی وہ تمام تشریحات قرآن مجید میں بیان کردی گئی ہیں جو ہر شخص کے لئے قیامت تک پیش آنے والے تمام واقعات کی جزئیات کو حاوی ہوں۔ کیونکہ یہ مطلب قرآن مجید کی روشنی میں غلط ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے "اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ" قرآن مجید میں ارشاد فرمایا اور نماز اور زکوٰۃ کے بنیادی اصول بھی قرآن مجید ہی میں بیان فرمائے لیکن اصولوں کی تشریحات مثلاً ارکان صلوٰۃ کی ترتیب، تعدادِ رکعت، مقادیرِ زکوٰۃ اور ان کے شرائط و دیگر احکام تفصیلیہ قرآن مجید میں کہیں مذکور نہیں۔ اب اگر تفصیلاً "لِكُلِّ شَيْءٍ" اور "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" کا یہی مطلب لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہی تمام مسائل جزئیہ کی تفصیلات و تشریحات کھلے طور پر بیان فرمادی ہیں تو یہ بات بالکل خلاف واقع ہوگی جو کذب محض ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے قطعاً پاک ہے۔ معلوم ہوا کہ تفصیل و تبیان سے احکام جزئیہ کی لفظی تفصیل و تشریح مراد نہیں بلکہ وہ معنی تشریح مراد ہے جو الفاظ قرآن کے نزول کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو ان کے نورِ نبوت کی روشنی میں عطا فرمائی۔ قرآن مجید کی آیات مخاطب کے لئے اس قدر روشن، مفصل اور واضح ہیں جسکے بارے میں کسی قسم کا اشتباہ پیدا نہیں ہوتا اور جسکو اس کلام پاک کا مخاطب کیا گیا ہے وہ مکمل شرح و بسط کے ساتھ اسے سمجھتا ہے۔

قرآن کا مخاطب

☆ قرآن کریم کا بالواسطہ مخاطب ہر وہ شخص ہے جو احکام خداوندی کا مکلّف ہے اور بلاواسطہ اس کے مخاطب صرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جس مخاطب کے لئے ہم نے قرآن مجید کو "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" مانا ہے۔ اس سے ہماری مراد مخاطب بلاواسطہ ہے۔

☆ ہمارے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو اصول بیان فرمائے ہیں وہ سب بلکہ جملہ آیاتِ قرآنیہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں بیان و تبیان اور تفصیل کا حکم رکھتی ہیں اور قرآن مجید کا ایک لفظ بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اس طرح نازل نہیں ہوا کہ اس کو سن کر مراد الٰہی کے سمجھنے میں رسول اللہ ﷺ کو کسی قسم کا کوئی اشتباہ واقع ہو۔ یہ نہیں کہ ہر شخص قرآن سن کر مرادِ الٰہی کی تفصیلات و تشریحات کو بخوبی سمجھ لے۔ بلکہ دوسروں کے لئے ان تشریحات کا سمجھانا اور کتاب اللہ کی تعلیم دینا رسول اللہ ﷺ کا منصب ہے۔ اسی لئے ارشاد فرمایا "يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" (س: آل عمران، آیت: ۱۶۴)

☆ تلاوتِ آیات کے بعد تعلیم کتاب کے معنی صرف یہ ہیں کہ اصول قرآنیہ اور آیاتِ کتاب کی تفصیل و تشریح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خاص ہے۔

☆ نیز فرمایا "وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ" (س: النحل، آیت: ۴۴) "اور ہم نے آپ کی

طرف ذکر نازل کیا تا کہ آپ بیان کردیں لوگوں کے لئے اس چیز کو جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔"

☆ جب ذکر اور "مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ" سے کتاب اللہ ہی مراد ہے جسے کتاب مفصل اور "تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ" فرمایا گیا تو مفصل کی تفصیل اور تبیانا کا بیان کیونکر ممکن ہوگا؟ جو چیز ہر شے کا بیان کرنے والی ہو اس کا بیان تحصیل حاصل نہیں تو اور کیا ہے؟ ثابت ہوا کہ قرآن مجید کا "تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ" اور کتاب مفصل ہونا رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات سے ہے۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن مجید کا دوسروں کے لئے تبیان و تفصیل نہ ہونا اس لئے نہیں کہ قرآن ناقص ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ اس نورِ نبوت سے محروم ہیں جس کا ہونا "تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ" کے لئے ضروری ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

☆ آیت قرآنیہ "وَهُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا" (س: انعام، آیت: ۱۱۴) میں اِلَیۡکُمُ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن سب کے لئے مفصل و مبین ہے۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بالواسطہ مخاطبین مراد ہیں جو ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے متعلق "لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ" فرمایا گیا۔ معلوم ہوا کہ ان کے حق میں کتاب کا مفصل ہونا بلاواسطہ نہیں بلکہ بالواسطۂ رسول کریم ﷺ ہے۔

خلاصہ یہ کہ آیات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ تعلیم کتاب اور "مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ" کا بیان وظائف نبوت سے ہے اور اسی بیان اور تعلیم اور تشریح کو سنت اور حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی ضرورت اس قدر اہم ہے کہ اس کے بغیر قرآن کا سمجھنا ممکن ہے نہ اس پر عمل کرنا۔

حجیت حدیث

☆ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو واجب القبول اور واجب العمل قرار دیا وہی ہمارے لئے حجت شرعیہ ہے۔ قرآن مجید میں صاف مذکور ہے "مَاۤ اٰتٰىکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ وَمَا نَهٰىکُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا" رسول تمہیں جو کچھ دے دیں وہ لو اور جس چیز سے وہ روک دیں اس سے روک جاؤ۔ عہد رسالت سے لے کر آج تک امت مسلمہ اس امر پر متفق ہے کہ اس آیت میں لفظ "ما" اپنے عموم پر ہے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ کے تمام ارشادات شامل ہیں۔ بخاری اور مسلم کی متفق علیہ حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ام یعقوب آئیں اور انہوں نے دریافت کیا کہ آپ نے گوندھنے اور گوندھوانے والی اور پیشانی کے بال اکھاڑنے والی اور اپنے دانتوں کو کشادہ کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس پر کیوں لعنت نہ کروں جس پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی اور جو کتاب اللہ میں ملعون ہے۔ ام یعقوب نے کہا میں نے سارا قرآن پڑھا ہے اس میں کہیں میں نے وہ بات نہیں پائی جو آپ فرما رہے ہیں۔ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا اگر تم اسے پڑھتیں تو ضرور پا لیتیں۔ کیا تم نے قرآن میں یہ نہیں پڑھا "مَاۤ اٰتٰىکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ وَمَا نَهٰىکُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا" ام یعقوب بولیں کیوں نہیں! یہ آیت تو میں نے قرآن میں ضرور پڑھی ہے۔ عبداللہ بن مسعود نے

فرمایا کہ حضور ﷺ نے ان کاموں سے منع فرمایا ہے یعنی وہ "مَا نَهَاكُمْ" میں داخل ہیں اور بحکم خداوندی "فَانْتَهُوْا" ان سے بچنا ضروری ہے۔ دیکھئے بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۱۵، مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۰۵ "اصح المطابع"

☆ معلوم ہوا کہ عہد رسالت ہی سے اس آیت کریمہ کے یہ معنی سمجھ لئے گئے تھے کہ کسی حکم شرعی کی دلیل قرآن مجید کے صریح الفاظ ہی نہیں بلکہ رسول کریم ﷺ کے ارشادات بھی حجت شرعیہ ہیں۔ نیز ارشادِ ربانی ہے "فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا" اس آیت کریمہ میں واضح طور پر موجود ہے کہ ہر اختلاف میں رسول اللہ ﷺ کو حکم بنانا اور حضور ﷺ کے ہر فیصلہ کو بدل وجان تسلیم کرنا مدارِ ایمان ہے۔ "مَا قَضَيْتَ" میں "مَا" اپنے عموم پر ہے۔ حضور ﷺ کا ہر فیصلہ حضور کی سنت اور حدیث ہے جسے تسلیم کر لینے پر اللہ تعالیٰ نے ہمارے مومن ہونے کو موقوف فرمایا جو چیز ایمان کا موقوف علیہ ہو اس کے حجت ہونے میں کسی مومن کا کلام نہیں ہوسکتا۔

☆ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ" یعنی ان لوگوں کو ڈرنا چاہئے جو رسول اللہ ﷺ کے امر کی مخالفت کرتے ہیں یہ کہ انہیں کوئی فتنہ پہنچے یا وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہو جائیں۔ رسول اللہ ﷺ کے امر کی مخالفت کرنے والوں کو ڈرانا اور ان کے حق میں وعید شدید نازل فرمانا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ امر رسول اللہ ﷺ قولی ہو یا فعلی بہرصورت واجب القبول اور حجت شرعیہ ہے۔

کتابت حدیث

☆ یہ درست ہے کہ عہد صحابہ میں احادیث کی تدوین کتابوں کی صورت میں نہیں ہوئی بلکہ ان کے قلوب وصدور میں یہ خزانہ محفوظ تھا لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عہد رسالت میں مطلقاً کتابت حدیث نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ احادیث کثیرہ سے زمانہ اقدس میں کتابت حدیث ثابت ہے بلکہ خود رسول اللہ ﷺ نے بعض صحابہ کو حدیثیں لکھنے کا حکم فرمایا۔ ابوداؤد میں ہے

"عند عبد الله بن عمرو قال كنت اكتب كل شيء اسمعه من رسول الله ﷺ اريد حفظه فنهتني قريش وقالوا اتكتب كل شيء تسمعه ورسول الله ﷺ بشر يتكلم في الغضب والرضاء فامسكت عن الكتابة فذكرت ذلك الى رسول الله ﷺ فاوماء باصبعه الى فيه فقال اكتب فو الذي نفسي بيده ما يخرج منه الا حق۔

☆ "حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی حدیث کو یاد کرنے کیلئے لکھ لیا کرتا تھا۔ قریش کے چند لوگوں نے مجھے روکا اور کہا کہ رسول اللہ (ﷺ) سے ہر سنی ہوئی بات کو لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ (ﷺ) بشر ہیں وہ غضب اور رضا دونوں حالتوں میں کلام فرماتے ہیں۔ (قریش کی یہ بات سن کر) میں کتابت حدیث سے رُک گیا اور میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، سب کچھ لکھ لیا کرو اور اپنی مبارک انگلی سے اپنے دہن اقدس کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جس ذات پاک کے قبضۂ قدرت میں میری جان مقدس ہے میں اس کی قسم کھا کر فرماتا ہوں کہ اس دہن مبارک سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔" (ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۵۱۳، ۵۱۴)

☆ اس حدیث میں کتابت حدیث کا صریح حکم وارد ہے اور جن روایات میں "لا تکتبوا عنی سوی القرآن" آیا ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ قرآن پاک کے ساتھ اور کچھ نہ لکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن غیر قرآن کے ساتھ مخلوط ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ نفس کتاب حدیث عہد رسالت میں ثابت ہے۔ البتہ کتابی صورت میں تدوین حدیث اس وقت نہ ہوئی۔

حضرات صحابہ کرام و کبار تابعین کے عہد میں حدیث

☆ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (س: احزاب، آیت: ۲۱) نیز فرمایا "اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ"

☆ اس کے علاوہ بار بار اتباعِ رسول اللہ ﷺ کا حکم دیا گیا اور رسول اللہ ﷺ کے امر کی مخالفت کرنے والوں کو عذاب علیم سے ڈرایا گیا۔

☆ ان تمام ارشاداتِ ربانی کا مفاد یہ ہے کہ صحابہ کرام سے لے کر قیامت تک ہر مومن رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال اور احوالِ مقدسہ کو پوری طرح پیشِ نظر رکھے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ وہ اقوال وافعال احوال مبارکہ محفوظ ہوں۔

☆ اسی لئے تقریباً دس ہزار صحابہ کرام نے احادیث مقدسہ اپنے سینوں میں ضبط کر کے تابعین کو پہنچائیں اور تابعین نے تبع تابعین کو اور اسی طرح سنین مقدسہ واحادیث کریمہ کی نعمت عظمیٰ ہم تک پہنچی۔

☆ ان صحابہ کرام میں جن حضرات کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر انہوں نے اکثار فی الروایۃ سے کام لیا تو وہ خطا میں واقع ہو جائیں گے۔ انہوں نے قلت روایت کو اختیار کیا اور جنہیں یہ اندیشہ نہ تھا انہوں نے اکثار فی الروایۃ پر عمل کیا۔ درحقیقت ہر دو گروہ کا طرزِ عمل اس حکمت ایزدی کے موافق تھا کہ خاصانِ بارگاہِ رسالت روایت حدیث میں محتاط رہیں اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث مقدسہ کی تبلیغ بھی ہو جائے۔ مقلین صحابہ کرام میں خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق متوفی ۱۳ھ، حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم متوفی ۴۰ھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

☆ مکثرین صحابہ کرام میں سے بعض کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۵۷ھ

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما متوفی ۶۸ھ

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما متوفی ۷۰ھ

(۴) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما متوفی ۷۴ھ

(۵) حضرت انس بن مالک رضی الہ عنہ متوفی ۹۳ھ

(۶) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا متوفیہ ۴۹، ۵۷، ۵۸، ۵۹ھ

(۷) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ متوفی ۶۴، ۶۴،۶۴ھ

☆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایت حدیث میں سب سے اعلیٰ مرتبہ پانے والے تابعین کرام میں بعض کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں

(۱) سعید بن مسیب متوفی ۹۳ھ

(۲) حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ

(۳) محمد بن سیرین متوفی ۱۱۰ھ

(۴) عروہ بن زبیر متوفی ۹۴ھ

(۵) سیدنا علی بن الحسین (زین العابدین سجاد) علیہ السلام متوفی ۹۴ھ

(۶) مجاہد متوفی ۱۰۴ھ

(۷) قاسم بن محمد بن ابو بکر متوفی ۱۰۶ھ

(۸) ہمام بن منبہ متوفی ۱۳۱ھ

(۹) سالم بن عبداللہ بن عمر متوفی ۱۰۶ھ

(۱۰) نافع مولی ابن عمر متوفی ۱۱۷ھ

(۱۱) سعید بن جبیر متوفی ۹۵ھ

(۱۲) ابن شہاب زہری متوفی ۱۲۴ھ

(۱۳) عکرمہ مولی ابن عباس متوفی ۱۰۵ھ

(۱۴) عطا ابن رباح متوفی ۱۱۵ھ

(۱۵) قتادہ بن دعامہ متوفی ۱۱۷ھ

(۱۶) عامر الشعبی متوفی ۱۰۴ھ

(۱۷) ابراہیم نخعی متوفی ۹۶ھ

(۱۸) یزید بن ابی حبیب متوفی ۱۲۸ھ

☆ جن تابعین کرام نے صحابہ کرام سے احادیث نبویہ کو روایت کیا وہ مختلف شہروں اور مرکزی علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ مثلاً مدینہ منورہ میں چار سو چوراسی تابعین کے حالات طبقات ابن سعد وغیرہ کتب تاریخ و سیر میں ملتے ہیں۔ اسی طرح مکہ مکرمہ میں ایک سو اکتیس اور کوفہ میں چار سو تیرہ، بصرہ میں ایک سو چونسٹھ تابعین کرام کے اعداد و شمار، ان کے مفصل حالات بالخصوص علم حدیث سے ان کے

شغف کا تذکرہ کتب فن میں موجود ہے۔

تدوین حدیث

☆ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین دنیا سے بکثرت تشریف لے جانے لگے اور تابعین کرام کے جس مقدس گروہ کو سنن کریمہ و احادیث نبویہ کی یہ امانت پہنچی تھی اس کے بعد اہل بصیرت حضرات کو اس زمانہ کے حالات کے پیش نظر یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اگر کتابی صورت میں تدوین احادیث کا کام نہ کیا گیا تو اس نعمت عظمیٰ سے ہم محروم ہو جائیں گے۔ اس لئے انہوں نے کتابوں کی صورت میں حدیثیں جمع کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک سے تدوین حدیث کا باقاعدہ کام شروع ہوا۔ ان مؤلفین میں ربیع بن صبیح متوفی ۱۶۰ھ، موسیٰ ابن عقبہ متوفی ۱۴۱ھ، امام اعظم ابوحنیفہ ۱۵۰ھ، امام مالک ۱۷۹ھ، ابن جریج ۱۵۶ھ، امام ابویوسف ۱۸۲ھ، امام محمد ۱۸۹ھ، امام اوزاعی ۱۵۶ھ، سفیان ثوری ۱۶۱ھ، حماد بن سلمہ بن دینار ۱۶۷ھ اور ان کے علاوہ دیگر محدثین کبار نے کتابوں کی صورت میں احادیث جمع کیں اور دوسری صدی کے اواخر تک کتب احادیث کے مجموعے بکثرت مرتب ہو گئے۔

تیسری صدی کے اوائل میں مسدد بن مسرہد متوفی ۲۱۸ھ، امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ، اسحاق بن راہویہ متوفی ۲۳۸ھ، عثمان بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۹ھ، ابوبکر بن ابی شیبہ ۲۳۵ھ نے مختلف موضوعات مثلاً سیرت، احکام، مغازی پر احادیث کے مجموعے مرتب کئے ان میں سے بعض مؤلفین کی تصانیف موجود نہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ ضائع ہو گئیں بلکہ ان کا پورا مواد ان کے ہم عصروں اور ان کے بعد آنے والوں نے اپنی کتابوں میں شامل کر لیا اور لوگ ان سے بے نیاز ہوتے چلے گئے۔ اسی صدی میں امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ، امام مسلم متوفی ۲۶۱ھ، امام ابوداؤد متوفی ۲۷۵ھ، امام ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، امام نسائی ۳۰۳ھ، امام ابن ماجہ ۲۷۳ھ نے صحاح، جوامع اور سنن تالیف فرمائیں اور تدوین کا کام نہایت خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔

☆ ہم ان صحابہ کرام و تابعین عظام واجلہ محدثین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس احسانِ عظیم کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث مقدسہ کو کتابی صورت میں مدون کر کے امت مسلمہ کے لئے ہدایت کا ایک روشن مینار قائم کر دیا اور حق کو باطل سے ممتاز کر کے سنن نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کے انوار سے ہر مومن کے دل کو منور فرمایا

فجزاهم الله عنا وعن سائر المسلمي. آمين!

فضیلت حفظ حدیث

☆ رسول اللہ ﷺ نے حدیثیں یاد کرنے کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "من حفظ علٰى امتى اربعين حديثا فى امر دينها بعثه الله فقيها وكنت لهٗ شافعا يوم القيٰمة وشهيدا۔"

☆ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اشعة اللمعات میں اس حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے فرمایا "کسیکہ یاد گیرد و بر ساند مرا چہل

حدیث از کار، دین ایشاں، برانگیز داوراخدائے تعالٰی روزِ قیامت درزمرہ فقہاوباشم من مراداروزِ قیامت شفاعت کنندہ مرگناہان اوراو گواہی دہندہ برطاعت او(اشعۃ اللمعات ج ۱ص ۱۸۶)

☆ یعنی جو شخص یاد کرے اور پہنچائے میری امت کو چالیس حدیثیں جو ان کے امر دین سے ہوں، اٹھائے گا اللہ تعالٰی اس کو قیامت کے دن فقہا کے زمرہ میں اور میں اس کے لئے اس کے گناہوں کی شفاعت کرنے والا اور اس کی طاعت پر گواہی دینے والا ہوں گا۔

☆ ابن عدی نے کامل میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کی، حضور ﷺ نے فرمایا "من حفظ علٰی امتی اربعین حدیثا من السنۃ کنت لہٗ شفیعا و شھیدا یوم القیٰمۃ"

☆ نیز ابن نجار نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا "من حفظ علٰی امتی اربعین حدیثا من سنتی اد خلتہ یوم القیٰمۃ فی شفاعتی" دیکھئے جامع صغیر للسیوطی جلد ۲ص ۱۲۹

☆ بیہقی کی روایت کے متعلق امام احمد رحمۃ اللہ نے فرمایا "ھٰذا متن مشھور فیما بین الناس ولیس لہٗ اسناد صحیح"

☆ اور امام نووی نے اپنی اربعین میں کہا کہ حدیث ضعیف ہے لیکن اس کے طرق متعدد ہیں جس کی وجہ سے اس حدیث میں قوت پیدا ہو گئی۔ (اشعۃ اللمعات جلد ۱ص ۱۸۷) اور روایت ابن عباس کو امام سیوطی نے ضعیف قرار دیا اور حدیث ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ کی تصحیح فرمائی۔ دیکھئے جامع صغیر للسیوطی جلد ۲ص ۱۹۶

☆ اس میں شک نہیں کہ ائمہ کبار نے ان حدیثوں کو تلقی بالقبول کے ساتھ اور ان پر عمل کر کے ان کے مقبول اور حجت ہونے کو تسلیم کر لیا کیونکہ علمائے کبار نے سلف و خلف میں اربعینات تصنیف کیں اور وہ حضور ﷺ کی شفاعت اور اپنی مغفرت کے لئے حضور ﷺ کی شہادت کے امیدوار ہوئے۔ قطع نظر اس سے کہ ضعاف فضائل اعمال میں مقبول ہیں۔ اس امر میں کسی شک وشبہ کے لئے گنجائش باقی نہیں کہ احادیث مذکورہ قابل قبول اور حجت شرعیہ ہیں کیونکہ تینوں حدیثیں ایک دوسرے کے لئے شاہد ہیں اور حدیث ابی سعید خدری کے صحیح ہونے کی تصریح تو خود امام جلال الدین سیوطی نے فرما دی ہے۔

☆ خلاصہ یہ کہ احادیث رسول اللہ ﷺ کو یاد کرنا اور انہیں مسلمانوں تک پہنچانا ایسی فضیلت اور اجر و ثواب کا موجب ہے کہ ایسا شخص قیامت کے دن فقہا کے گروہ میں اٹھایا جائے گا اور رسول اللہ ﷺ اس کے لئے شفیع اور شہید ہوں گے۔ بشرطیکہ ایمان اور اخلاص کامل کے ساتھ یہ عمل ہو اور مرتے دم تک کوئی ایسا گناہ سرزد نہ ہو جس سے یہ نیکی ضائع ہو جائے کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "انما الاعمال بالخواتیم"

☆ اللہ تعالٰی ہمیں ایمان، اخلاص اور حسن خاتمہ نصیب فرمائے۔ آمین!

علم اصول حدیث کی بعض ضروری اصطلاحات

حدیث

☆ جمہور محدثین کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا قول و فعل و تقریر حدیث ہے۔

تقریر

☆ اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں کوئی بات کہی جائے یا کوئی کام کیا جائے اور اس کو جاننے کے باوجود حضور ﷺ اس پر انکار نہ فرمائیں بلکہ سکوت فرما کر اس کو برقرار رکھیں۔ بعض محدثین کے نزدیک صحابی و تابعی کے قول فعل اور تقریر کو بھی حدیث کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ، صحابی اور تابعی کے اعتبار سے حدیث کی تین قسمیں ہوگئیں۔

(۱) حدیث مرفوع "وہ قول و فعل اور تقریر جو رسول اللہ ﷺ پر منتہی ہو۔"

(۲) حدیث موقوف "جو قول و فعل و تقریر صحابی تک پہنچے۔"

(۳) حدیث مقطوع "جو قول و فعل اور تقریر تابعی پر منتہی ہو۔"

حدیث، اثر اور خبر

☆ بعض محدثین کے نزدیک مرفوع اور موقوف کو حدیث کہتے ہیں اور مقطوع کو ان کے نزدیک اثر کہا جاتا ہے اور بعض اوقات حدیث کو بھی اثر کہہ دیتے ہیں اور لفظ خبر حدیث کا مرادف (ہم معنی) ہے لیکن بعض محدثین کے نزدیک حدیث انہیں امور کو کہا جاتا ہے جو رسول اللہ ﷺ، صحابی اور تابعی سے منقول ہوں اور خبر ان کے نزدیک گزشتہ زمانہ کے تاریخی حالات اور واقعات کو کہتے ہیں۔ علم حدیث جاننے والے اور اس کی تعلیم میں شغف رکھنے والے کو محدث کہا جاتا ہے اور تاریخ و واقعات گزشتہ سے شغف رکھنے والے کو اخباری کہا جاتا ہے۔

سنت

☆ سنت طریقہ کو کہتے ہیں اور لسان شرع میں مسلوکہ فی الدین کا نام سنت ہے یعنی امور دینیہ میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کا جاری کیا ہوا طریقہ سنت ہے۔ خصوصاً رسول اللہ ﷺ کا طریقہ سنت نبوی کہلاتا ہے۔ محدثین صحابہ کرام اور خلفائے راشدین کے پسندیدہ طریقوں کو بھی سنت کہتے ہیں۔

سند: ناقلین و رواۃ حدیث کو سند کہتے ہیں۔ اسناد بھی سند کے معنی میں ہے لیکن بسا اوقات ذکرِ سند کو اسناد کہا جاتا ہے۔

متن: منتہائے سند ہے۔

متصل: وہ حدیث جس کے سلسلہ سند میں کوئی انقطاع نہ ہو۔

منقطع: وہ حدیث جس کی سند سے کوئی راوی ساقط ہو جائے۔

معضل: وہ حدیث جس کی سند سے دو یا دو سے زائد راوی پے در پے ساقط ہو گئے ہو۔

مرسل: وہ حدیث جس میں تابعی سے اوپر کا راوی ساقط ہو۔ اسی طرح اسقاط راوی کے ساتھ روایت کو ارسال کہتے ہیں۔

معلق: جس حدیث کی سند حذف کردی گئی ہو یا ابتدائے سند میں کوئی راوی مذکور نہ ہو۔

تعداد رواۃ کے اعتبار سے حدیث کی اقسام

☆ تعداد رواۃ کے اعتبار سے حدیث کی چار قسمیں ہیں

(۱) متواتر: جس کے راوی اول سے آخری تک ہر طبقہ میں اتنے کثیر ہوں جن کا جھوٹ پر جمع ہونا عادتاً محال ہو۔ ان کی تعداد میں اختلاف ہے لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ حدیث کا تعلق حس اور مشاہدہ سے ہو۔

(۲) خبر مشہور: وہ ہے جس کے راوی ہر طبقہ میں کم از کم تین ہوں۔

(۳) عزیز: وہ حدیث ہے جس کے ہر طبقہ میں دو راوی پائے جائیں۔

(۴) غریب: وہ حدیث جس کی سند میں ہر جگہ یا کسی ایک جگہ صرف ایک راوی ہو۔ اس کو فرد بھی کہتے ہیں۔ فرد کی دو قسمیں ہے

☆ فرد مطلق ☆ فرد نسبی

فرد مطلق: جس کی سند میں ہر جگہ ایک ہی راوی ہو۔

فرد نسبی: جس کی سند میں بعض جگہ صرف ایک راوی ہو۔

اوصافِ رواہ کے اعتبار سے حدیث کی تقسیم

صحیح: جس کی سند متصل ہو، اس کے تمام راوی عادل ضابطہ ہوں اور اس میں علت قادحہ و شذوذ نہ ہو۔

حسن: جس کی سند میں صحیح کی تمام شرائط پائی جائیں لیکن اس کے راویوں میں صفت ضبط کم ہو۔ صحیح اور حسن ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔ لذاتہ اور لغیرہ۔

صحیح لذاتہ: جس کی سند متصل ہو اور اس کے رواۃ میں صفات معتبرہ فی الصحیح علی وجہ الکمال پائی جائیں۔

صحیح لغیرہ: جس کے راویوں میں صفات مذکورہ کمی کے ساتھ پائی جائیں لیکن طرق متعددہ سے مذکورہ کمی پوری ہو جائے۔

حسن لذاتہ: جس کے راویوں میں صفت ضبط ناقص ہو اور اس کمی کو پورا کرنے والا کوئی امر نہ پایا جائے۔

حدیث ضعیف: وہ ہے جس کے رواۃ میں صفات معتبر بہ فی الصحیح والحسن سب یا بعض نہ پائی جائیں اور شذوذ یا نکارت یا کسی علت خفیہ کی وجہ سے اس کے راوی کی مذمت کی گئی ہو۔ اس اعتبار سے اس کی متعدد اقسام ہیں جو بخوفِ طوالت ذکر نہیں کی گئیں۔

حسن لغیرہ: جس حدیث ضعیف کا تدارک تعدد طرق سے ہو جائے۔

شاذ و محفوظ: اگر ثقہ راوی کسی ایسے راوی کے خلاف روایت کرے جو اس سے ارجح اور زیادہ ثقہ ہے تو اسی حدیث کو شاذ کہیں گے اور اس کے مقابل کو محفوظ

منکر و معروف: اگر ضعیف راوی نے قوی راوی کے خلاف روایت کی تو اسکی حدیث کو منکر اور اس کے مقابل کو معروف کہتے ہیں۔

متابع: جس حدیث کو کوئی راوی کسی دوسرے راوی کے موافق روایت کرے بشرطیکہ دونوں حدیثیں ایک ہی صحابی کی مسند ہوں تو اس موافق کو متابع اور موافقت کو متابعت کہتے ہیں۔

شاھد: اگر کسی دوسرے صحابی سے ایسی حدیث مروی ہو تو اس کو شاہد کہتے ہیں۔

موضوع: وہ ہے جس کے راوی کا کذب کسی حدیث نبوی میں ثابت ہو گیا ہو۔

متروک: وہ جس کا راوی متہم بالکذب ہو۔

متفق علیہ: وہ حدیث ہے جسے امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی صحیحین میں ایک ہی صحابی سے روایت کیا ہو۔

احادیث صحیحہ اور ان کے مراتب و درجات میں تفاوت

☆ ''علم اصول کی بعض ضروری اصطلاحات'' کے تحت حدیث صحیح کی تعریف میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ حدیث صحیح وہ ہے جس کی سند متصل ہو اور اس کے سب راوی ثقہ، عادل اور ضابطہ ہوں۔ اس میں شذوذ اور علت قادحہ نہ پائی جائے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام صحیح حدیثیں قوت وصحت میں مساوی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حفظ وضبط اور عدالت کے مراتب میں اعلیٰ وادنیٰ کا تفاوت ہے۔ اس طرح محدثین کے شرائط میں تشدد وتساہل کا فرق ہے۔ اسی اختلاف وتفاوت کے پیش نظر علماء نے احادیث صحیحہ کی قوت وصحت کا معیار قائم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل ضابطہ بیان کیا ہے

(۱) قوت وصحت میں سب سے اعلیٰ درجہ کی وہ احادیث ہیں جو بخاری ومسلم دونوں کی متفق علیہ ہیں۔

(۲) ان کے بعد وہ حدیثیں ہیں جو صرف صحیح بخاری میں ہیں۔

(۳) پھر وہ جو صرف مسلم ہیں۔

(۴) پھر وہ جو شرائط شیخین کے موافق ہیں۔

(۵) ان کے بعد وہ حدیثیں جو صرف امام بخاری کی شرط پر ہیں۔

(۶) پھر وہ جو صرف امام مسلم کی شرط کے موافق ہیں۔

(۷) ان کے بعد ان احادیث کا درجہ ہے جنہیں بقیہ اصحاب ستہ نے اپنی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا ہو۔

علم حدیث میں مشغول ہونے والوں کی اقسام

☆ علم حدیث میں مشغول ہونے والوں کی پانچ قسمیں ہیں

(۱) طالب: وہ مبتدی ہے جو علم حدیث حاصل کرنے میں مشغول ہو۔

(۲) محدث: جو علم حدیث میں روایۃً اور درایۃً مشغول ہو نیز وہ اکثر روایات اور راویوں کے احوال پر بھی مطلع ہو۔

(۳) حافظ: وہ محدث جو ایک لاکھ حدیث کے اسانید ومتون کا عالم ہو۔

(۴) حجت: جس عالم حدیث کو تین لاکھ حدیثیں یاد ہوں۔

(۵) حاکم: وہ محدث جسے جملہ احادیث مرویہ اسانید و متون کے ساتھ یاد ہوں اور وہ راویوں کے پورے حالات جانتا ہو۔

بعض اقسام کتب حدیث

۱۔صحیح	۲۔جامع	۳۔مسند	۴۔معجم	۵۔مستخرج	۶۔مستدرک
۷۔جزء	۸۔مفرد	۹۔اربعین	۱۰۔مراسیل	۱۱۔امالی	۱۲۔اطراف

صحیح: وہ کتاب ہے جس میں احادیث صحیحہ کے وارد کرنے کا التزام کیا گیا ہو۔ جیسے صحیح بخاری وغیرہ۔ جن کتب صحاح میں بعض غیر حدیثیں ہیں انہیں تغلیباً صحیح کہا جاتا ہے۔

جامع: وہ کتاب جو آٹھ قسم کی حدیثوں پر مشتمل ہو وہ اقسام ثمانیہ اس شعر میں مذکور ہیں۔

سیر، آداب، تفسیر وعقائد

فتن، اشراط، احکام و مناقب

☆ جیسے جامع صحیح بخاری و ترمذی

سنن: وہ کتاب جس میں ابواب فقیہ کی ترتیب پر احادیث احکام جمع کی جائیں جیسے سنن ابی داؤد وغیرہ۔

مسند: وہ کتاب جس میں صحابی کی ترتیب کے موافق احادیث ہوں۔ جیسے مسند امام احمد وغیرہ۔

معجم: وہ کتاب ہے جس میں شیوخ کی ترتیب پر احادیث ہوں جیسے معجم للطبرانی وغیرہ۔

مستخرج: وہ کتاب ہے جس میں حدیث کی کسی دوسری کتاب کی احادیث کے اثبات کے لئے احادیث جمع کی جائیں جیسے مستخرج ابی نعیم علی البخاری وغیرہ۔

مستدرک: وہ کتاب ہے جس میں حدیث کی کسی کتاب پر ایسی حدیثوں کو زائد کیا جائے جو اس کتاب میں قابل ذکر ہونے کے باوجود مذکور نہ ہوں جیسے مستدراک للحاکم۔

جزء: وہ کتاب ہے جس میں صرف ایک مسئلہ کی احادیث ہوں۔ جیسے جزء القراۃ للبخاری۔

مفرد: وہ کتاب ہے جس میں ایک شخص کی احادیث ہوں جیسے مسند ابی ہریرہ لابراہیم بن العسکری۔

اربعین: وہ کتاب ہے جس میں چالیس حدیثیں جمع کی گئی ہوں جیسے اربعین نووی

مراسیل: وہ کتاب ہے جس میں مرسل حدیثیں جمع کی گئی ہوں جیسے مراسیل ابی داؤد

امالی: وہ کتاب ہے جس میں کسی محدث کے اپنے تلامذہ کے سامنے بیان کئے ہوئے مطالب حدیث اور اس کے نکات جمع ہوں جیسے امام حافظ ابن حجر عسقلانی

اطراف: وہ کتاب ہے جس میں کسی معین کتاب کی احادیث کے اطراف جمع کیے گئے ہوں جیسے اطراف للمزی۔

حَدَّثَنَا۔ اَخْبَرَنَا۔ اَنْبَانَا کا فرق

☆ ان تمام الفاظ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کوئی فرق نہیں لیکن امام مسلم اور دیگر ائمہ متاخرین کے نزدیک ان میں یہ فرق ہے کہ حَدَّثَنَا اسی وقت کہا جائے گا جب راوی حدیث شیخ کے الفاظ سنے یعنی شیخ پڑھتا ہو اور شاگرد سنتا ہو اور اگر کسی شاگرد نے شیخ پر قرأت کی اور شیخ نے سنا تو اس صورت میں اَخْبَرَنَا وَ اَنْبَانَا کہا جائے گا۔ اگر شیخ کی قرأت سننے والا تنہا ایک شخص نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ دوسرا بھی شامل ہو تو حَدَّثَنَا کہے گا اور اگر تنہا ہے تو حَدَّثَنِیْ سے تعبیر کرے گا۔ علیٰ ہذا القیاس اگر کئی شاگردوں کی موجودگی میں ایک شاگرد نے شیخ پر قرأت کی تو راوی اَخْبَرَنَا کہے گا اور اگر قاری تنہا تھا تو وہ اَخْبَرَنِیْ استعمال کرے گا۔

صحیحین کا اجمالی تعارف

☆ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمہ شرح صحیح مسلم میں فرمایا کہ علمائے محدثین کا اسبات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید کے بعد اصح الکتب صحیحین ہیں یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم ان دونوں کے حق میں امت مسلمہ کی تلقی بالقبول ان کی عظمت کی روشن دلیل ہے۔

صحیح بخاری

☆ علماء کے نزدیک صحت وقوت میں صحیح بخاری کا مرتبہ صحیح مسلم پر فائق ہے اور بخاری مسلم سے اصح ہے۔ اس کے فوائد صحیح مسلم کے فوائد سے بہت زیادہ ہیں اور اس کے ظاہری و باطنی محاسن و معارف بے شمار ہیں امام مسلم نے خود امام بخاری سے استفادہ کیا اور اس بات کا اقرار کیا کہ امام بخاری علم حدیث میں بے نظیر ہیں۔ امام حاکم کے شیخ حسن بن علی نیشا پوری اور بعض شیوخ مغرب نے مسلم کو بخاری سے اصح قرار دیا لیکن جمہور کے نزدیک قول اول صحیح ہے۔ حافظ ابن صلاح نے علوم الحدیث میں کہا کہ صحیح مجرد میں سب سے پہلے مصنف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہیں ان کے بعد امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کا مقام ہے اور ان دونوں کی کتابیں اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ صحیح بخاری کا صحیح مسلم پر راجح ہونا چند وجوہ سے ہے

(۱) رواۃ بخاری رواۃ مسلم سے زیادہ ثقہ ہیں۔

(۲) اسانید بخاری کا اتصال اسانید مسلم کے اتصال سے زیادہ قوی ہے کیونکہ امام مسلم کے نزدیک راوی اور مروی عنہ کی معاصرت اور امکان لقا کافی ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فعلیت لقا ضروری ہے۔

(۳) صحیح بخاری میں مسائل فقہیہ کا استنباط لطائف عجیبہ و نکات غریبہ کا وجود بکثرت پایا جاتا ہے۔

(۴) امام بخاری کے متکلم فیہ رواۃ مسلم کے متکلم فیہ رواۃ سے بہت کم ہیں یعنی صرف تیس راوی ایسے ہیں جو بخاری کے مخصوص متکلم فیہ رواۃ ہیں اور مسلم کے متکلم فیہ رواۃ ایک سو ساٹھ ہیں۔

(۵) بخاری جامع ہے اور مسلم جامع نہیں کیونکہ مسلم میں تفسیر برائے نام ہے جن لوگوں نے اس برائے نام تفسیر کا اعتبار کیا انہوں نے

صحیح مسلم کو جامع قرار دیا لیکن حق یہ ہے کہ صحیح مسلم میں تفسیر کا وجود بوجہ قلت کالعدم ہے اسلئے وہ جامع نہیں۔

☆ وجوہ ترجیح میں ہم نے چند خصوصیات ہی کو بیان کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بکثرت خصوصیات ہیں مثلاً بخاری میں تیئیس ثلاثی حدیثوں کا پایا جانا صحیح مسلم، ابوداؤد اور نسائی میں کوئی ثلاثی حدیث نہیں پائی جاتی۔ بخاری کے علاوہ ترمذی میں صرف ایک ثلاثی ہے۔ ابن ماجہ میں پانچ ثلاثیات ہیں۔

تالیف صحیح امام بخاری کی غرض

☆ اس کتاب سے امام بخاری کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ احادیث صحیح مرفوعہ جمع ہو جائیں۔ اس کتاب کے پڑھنے والوں کو استخراج احکام واستنباط مسائل کا ملکہ حاصل ہو۔

تالیف صحیح بخاری

☆ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد حرام میں بیٹھ کر صحیح بخاری کی تالیف شروع کر دی۔ سولہ یا اٹھارہ برس میں اس کا مسودہ تیار ہوا جس کی تبییض انہوں نے مدینہ منورہ میں منبر شریف اور قبر انور کے درمیان بیٹھ کر کی۔ امام بخاری نے تین مرتبہ اپنی صحیح کو ترتیب دیا اور تینوں مرتبہ کچھ نہ کچھ تغیر کیا اسی وجہ سے اس کے نسخوں میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔

☆ صحیح بخاری کی تالیف اس طرح ہوئی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ہر ترجمۃ الباب کے لئے غسل کیا اور دو نفل پڑھے جو حدیث اس میں درج کی اس کے بارے میں اللہ تعالٰی سے استخارہ کیا اور اس کی صحت پر وثوق ہونے کے بعد اسے اپنی صحیح میں داخل کیا۔

حوائج ومہمات میں ختم بخاری شریف

☆ کثیرین مشائخ اور علمائے ثقات نے حصول مرادات، کفایت مہمات، قضائے حاجات ودفع بلیات، کشف کربات، صحت امراض ومضائق وشدائد سے نجات پانے کیلئے صحیح بخاری کو پڑھا، ان کی مرادیں حاصل ہوئیں۔ انہوں نے اپنے مقاصد میں کامیابی پائی اور ختم بخاری شریف ان کی مرادوں کے بر آنے میں تریاق مجرب ثابت ہوا۔ یہ ایسی بات ہے کہ علمائے حدیث کے نزدیک شہرت و استفاضہ کے درجہ کو پہنچی ہے۔ (دیکھئے اشعۃ اللمعات ج ا ص ۱۲ اور الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۸)

☆ صحیح بخاری اور صحیح مسلم صحت، شہرت اور قبولیت کے لحاظ سے کتب حدیث کے طبقہ اولی میں شمار کی جاتی ہیں۔ بالخصوص صحیح بخاری ان تینوں اوصاف میں صحیح مسلم پر فوقیت رکھتی ہے۔

شروح بخاری

☆ بخاری شریف کی شروح اس قدر کثیر ہیں کہ ان کا احصا دشوار ہے۔ جن میں فتح الباری للحافظ العلامۃ ابی الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی متوفی ۸۵۲ھ، ۱۳ جلدوں میں اور عمدۃ القاری للعلامۃ بدر الدین العینی متوفی ۸۵۵ھ، گیارہ ضخیم جلدوں میں اور ارشاد الساری مؤلفہ علامہ شہاب الدین احمد بن محمد الخطیب القسطلانی متوفی ۹۲۳ھ، دس جلدوں میں عظیم ضخیم شروح ہیں۔

صحیح مسلم

☆ یہ بات ابھی معلوم ہو چکی ہے کہ کتب حدیث میں صحیح بخاری کے بعد سب سے اصح وارجح صحیح مسلم ہے۔

صحیح مسلم کی تالیف سے امام مسلم کی غرض

☆ احادیث صحیحہ مرفوعہ کو بکثرت جمع کرنا اوران کی اسانید کثیرہ بطریق متعددہ کو وارد کرنا تا کہ صحت وقوت احادیث کی تائید مزید ہو اوران احادیث کے حجت ہونے کو زیادہ زیادہ تقویت پہنچے۔ استنباط مسائل امام مسلم کا مقصد نہیں۔ اس لئے وہ ایک حدیث کی اسانید متعددہ کے ساتھ متن حدیث کا اعادہ نہیں کرتے۔ اسی لئے صحیح مسلم میں تکرار نہیں پائی جاتی۔ بخلاف صحیح بخاری کے کہ ان کا مقصد استنباط مسائل ہے اور وہ متن حدیث کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جب ایک حدیث سے متعدد مسائل مستنبط کرتے ہیں تو اس کے متن کا بھی اعادہ فرماتے ہیں اوراسی استنباط مسائل کے پیش نظر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کی تبویب کی ہے اورتراجم ابواب قائم کئے ہیں اورامام مسلم کی غرض چونکہ استنباط مسائل نہیں اسلئے انہوں نے اپنی کتاب میں ابواب نہیں رکھے۔

☆ صحیح مسلم کے نسخوں میں حواشی پر جو ابواب اوران کے عنوانات پائے جاتے ہیں وہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے نہیں بلکہ بعض شراح صحیح مسلم نے قائم کئے ہیں۔ صحیح مسلم کی خصوصیات میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس کی ترتیب صحیح بخاری کی ترتیب سے احسن ہے۔ اس میں ہر حدیث ایسی جگہ وارد کی گئی ہے جو اس کے لائق ہے اوراسی جگہ اس حدیث کے ان سب طرق واسانید کو بھی امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے جمع کردیا ہے جوان کے نزدیک پسندیدہ تھے۔

☆ جن طرق میں الفاظ کا اختلاف تھا وہاں الفاظ مختلفہ کو بیان کردیا ہے اورساتھ ہی زیادہ ثقات کو بھی ذکر فرمادی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے اس طریق کار سے صحیح مسلم میں حدیث تلاش کرنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ نیز حدیثوں کے طرق متعددہ اورمختلف الفاظ و زیادۃ ثقات جاننے سے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں جن کی تفصیل اس مختصر مضمون میں نہیں آسکتی۔

رباعیات صحیح مسلم

☆ صحیح مسلم ثلاثیات سے خیالی ہے البتہ اس سے زائد اس میں ایسی حدیثیں ہیں جن کی سند میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اوررسول اکرم ﷺ کے مابین صرف چار واسطے ہیں اوریہ احادیث رباعیات کہلاتی ہیں۔

ترجمہ امام بخاری

☆ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا نام محمد بن اسمٰعیل ہے اورکنیت ونسب کے ساتھ آپ کو الامام الحافظ الــحــجـۃ ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ کہا جاتا ہے اورامام بخاری کے لقب سے آپ مشہور ہیں۔

☆ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے اجداد میں سے مغیرہ ایمان لائے۔ مغیرہ کا باپ بروزبہ فارس کا رہنے والا اورمجوسی تھا۔ اس کی وفات کفر پر ہوئی۔ مغیرہ حاکم بخارا یمان جعفی کے ہاتھ پر مشرف با اسلام ہوئے اوران کے ساتھ موالات اسلام کی نسبت انہیں حاصل ہوئی۔ اسی نسبت کی بناپر انہیں جعفی کہا گیا۔ امام بخاری کو اسی لئے جعفی کہا جاتا ہے۔

امام بخاری کی ولادت و وفات

☆ امام بخاری ۱۳ شوال بروز جمعہ ۱۹۴ھ بمقام بخارا پیدا ہوئے اور ان کی وفات شب عید الفطر ۲۵۶ھ میں ہوئی اور عید کے دن بعد نماز ظہر سمرقند سے چھ میل کے فاصلے پر خرتنگ میں مدفون ہوئے۔ بعض محدثین نے ان کی ولادت اور وفات کو دو شعروں میں بیان کیا

کان البخاری حافظا و محدثا   جمع الصحیح مکمل التحریر
میلادہ صدق و مدۃ عمرہ فیہا   حمید وانقضی فی نور

☆ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد آپ کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ نو یا دس سال کی عمر میں علم حدیث کی طلب کا آغاز فرمایا اور گیارہ سال میں آپ کو اسانید حدیث میں اس قدر مہارت پیدا ہوئی کہ بخارا میں ایک استاد نے سند بیان کی۔ حدثنا سفیان عن ابی زبیر عن ابراہیم امام بخاری نے ادب سے عرض کیا "ابو زھیر لیس لہ رواۃ عن ابراھیم بل ھو ابو زبیر" (نقلہ ملا علی قاری فی المرقاۃ) جب استاد نے اصل کی طرف مراجعت کی تو اس میں ابو زہیر کی بجائے ابو زبیر تھا۔

حصول علم حدیث کے لئے امام بخاری کا سفر اور مشائخ سے استفادہ

☆ سولہ سال کی عمر میں امام بخاری نے ابن مبارک اور امام وکیع کی کتب حدیث کو یاد کر لیا پھر طلب علم کے لئے رحلت کی۔ شام، مصر اور جزیرہ میں دو مرتبہ تشریف لائے اور چار مرتبہ بصرہ گئے اور چھ مرتبہ حجاز میں اقامت فرمائی اور محدثین کے ساتھ کوفہ اور بغداد بے شمار مرتبہ گئے۔ امام بخاری نے فرمایا کہ میں نے ایک ہزار سے زیادہ آدمیوں کی حدیث لکھی ہے اور خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے بے شمار لوگوں نے علم حدیث حاصل کیا۔

☆ نوے ہزار آدمیوں نے امام بخاری سے صحیح بخاری کو روایت کیا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کیساتھ حفظ حدیث میں کوئی شخص مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ سند اور متن اور معرفت علل اور تمیز بین الصحیح و السقیم میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بے مثل اور بے نظیر تھے۔

امام بخاری اپنے ہم عصروں کی نظر میں

☆ حسین بن محمد المعروف بالعجلی فرماتے ہیں میں نے محمد بن اسمٰعیل اور امام مسلم جیسا حافظ حدیث نہیں دیکھا لیکن امام مسلم اس کے باوجود بھی امام بخاری کے مرتبہ کو نہیں پہنچے۔ امام ابو عبد اللہ بن عبد الرحمٰن الدارمی نے کہا کہ میں نے علمائے حرمین حجاز و شام و عراق کو دیکھا ان سب میں امام محمد بن اسمٰعیل بخاری جیسا اعلم و افقہ کسی کو نہیں پایا۔ امام مسلم نے امام بخاری کو مخاطب کر کے کہا "لا یبغضک الا حاسد و اشھد انہ لیس فی الدنیا مثلک"

☆ ابو عبد اللہ بن اخرم نے کہا، میں نے اپنے باپ سے سنا، وہ کہتے تھے کہ میں نے مسلم بن حجاج کو امام بخاری کی بارگاہ میں اس حال میں دیکھا کہ وہ صبی متعلم کی طرح امام بخاری سے سوال کر رہے تھے۔ ایک دن امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور کہا "دعنی اقبل رجلیک یا استاذ الاستاذین وسید المحدثین ویا طبیب الحدیث فی عللہ۔"

☆ اور حافظ صالح بن جزرہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بغداد میں مسند درس حدیث پر جلوہ افروز ہوتے تھے۔ میں ان کے درس کا املا کراتا تھا۔ ان کی مجلس درس میں بیس ہزار سے زیادہ آدمی ہوتے تھے۔ امام بخاری مذہباً شافعی تھے اور بعض نے کہا، وہ مجتہد تھے۔

ترجمہ امام مسلم

☆ ابوالحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری النیشاپوری ائمہ حفاظ اور اعلام محدثین سے ہیں۔ آپ نے حجاز، عراق، شام و مصر کی طرف متعدد سفر کئے۔ آپ کے شیوخ میں یحییٰ النیشاپوری، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، عبداللہ بن مسلمہ القعنبی وغیرہم ہیں۔ امام مسلم کئی مرتبہ بغداد تشریف لائے اور اہل بغداد نے آپ سے روایت حدیث کی۔ آپ کا آخری قدوم بغداد ۲۵۹ھ میں ہوا۔ امام ترمذی نے آپ سے روایت حدیث کی۔ امام مسلم کا قول ہے کہ میں نے تین لاکھ احادیث مسموعہ میں سے منتخب کر کے یہ مسند صحیح تالیف کی ہے۔ حافظ ابوعلی نیشاپوری نے کہا کہ "ما تحت ادیم السماء اصح من کتاب مسلم" ابوعبداللہ محمد بن یعقوب نے کہا کہ جب امام بخاری متوطن نیشاپور ہوئے تو آپ کی خدمت میں امام مسلم کا آنا جانا بکثرت ہوا۔ جب محمد بن یحییٰ ذہلی اور امام بخاری کے درمیان مسئلۃ اللفظ میں اختلاف واقع ہوا اور محمد بن یحییٰ ذہلی نے امام بخاری کے خلاف اعلان کیا اور امام بخاری کے پاس لوگوں کو جانے سے روک دیا یہاں تک کہ امام بخاری نیشاپور سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ اس ابتلاء کے زمانے میں اکثر لوگ امام بخاری کو چھوڑ گئے سوائے امام مسلم کے، کہ انہوں نے امام بخاری کی زیارت سے تخلف نہیں کیا۔

☆ ابن خلکان نے کہا امام مسلم کی ولادت ۲۰۶ھ میں ہوئی اور وفات ۲۵ رجب ۲۶۱ھ میں بروز اتوار شام کے وقت ہوئی۔ آپ نیشاپور سے باہر نصرآباد میں مدفون ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر پچپن برس تھی۔

جامع الترمذی

کتاب الترمذی ریاض علم جلت ازهاره زهر النجوم

به الأثار واضحة ابینت بالفاظ اقیمت کالرسوم

جامع الترمذی

☆ جامع ترمذی کو سنن ترمذی بھی کہا جاتا ہے۔ کشف الظنون جلد اص ۱۷ میں ہے

☆ "وقد اشتهر بالنسبة الی مؤلفه فیقال جامع الترمذی ویقال له السنن ایضا والاول اکثر۔ انتہی اور حاکم نے اس پر "الجامع الصحیح" کا اطلاق کیا ہے۔ انتہی۔ خطیب نے ترمذی اور نسائی دونوں کو "اسم الصحیح" کے ساتھ تعبیر کیا (کما فی تدریب الراوی ص ۳۸۵)

ایک شبہ کا ازالہ

☆ ترمذی اور نسائی دونوں میں احادیث ضعیفہ ہونے کے باوجود ان کا نام "الصحیح" کیوں رکھا گیا؟

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی اکثر احادیث صحیح ہیں اس لئے تغلیباً انہیں صحیح کہا جاتا ہے بلکہ کتب "ستہ" مشہورہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی ابن ماجہ سب کو اسی وجہ سے صحاح کہا جاتا ہے کہ ان کی اکثر حدیثیں صحیح ہیں۔

سنن

☆ کتاب الطہارۃ سے کتاب الوصایا تک ترتیب فقہی پر احادیث کے مجموعہ کو "سنن" کہتے ہیں۔

جامع

☆ محدثین کی اصطلاح میں جامع اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں جمیع اقسام حدیث پائے جائیں۔ جنہیں اقسام ثمانیہ کہا جاتا ہے اور وہ اس شعر میں مذکور ہیں

سیـــــر، آداب، تـــــفسیـــــر و عـــــقـــــائـــــد

فتـــــن، اشـــــراط، احـــــکـــــام و مـــــنـــــاقـــــب

☆ جامع ترمذی کی اکثر حدیثیں صحیح ہیں۔ وہ جمیع اقسام حدیث کو جامع ہے اور ابواب الطہارۃ سے لے کر وصایا تک ترتیب فقہی پر احادیث احکام اس میں جمع کی گئی ہیں اس لئے اس کو جامع صحیح اور سنن تینوں ناموں سے یاد کیا جاتا ہے یعنی اسے جامع الترمذی، صحیح الترمذی اور سنن الترمذی کہتے ہیں اور ان تینوں میں جامع الترمذی زیادہ مشہور نام ہے۔

ترمذی

☆ لفظ ترمذی میں یائے نسبت ہے دیار ہند میں لفظ ترمذ بکسر التاء والمیم قدیم زمانہ سے معروف ہے اور اہل لسان کے نزدیک بفتح التاء وکسر المیم متداول ہے بعض علماء نے بفتح التاء والمیم اور بعض نے بضم التاء والمیم بھی کہا۔

☆ یہ نسبت شہر ترمذ کی طرف ہے جو نہر بلخ یعنی نہر جیحون کے کنارے پر خوارزم کے قریب واقع ہے۔ ترمذی سے ہماری مراد امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ البوغی ہیں جو حافظ حدیث اور جامع کے مصنف مشہور ہیں جن کے مختصر حالات ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

امام ترمذی سے جامع ترمذی کے رواۃ

☆ حافظ ابوجعفر بن زبیر نے "برنامجہ" میں کہا کہ میرے علم میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی جامع ترمذی کو روایت کرنے والے چھ آدمی ہیں

(۱) ابوالعباس محمد بن احمد بن محبوب

(۲) ابوسعید الہیثم بن کلیب الشاشی

(۳) ابوذر محمد بن ابراہیم

(۴) ابومحمد الحسن بن ابراہیم القطان

(۵) ابوحامد احمد بن عبداللہ التاجر

(۶) ابوالحسن الفزاری

☆ حافظ ابوجعفر نے کہا کہ لوگوں نے جو کہا ہے کہ اس کتاب کی سماع ابوعیسیٰ سے درجہ صحت کو نہیں پہنچی اور نہ ہی ان سے اس کی روایت صحیح ہے اور وہ لوگ اس کلام کو ابومحمد بن عتاب کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ انہوں نے ابوعمر وسفاقسی سے روایت کیا انہوں نے عبداللہ الفسوی سے! تو یہ کام باطل ہے کیونکہ جامع ترمذی کی روایات اس کے مصنف سے ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور ایسے لوگوں سے پے در پے منقول ہیں کہ جو مصنف سے اس کتاب کے روایت کرنے میں معروف ہیں پھر یہ کہ عبداللہ بن عتاب اور ان کے بیٹے ابومحمد مذکور اور حافظ ابوعلی عتابی وغیرہ ائمہ حدیث میں سے ہیں اور انہوں نے اس کتاب جامع ترمذی کی سندیں بیان کی ہیں اور اس قسم کی کوئی بات انہوں نے نہیں کی۔ نہ انہوں نے انقطاع روایت کا ذکر کیا ہے اور نہ ایسی بات کسی سے نقل کی ہے۔

جامع ترمذی میں امام ترمذی کی شرط

☆ حافظ ابوالفضل بن طاہر نے کتاب شروط الائمہ میں کہا کہ ائمہ خمسہ میں سے کسی امام سے منقول نہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں روایت حدیث کی یہ شرط مقرر کی ہے لیکن ان کتابوں کو دیکھنے سے ہر ایک کی شرط معلوم ہوتی ہے چنانچہ بخاری و مسلم کی شرط یہ ہے کہ وہ اپنی صحیحین میں ایسی حدیث کا اخراج کرتے ہیں۔ جس کے ناقلین کے ثقہ ہونے پر صحابی مشہور تک محدثین کا اتفاق ہو۔ ابوداؤد ونسائی کی شرط ان لوگوں کی احادیث کا اخراج ہے۔ جن کے ترک پر اتفاق نہ ہوا ہو جبکہ حدیث بغیر قطع وارسال کے متصل السند اور صحیح ہو۔ یہ قسم بھی اقسام صحیح سے قرار پائے گی لیکن ایسی حدیث کا طریق وہ نہ ہوگا جو صحیحین میں روایت کی ہوئی حدیث کا طریق کار ہے بلکہ یہ اس حدیث صحیح کا طریق کار قرار پائے گا جسے شیخین نے (باوجود صحیح ہونے کے) ترک کر دیا ہے جیسا کہ انہوں نے خود بیان کیا ہے کہ ہم نے بہت سی حدیثوں کو حفظ کیا اور ان کے صحیح ہونے کے باوجود انہیں صحیحین میں داخل نہیں کیا۔ ابوداؤد اور نسائی کی شرط مذکور کے تحت تین اقسام کی احادیث آتی ہیں

اول وہ احادیث صحیحہ جو صحیحین میں موجود ہوں۔

دوم وہ صحیح حدیثیں جو بخاری و مسلم کی شرط پر ہوں۔

سوم وہ احادیث ہیں جنہیں صحت قطعیہ کے بغیر ابوداؤد اور نسائی نے اپنی سنن میں روایت کیا اور اہل معرفت کے بیان کے مطابق ان کی علت کو بیان کر دیا اور ان کے سقم کو پوری طرح ظاہر کر دیا تا کہ کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

☆ رہا یہ امر کہ قطعی صحت مفقود ہونے کے باوجود ان دونوں نے اخراج کیا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محدثین کی ایک جماعت نے انہیں روایت کیا اور صرف روایت نہیں بلکہ ان سے حجت بھی پکڑی۔ اس لئے ابوداؤد اور نسائی نے ان احادیث کو اپنی سنن میں وارد کر کے ان کے سقم کو وارد کر دیا تا کہ شبہ زائل ہو جائے اس قسم کی روایات انہوں نے اس وقت وارد کی ہیں جب کہ انہیں اس کے سوا کوئی اقوی اور اصح طریق نہ ملا کیونکہ یہ روایات لوگوں کی رائے سے تو بہر صورت زیادہ قوی ہیں۔

☆ اور ترمذی کی شرط ایسی احادیث کا اخراج ہے جن سے کسی اہل علم نے استدلال کر کے ان پر عمل کیا ہو عام اس سے کہ ان کا

طریق صحیح ہو یا نہ ہو لیکن جو حدیثیں غیر صحیح یا ضعیف ہیں ان کی علت اور سقم کو امام ترمذی نے واضح کردیا ہے تاکہ وہ خود بری الذمہ ہو جائیں اس شرط کے تحت امام ترمذی کی حدیثیں چار قسم پر منقسم ہوتی ہیں۔

احادیث جامع ترمذی کے ارکانِ اربعہ

☆ امام ترمذی اس کتاب میں چار قسم کی حدیثیں جمع کی ہیں

اول وہ جن کی صحت یقینی ہے اور جو بخاری و مسلم کے موافق ہوں۔

دوم وہ حدیثیں جو ابوداؤد و نسائی کی شرط پر ہوں جیسا کہ ابوداؤد اور نسائی کی قسم ثانی میں ہم بتا چکے ہیں۔

تیسری قسم ابوداؤد اور نسائی کی قسم ثالث کی طرح ہے امام ترمذی نے ایسی احادیث کا اخراج کیا اور ان کی علت کو بیان کردی۔

چہارم وہ غیر صحیح اور ضعیف احادیث ہیں جن سے بعض فقہا نے استدلال کر کے ان پر عمل کیا اور ان کی طرف امام ترمذی نے اپنے اس قول میں اشارہ کردیا کہ میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث نہیں رکھی جس پر بعض فقہا کا عمل نہ ہو۔

☆ اس اصول کے مطابق ترمذی کی ہر حدیث فی الجملہ قابل استدلال اور معمول بہا ہے عام اس سے کہ اس کا طریق صحیح ہو یا نہ ہو امام ترمذی نے بری الذمہ ہونے کے لئے اس قسم کی احادیث پر کلام کردیا ہے اور اس کے اسقام کو اچھی طرح واضح فرمادیا ہے۔

تنبیہ

☆ شرط اخراج سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ حدیث جو کسی امام کی شرط کے موافق ہو اس کا اخراج اس امام کے لئے ضروری ہے۔ اس کا شرط کے موافق ہونا ضروری ہے۔

امام ترمذی کا طریق کار

☆ جامع ترمذی میں امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا طریق کار یہ ہے کہ وہ ایک باب کا عنوان قائم کرتے ہیں اسمیں کسی صحابی کی مشہور حدیث طریق صحیح کیساتھ پائی جاتی ہے جس کی تخریج کتب صحاح میں کی گئی ہے اس حدیث سے جو حکم مستفاد ہوتا ہے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اسی حکم کو ایک دوسرے صحابی کی حدیث سے وارد کرتے ہیں جس کی تخریج کتب صحاح میں نہیں کی گئی اور جس کا طریق پہلی حدیث کے طریق کی طرح نہیں ہوتا لیکن حکم صحیح ہوتا ہے پھر "وفی الباب عن فلان و فلان" کہہ کر چند صحابہ کا نام لیتے ہیں (جن سے اس عنوان باب کے مطابق احادیث مروی ہیں) اور ان میں اس صحابی کا نام بھی ذکر کردیتے ہیں جسکی حدیث سے حکم مستنبط کیا تھا۔

خصوصیات و محاسن جامع ترمذی

☆ مجموعی طور پر فوائد حدیثیہ کے لحاظ سے جامع ترمذی تمام کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے حسن ترتیب، عدم تکرار، بیان مذاہب، استدلال فقہا، احوال حدیث کی تفصیل، صحیح، حسن، ضعیف، متصل، مرسل وغیرہ۔

☆ راویوں کے نام، ان کے القاب اور کنیت کے علاوہ ایسے فوائد کثیرہ کو بھی جامع ترمذی میں رکھ دیا گیا ہے جن کا تعلق علم الرجال اور حدیث کے اصول ہمہ سے ہے۔ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "قوت المغتذی" میں قاضی ابوبکر بن العربی کا قول

ان کی شرح سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کتاب ابوعیسیٰ کی طرح کسی کتاب میں حلاوت ونفاست نہیں پائی جاتی۔ اس کتاب میں چودہ علوم ہیں جس میں سے ہر علم اپنے باب میں اصل کی حیثیت رکھتا ہے جس سے کئی شاخیں نکلتی ہیں وہ علوم حسب ذیل ہیں

جامع ترمذی کے چودہ علوم

(۱) اصناف فوائد پر کتاب کی تالیف وترتیب کے ساتھ بیان سند

(۲) تصحیح حدیث (۳) سقم روایت کا بیان (۴) تعدد طریق کا ایراد

(۵) جرح رواۃ (۶) تعدیل رواۃ (۷) راویوں کے نام

(۸) راویوں کی کنیت (۹) بیان وصل (۱۰) بیان قطع

(۱۱) معمول بہا کا اظہار (۱۲) متروک کا ایضاح

(۱۳) رد وقبول آثار کے بارے میں اختلافِ علماء

(۱۴) تاویل حدیث میں اختلافِ قول

☆ اس کے بعد امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے جامع ترمذی کی تعریف میں بعض علمائے اندلس کا ایک نہایت بہترین قصیدہ نقل کیا ہے جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں

کتاب الترمذی ریاض علم جلت ازهاره، زهر النجوم

ترجمہ: کتاب ترمذی (کے ابواب) گویا علم کے باغیچے ہیں جن کے پھول روشن ستاروں کے مشابہ ہیں۔

به الآثار واضحة ابینت بالفاظ اقیمت کالرسوم

ترجمہ: اس میں واضح آثار کو بیان کیا گیا ہے، ایسے الفاظ کے ساتھ جو مضبوط نشانات کی طرح قائم کردیئے گئے ہیں۔

فاعلاها الصحاح وقد انارت نجوما للخصوص وللعموم

ترجمہ: ان میں اعلیٰ وصحیح حدیثیں ہیں جنہوں نے روشن کردیا ہے ستاروں کو ہر خاص وعام کے لئے۔

ومن حسن یلیها او غریب وقد بان الصحیح من السقیم

ترجمہ: ان میں بعض آثار حسن ہیں اور بعض غریب اور ہر صحیح حدیث سقیم سے ممتاز ہوگئی۔

فعلله ابو عیسیٰ مبینًا معالمها لطلاب العلوم

ترجمہ: پھر امام ابوعیسیٰ نے سقیم حدیث کی علت بیان کرکے اس کی علامتوں کو طالبانِ علوم کے لئے ظاہر کردیا ہے۔

وطرزه بآثار صحاح تخیرها اولوا النظر السلیم

ترجمہ: اور ایسے ایسے آثار صحیحہ کے ساتھ مزین کیا ہے جنہیں سلیم النظر علماء نے بہت پسند کیا۔

من العلماء والفقهاء قدما — واھل الفضل والنھج القویم

ترجمہ: اور اسے پسند کرنے والے پرانے علماء اور فقہاء اور اہل فضل واصحاب صراطِ مستقیم ہیں۔

فجاء کتابہ علقًا نفیسًا — تفتن فیہ ارباب العلوم

ترجمہ: امام ابوعیسیٰ کی کتاب بڑی بیش بہا عمدہ بن کر آئی جس میں ارباب علوم نے رغبت کی ہے۔

ویقتبسون منہ نفیس علم — یفید نفوسھم اسنی الرسوم

ترجمہ: وہ اس سے نہایت عمدہ علم حاصل کرتے ہیں جو ان کی جانوں کو بہترین قیمتی علامات کا فائدہ دیتا ہے۔

کتبناہ رویناہ لنروی — من التسنیم فی دار النعیم

ترجمہ: ہم نے اس کتاب کو لکھا اس کی روایت کی تا کہ ہم سیراب ہوں تسنیم کے پانی سے جنت میں۔

وغاص الفکر فی بحر المعانی — فادرک کل معنی مستقیم

ترجمہ: فکر نے معانی کے سمندر میں غوطہ لگایا تو اس نے ہر درست معنیٰ کو پالیا۔

فاخرج جوھرًا یلتاح نورًا — فقلد عقدہ اھل الفھوم

ترجمہ: پھر اس نے چمکتے ہوئے نورانی موتی نکالے جن کا ہار علم وخرد والوں کو پہنایا۔

جزای الرحمٰن خیرًا بعد خیر — ابا عیسٰی علی الفعل الکریم

ترجمہ: خدائے رحمٰن پے در پے جزائے خیر دے امام ابوعیسیٰ کو ان کے اس بہترین نیک کام پر۔

☆ نیز امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "قوت المغتذی" شرح ترمذی میں فرمایا کہ امام ابوعبداللہ محمد بن عمر بن رشید کا قول ہے کہ میرے نزدیک اقرب الی التحقیق یہ ہے کہ جامع ترمذی کا صف وار ابواب کی صورت میں احادیث پر مشتمل ہونا مستقل علم ہے اور فقہ دوسرا علم ہے اور علل حدیث وبیان صحیح وسقیم ومراتب ما بینھما تیسرا علم ہے اور اسماء وکنی چوتھا علم ہے۔ تعدیل وتجریح پانچواں علم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پانے والوں اور نہ پانے والوں کا بیان اور جن صحابہ کرام سے امام ترمذی نے اپنی احادیث کو مستند کیا ہے ان کا ذکر چھٹا علم ہے اور جن دیگر صحابہ کرام نے اس حدیث کو روایت کیا ہے ان کو شمار کرنا ساتواں علم ہے جامع ترمذی کے یہ سات علم اجمالی ہیں اگر ان کی تفصیل کی جائے تو کثیر ہو جائیں گے۔ حاصل کلام یہ کہ جامع ترمذی کی منفعت بہت کثیر ہے اور اس کے فوائد بڑے مستحکم، قیمتی اور نادر ہیں۔

☆ حافظ فتح الدین سید الناس نے کہا کہ جن علوم کا ذکر امام ابوعبداللہ نے نہیں کیا ان میں بیان شذوذ آٹھویں قسم ہے اور بیان موقوف نویں قسم ہے اور مدرج کا بیان جامع ترمذی کے علوم کی دسویں قسم ہے۔ یہ انواع ایسے ہیں جن کے فوائد بے شمار ہیں ان کے علاوہ جامع ترمذی میں وفیات اور تنبیہ علی معرفۃ الطبقات اور اسی جیسے دیگر علوم فوائد تفصیلیہ میں شامل ہیں جن کی طرف امام عبد

اللہ محمد بن عمر بن رشید کے اس کلام میں اشارہ گزر چکا ہے کہ یہ "سات علم اجمالی ہیں اگر ان کی تفصیل کی جائے تو کثیر ہو جائیں گے۔"

☆ شیخ ابراہیم بیجوری نے مواہب اللدنیہ میں علی الشمائل المحمدیہ میں کہا "اے مخاطب جامع صحیح ترمذی تیرے لئے کافی ہے جو فوائد حدیثیہ مسائل فقہیہ اور مذاہب سلفیہ وخلفیہ سب کی جامع ہے یہ کتاب مجتہد اور مقلد دونوں کے لئے کافی ہے۔" اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کہا کہ مصنفین محدثین میں جن کا علم وسیع اور تصنیفات نافع ترین اور ذکر کے اعتبار سے زیادہ مشہور ہیں رجال اربعہ ہیں جو زمانہ کے لحاظ سے متقارب ہیں ان میں اول امام ابوعبداللہ البخاری ہیں جن کی غرض یہ تھی کہ احادیث صحیحہ مستفیضہ، متصلہ کو ان کے غیر سے مجرد کریں اور مسائل فقہیہ کا استنباط اس کے علاوہ احادیث سے سیرت وتفسیر کا بیان کا مقصد تھا اسی مقصد کے پیش نظر انہوں نے جامع صحیح بخاری تصنیف کی اور اپنی شرائط کو پورا کیا اور لاریب انہوں نے شہرت وقبول کا وہ مقام پایا جس کے اوپر کوئی درجہ متصور نہیں ہو سکتا۔

☆ دوسرے امام مسلم نیشاپوری ہیں جو ایسی صحیح حدیثوں کی تجرید میں مشغول رہے جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق تھا اور وہ متصل و مرفوع تھیں جن سے سنت کریمہ کا استنباط ہو سکتا ہے۔ امام مسلم نے ان سب حدیثوں کو اذہان کے قریب لانے اور ان سے استنباط کو آسان کرنے کے لئے بہترین ترتیب کے ساتھ مرتب کیا اور حدیث کے جمیع طریق کو ایک جگہ جمع کر دیا تاکہ اختلاف متون کی وضاحت اور تشعب اسانید کی خوب صراحت ہو جائے۔

☆ تیسرے ابوداؤد سجستانی ہیں انہوں نے اپنی ہمت کو ان احادیث کے جمع کرنے میں صرف کیا جن سے فقہاء نے استدلال کئے اور علمائے امصار نے ان پر تخریج احکام شرعیہ کی بنیاد قائم کی۔ انہوں نے اپنی سنن وتصنیف کی اور اس میں صحیح، حسن، لین، صالح العمل سب حدیثوں کو جمع کر دیا۔ ابوداؤد نے کہا "میں نے اپنی سنن میں ایسی کوئی حدیث ذکر نہیں کی جس کے ترک پر لوگوں کا اجتماع ہو۔" اھ۔ اس میں جو ضعیف حدیثیں تھیں امام ابوداؤد نے ان کے ضعف کی تصریح کر دی اور ان میں جو علت تھی اس کو نہایت عالمانہ طریقہ سے بیان کر دیا اور ہر حدیث پر ایسا عنوان قائم کیا جس کے مطابق علماء اور اہل مذاہب نے اپنے مسلک ومذہب کے لئے استنباط کیا۔

☆ اور چوتھے ابوعیسیٰ ترمذی ہیں۔ جامع ترمذی دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا امام ترمذی نے شیخین کے طریقہ کو پسند کیا کہ انہوں نے ہر اہل مذہب کے مطابق احادیث کو جمع کر دیا۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی نے شیخین اور ابوداؤد دونوں کے طریقوں کو اپنی جامع میں جمع کر کے ان پر مذاہب صحابہ وتابعین وفقہائے امصار کے بیان کا اضافہ کر دیا اور ایک جامع کتاب مرتب کر دی اور نہایت لطیف اختصار کے ساتھ طریق حدیث کو مختصر کیا۔ ایک طریق کو ذکر کیا اور باقی کی طرف (وفی الباب فلاں وفلاں کہہ کر) اشارہ کر دیا اور ہر حدیث کے حال کو واضح طور پر بیان کر دیا کہ وہ صحیح ہے یا حسن ہے، ضعیف ہے یا منکر ہے اور ساتھ ہی وجہ ضعف کو بھی ظاہر کر دیا تاکہ طالب حدیث کو بصیرت حاصل ہو جائے اور وہ جان لے کہ کون سی حدیث اعتبار کی صلاحیت رکھتی ہے اور کون سی نہیں رکھتی۔

☆ امام ترمذی نے حدیث کے مستفیض یا غریب ہونے کا بھی ذکر کر دیا اور مذاہب صحابہ وائمہ مجتہدین کو بھی بیان کر دیا جو راوی اپنے

نام سے مشہور نہ تھے ان کا نام بتا دیا اور جن کی کنیت مشہور نہ تھی ان کی کنیت ظاہر کر دی۔ الغرض اہل علم کے لئے کوئی خفا باقی نہ رکھی اسی لئے یہ مشہور ہے کہ "انه كاف للمجتهد مغن للمقلد" انتہی۔

☆ اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بستان المحدثین میں فرمایا کہ فن حدیث میں امام ترمذی کی تصانیف کثیر ہیں ان میں سب سے بہتر جامع ترمذی ہے بلکہ کئی وجوہ سے وہ جمیع کتب حدیث سے احسن ہے اول حسن ترتیب اور عدم تکرار کی وجہ سے۔ دوم مذاہب فقہا اور اہل مذہب کے وجوہ استدلال ذکر کرنے کی وجہ سے۔ سوم انواع حدیث، حسن، ضعیف، غریب اور معلل وغیرہ بیان کرنے کی جہت سے۔ چہارم راویوں کے نام، القاب، کنیت اور علم رجال کے متعلق دیگر فوائد بیان کرنے کی وجہ سے۔

جامع ترمذی کا مرتبہ

☆ جامع ترمذی کے مرتبہ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ صحیحین کے بعد اس کا تیسرا مرتبہ ہے بعض نے کہا کہ سنن ابو داؤد کے بعد، ایک قول یہ کہ جامع ترمذی سنن نسائی کے بعد چوتھے مرتبے میں ہے۔ کشف الظنون میں ہے "جامع الصحيح الامام الحافظ ابی عیسٰی محمد بن عیسٰی الترمذی وهو ثالث الكتب الستة فی الحدیث" یعنی اس کا مرتبہ صحیحین کے بعد ہے اور امام سیوطی نے تدریب الراوی ص ۵۶ پر فرمایا "قال الذهبی انحطت رتبة جامع الترمذی عن سنن ابی داؤد ونسائی لاخراجه حدیث المصلوب والكلبی وامثالا" انتہی۔

☆ اور کتب اسماء الرجال التقریب وتہذیب التہذیب اور خلاصہ وغیرہ کے رموز سے مفہوم ہوتا ہے کہ جامع الترمذی کا مرتبہ سنن ابی داؤد کے بعد اور سنن نسائی سے پہلے ہے کیونکہ ان کتابوں کے مصنفین اپنی رموز میں د۔ ت۔ س لکھتے ہیں اور وہ ان حروف سے سنن ابو داؤد جامع ترمذی اور سنن نسائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

☆ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب جامع صغیر میں بیان رموز میں کہا

"خ، البخاری۔ م، المسلم۔ ق، لهما۔ د، لابی داؤد۔ ت، الترمذی۔ ن، نسائی" انتهٰی۔

☆ امام سخاوی نے اپنی شرح فیض القدیر میں کہا

"ضیع المؤلف قاض بان جامع الترمذی من ابی داؤد والنسائی فی الترتبته" انتهٰی۔

☆ لیکن اظہر وہی ہے جو کشف الظنون میں ہے کہ جامع ترمذی کتب صحاح ستہ کی تیسری کتاب ہے اور امام ذہبی کے قول میں نظر ہے کیونکہ ترمذی نے اگرچہ حدیث مصلوب اور کلبی وغیرہ ضعفاء مجروحین کی احادیث کا اپنی جامع میں اخراج کیا ہے لیکن انہوں نے ان کے ضعف کو بھی بیان کر دیا۔ اس لئے اس قسم کی حدیثیں امام ترمذی کے نزدیک باب شواہد اور متابعت سے قرار پائیں گی۔ جیسا کہ امام حازمی نے فرمایا

ان شرط الترمذی ابلغ من شرط ابی داؤد لان الحدیث اذا كان ضعفًا او من حدیث اهل طبقة الرابعة فانه یبین ویبنه علیه فیصیر الحدیث عنده من باب الشواهد و اعتماده علی ماصح عن الجماعة انتهٰی۔

☆ یعنی ترمذی کی شرط ابوداؤد کی شرط سے ابلغ ہے اس لئے کہ جب کوئی حدیث ضعیف ہوتی ہے یا اس کا راوی اہل طبقہ رابعہ سے ہوتا ہے تو امام ترمذی اسے بیان کر کے پوری طرح اس پر تنبیہ فرماتے ہیں ایسی صورت میں وہ حدیث ان کے نزدیک باب شواہد سے ہوتی ہے اوران کا اعتماد اسی پر ہوتا ہے جو اصحاب صحاح سے صحت کے ساتھ مروی ہے۔ انتہیٰ۔

☆ بہر حال جامع ترمذی سنن ابی داؤد اور سنن نسائی سے کہیں زیادہ نافع اور فوائد کی جامع ہے۔

جامع ترمذی کا طبقہ

☆ صحت وشہرت کے اعتبار سے کتب حدیث کے چار طبقے ہیں۔ طبقہ اولیٰ میں صرف چار کتابیں مؤطا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور طبقہ ثانیہ میں سنن اربعہ ہیں جن میں جامع ترمذی شامل ہے اور طبقہ ثالثہ میں وہ مسانید، جوامع اور مصنفات ہیں جن میں صحیح، حسن، ضعیف، معروف، غریب، شاذ، منکر، ہر قسم کی حدیثیں پائی جاتی ہیں اور علماء میں ان کو شہرت کا وہ درجہ حاصل نہیں ہوا جو پہلے دو طبقوں کی کتابوں کو حاصل ہے جیسے مصنف عبدالرزاق اور مسند عبد بن حمید، طحاوی وطبرانی وغیرہ اور طبقہ رابعہ میں وہ کتابیں ہیں جو عرصۂ دراز کے بعد تصنیف ہوئیں اور ان میں ایسی روایات بھی پائی جاتی ہیں جو طبقتین اولین میں شامل تھیں جیسے مسند فردوس، کتاب الضعفاء للعقیل و کتاب الکامل لابن عدی۔

اعلیٰ اسانید ترمذی

☆ جس سند میں امام ترمذی اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صرف تین واسطے پائے جاتے ہیں وہ سند امام ترمذی کی اعلیٰ اسانید ہے اور ایسی سند کے ساتھ جامع ترمذی میں صرف ایک حدیث ہے جسے تین واسطوں کی وجہ سے ثلاثی کہا جاتا ہے اور وہ حدیث یہ ہے "حدثنا اسمٰعیل بن موسٰی الفزاری ابن ابنة السدی الکوفی نا عمرو بن شاکر عن انس بن مالک قال قال رسول اللّٰہ ﷺ یاتی علی الناس زمان الصابر فیہم علٰی دینہ کا القابض علی الجمر" ھذا حدیث غریب من ھذا الوجہ. انتھٰی. (جامع ترمذی جلد ۲، کتاب الفتن ص ۵۰) بعض محدثین احناف نے بھی اس حدیث کے ثلاثی ہونے کی تصریح کی ہے ملاحظہ ہو اشعة اللمعات جلد اول ص ۱۸ مصنفہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔

☆ اس حدیث کی سند کے متعلق مرقاۃ شرح مشکوٰۃ مصنفہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ جلد اول ص ۲۱، ۲۲ مطبوعہ مصر کی وہ عبارت جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: اس میں امام ابوعیسیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان دو واسطے ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں یا یہ کہ اس میں نساخ کا تصور واقع ہوا ہے بایں طور کہ مسلم اور ابوداؤد کے ساتھ لفظ بخاری اور ثلاث وسائط کی بجائے واسطتان لکھ دیا گیا۔ ملا علی قاری سے تسامل ہوا جو ملا علی قاری کی جلالت شان سے بہت بعید ہے۔ مگر تصحیف نظر کی بنا پر محال نہیں تاہم اس قسم کا تسامل یا تو ہم ملا علی قاری کی منزلت عظیمہ اور جلالت شان میں کسی قدح کا موجب نہیں۔ امام بخاری سے بھی بعض اوہام صحیح بخاری میں سرزد ہوئے ہیں اور خود امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بسا اوقات تسامل واقع ہوا ہے جیسا کہ ہم ان شاء اللہ امام ترمذی کے ترجمہ میں بیان کریں گے۔

فائدہ ضروریہ

☆ صحیح بخاری میں بائیس حدیثیں ثلاثیات ہیں اور پانچ ثلاثی حدیثیں سنن ابن ماجہ میں ہے۔ ان کے علاوہ مسلم ابوداؤد، نسائی تینوں کتابیں ثلاثیات سے خالی ہیں۔ مسند امام اعظم میں تین سو سے زائد ثلاثیات ہیں اور مسند دارمی میں بقول صاحب کشف الظنون پندرہ ثلاثیات ہیں اور "الحطہ" میں ہے "واما الدارمی فثلاثیاتہ اکثر من ثلاثیات البخاری" کشف الظنون اور الحطہ کی عبارتیں باہم متعارض ہیں اس لئے یہ مقام محل نظر ہے اس پر ان شاءاللہ کسی دوسری فرصت میں ہم تفصیلی بحث کریں گے۔

جامع ترمذی اور حدیث موضوع

☆ حافظ ابن جوزی نے اپنی مشہور کتاب الموضوعات الکبیر میں کہا کہ جامع ترمذی میں تئیس موضوع حدیثیں ہیں لیکن امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب القول الحسن فی الذب عن السنن میں علامہ ابن جوزی کے اس قول کا رد فرمایا اور کہا کہ ابن جوزی نے اگر جامع ترمذی کی احادیث پر وضع کا حکم لگا دیا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ابن جوزی نے تو صحیح مسلم کی حدیث کو بھی موضوع کہہ دیا۔ نہ صرف صحیح مسلم بلکہ صحیح بخاری کی حدیث پر بھی وضع کا حکم لگا دیا۔ جیسا کہ امام جلال الدین سیوطی نے تدریب الراوی میں تفصیل سے بیان کیا۔

☆ خلاصہ یہ ہے کہ ترمذی کی جن احادیث کو علامہ ابن جوزی نے موضوع قرار دیا ہے وہ موضوع نہیں بلکہ ضعیف ہیں۔ جن کے اسباب وعلل کو امام ترمذی نے واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔

جامع ترمذی کی ہر حدیث معمول بہا ہے؟

☆ امام ابوعیسیٰ ترمذی نے کتاب العلل میں جو جامع ترمذی کے آخر میں ہے فرمایا کہ اس کتاب (جامع ترمذی) کی سب حدیثیں معمول بہا ہیں سوائے دو حدیثوں کے ایک حدیث حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کہ نبی ﷺ نے مدینہ منورہ میں نمازِ ظہر اور عصر اور مغرب وعشاء کو بغیر خوف اور بارش اور بغیر سفر کے جمع فرمایا اور دوسری حدیث عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شرابی کو کوڑے مارو۔ اگر چوتھی دفعہ شراب پئے تو اسے قتل کر دو۔

☆ امام ابوعیسیٰ ترمذی نے ان دونوں حدیثوں کو غیر معمول بہا ٹھہرایا لیکن ملا معین نے اپنی کتاب "دراسات اللبیب" میں امام ترمذی کے اس کلام پر تعاقب کیا کہ یہ دونوں حدیثیں بھی معمول بہا ہے۔ قاضی شوکانی نے بھی "نیل الاوطار" میں ان دونوں حدیثوں کو معمول بہا کہا۔ خود حنفیہ کے نزدیک یہ دونوں حدیثیں معمول بہا ہیں۔ بایں طور کہ جمع بین الصلوٰتین سے مراد جمع فعلی ہے اور ہر چوتھی بار شراب پینے والے کو قتل کرنے کے متعلق دوسری حدیث تعزیر پر معمول ہے اور امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا ان دونوں حدیثوں کو غیر معمول بہا کہنا ان کا تسامح اور تغافل ہے جس سے ان کی جلالت شان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

جامع ترمذی میں امام ترمذی کا قول

"هٰذا حدیث حسن غریب صحیح"

☆ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی عادت ہے کہ وہ جامع ترمذی میں اوصاف حدیث بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں "ھٰذا حدیث حسن غریب صحیح" یا "حسن غریب صحیح" ظاہر ہے کہ حسن اور صحت کے جمع ہونے میں کوئی تردد پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ کسی حدیث کا حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ ہونا بھی ممکن ہے اسی طرح غرائب اور صحت کا جمع ہونا بھی ممکن ہے کیونکہ کسی حدیث کیلئے تمام راویوں کا ثقہ ہونا اور اس میں صحت کے تمام شرائط کا پایا جانا اس بات کے منافی نہیں کہ اس کا کوئی راوی تنہا ہو لیکن غرائب اور حسن کے جمع ہونے میں یہ اشکال پیدا ہوتی ہیں کہ امام ترمذی کے نزدیک حدیث حسن کی تعریف میں تعدد طرق معتبر ہے اور حدیث غریب میں ضروری ہے کہ اس کا راوی تنہا ہو اس لئے کسی حدیث کا حسن اور غریب ہونا درست نہیں۔

☆ اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بعض مشائخ حدیث نے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے یہ جواب دیا ہے کہ امام ترمذی کے نزدیک حدیث حسن میں مطلقاً تعدد طرق معتبر نہیں بلکہ اس کا اعتبار حدیث حسن کی ایک قسم میں ہے ہر حدیث حسن میں نہیں۔ امام ترمذی جس جگہ "حسن غریب صحیح" کہتے ہیں وہاں ان کی مراد "حسن" سے وہ قسم ہے جس میں ان کے نزدیک تعدد طرق کا اعتبار نہیں۔ اس جواب کی بناپر امام ترمذی کے نزدیک حدیث حسن کی دو قسمیں ہوئی۔ ایک وہ جس میں تعدد طرق کا اعتبار نہیں ہو وہ غریب ہوسکتی ہے اور بعض مشائخ نے کہا کہ ترمذی "حسن غریب" کہہ کر حدیث کی روایت کے طریقوں کے اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس قول سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ حدیث بعض اسناد سے غریب ہے اور بعض سے حسن اور بعض مشائخ کہتے ہیں کہ امام ترمذی کے قول "حدیث حسن غریب" میں واو مذکور ہو یا محذوف (بہر صورت) بمعنی "او" ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث حسن ہے یا غریب۔ مشائخ حدیث نے ایک یہ بھی جواب دیا ہے کہ ترمذی کے اس قول میں "حسن" کے مصطلاحی معنی مراد نہیں بلکہ لغوی معنی مراد ہیں۔ یعنی "مـا یمیـل الیـه الطبع" لیکن یہ قول بعید ہے اس لئے کسی کلام کو محل اصطلاح میں لغت پر حمل کرنا پسندیدہ نہیں۔ انتہی۔

☆ علامہ ابن صلاح نے مقدمہ ابن الصلاح میں کہا ہے کہ ترمذی کے قول "ھٰذا حدیث حسن غریب صحیح" میں اشکال ہے کیونکہ حسن صحیح سے قاصر ہے ان دونوں کو جمع کرنا قصور کی نفی اور اس کے اثبات کو جمع کرنا ہے۔ علامہ ابن صلاح نے اشکال مذکور وارد کر کے اسکا جواب دیا کہ یہ قول اسناد کی طرف راجع ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث دو سندوں سے مروی ہے۔ ایک "حسن ہے دوسری صحیح"۔

☆ علامہ ابن دقیق العید نے اپنی کتاب "الاقتراح" میں علامہ ابن صلاح کے اس جواب کو رد کرتے ہوئے کہ کہ امام ترمذی نے بعض جگہ کہا ہے "ھٰذا حدیث حسن غریب صحیح لا نعرفه الا من ھٰذا الوجه" علامہ موصوف نے کہا کہ میرے نزدیک اس اشکال کا حل یہ ہے کہ ترمذی کے قول "حسن صحیح" میں حسن کا ذکر ہے اس میں قصـور عـن الصحیح کی قید شرط نہیں البتہ جب وہ

کسی حدیث کو صرف حسن کہیں تو وہ ضرور صحیح سے قاصر ہو گی۔ اس اجمال کا بیان یہ ہے کہ راویوں کی ان صفات کے لئے جو قبول روات کی مقتضی ہیں مختلف درجے ہیں بعض اعلیٰ ہیں بعض ادنیٰ۔ جیسے "حفظ و اتقان" اور "صدق عدم التهمة بالكذب" اور ظاہر ہے کہ کسی راوی میں اعلیٰ درجہ کے وصف کا وجود اس میں ادنیٰ درجہ کے وصف کے پائے جانے کے منافی نہیں۔ جیسے "حفظ و اتقان" "صدق" اور "عدم التهمة" کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ اس لئے وجود ادنیٰ کے لحاظ سے کسی حدیث کو "حسن" کہنا اور اعلیٰ کے اعتبار سے اسی کو "صحیح" کہہ دینا یقیناً صحیح ہے۔

☆ اس بنا پر صحیح حدیث کے لئے حسن ہونا ضروری ہو گا جس کی تائید محدثین کے اس قول سے بھی ہوتی ہے "هذا حديث حسن في الاحاديث الصحيحة" اور یہ متقدمین کے کلام میں موجود ہے۔ انتہی

☆ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے کہا کہ "هذا حديث حسن صحيح" پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا کیونکہ صحیح اور حسن کے درمیان ایک مرتبہ ہے۔ حافظ ابن کثیر نے کہا کہ حدیث مقبول کے تین مرتبے ہیں ایک اعلیٰ ہے اور دوسرا حسن ادنیٰ اور تیسرا وہ ہے جس میں دونوں سے ہر ایک کی آمیزش پائی جاتی ہے جیسے ایک میٹھی چیز ہے اور دوسری کھٹی اور ان کے درمیان تیسری چیز وہ ہے جس میں مٹھاس اور کھٹاس دونوں وصف مشترک طور پر پائے جائیں۔ حافظ ابن کثیر نے کہا اس تقدیر پر "حسن صحیح" کا مرتبہ اس حدیث سے زیادہ ہو گا جس کو صرف "حسن" کہا جائے۔ حافظ ابو الفضل عراقی نے "نكت على ابن الصلاح" میں ابن کثیر کے اس قول کو تحکم قرار دیا۔ امام بدر الدین زرکشی اور حافظ ابو الفضل ابن حجر عسقلانی نے اپنے نكت على ابن الصلاح میں کہا کہ ابن کثیر کا یہ قول "حسن" اور "صحیح" کے درمیان تیسری قسم کے اثبات کا مقتضی ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔ شیخ سراج الدین بلقینی نے بھی محاسن الاصلاح میں اس جواب پر اعتراض کیا لیکن امام شمس الدین حرزی نے اس پر جزم کیا اور کہا کہ امام ترمذی نے جس حدیث کو "حسن صحیح" کہا ہے اس سے ان کی مراد وہ حدیث ہے جس میں "صحت" اور "حسن" دونوں کی مشابہت پائی جاتی ہے اور ان کا مرتبہ صحیح سے کم ہے۔

☆ بدر الدین زرکشی نے کہا کہ جب کسی حدیث کو "حسن صحیح" کہا جائے تو ایسی صورتِ خاصہ میں ترادف مراد ہوتا ہے اگرچہ یہ استعمال قلیل ہے لیکن اس بات کی دلیل ہے کہ اس مخصوص صورت میں ترادف مراد لے کر "حسن صحیح" کہنا جائز ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ایک ہی سند میں دو حالتوں اور دو زمانوں کے اعتبار سے حسن اور صحیح کے حقیقی معنی ہی مراد ہوں کیونکہ ممکن ہے کہ امام ترمذی نے اس حدیث کو ایک شخص سے ایک مرتبہ ایسے حال میں سنا جب کہ وہ مستور تھا پھر وہی شخص معروف بالعدالت ہو گیا اور امام ترمذی نے اس سے دوبارہ اس حدیث کو سنا اس لئے انہوں نے "حسن صحیح" کہہ کر اس کے دونوں وصفوں کو بیان کر دیا اور اس میں شک نہیں کہ امام ترمذی نے ایک حدیث ایک شیخ سے کئی مرتبہ سنی۔ بدر الدین زرکشی نے کہا کہ یہاں یہ بھی احتمال ہے کہ ایک حدیث امام ترمذی کے اجتہاد کی روشنی میں حسن تھی پھر وہی حدیث ان کے اجتہاد میں صحیح قرار پا گئی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جہاں "حسن صحیح" کہا ہے

وہاں ان کی مراد یہ ہو کہ حدیث حسن کے اعلیٰ درجہ میں اور صحیح کے ابتدائی درجہ میں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے طویل بحث کے بعد ابن دقیق العید کے جواب کو قوی کہا۔

☆ امام بدرالدین زرکشی نے کہا کہ اسی قسم کا اشکال امام ترمذی کے اس قول پر بھی وارد ہوتا ہے "هٰذا حديث حسن غريب"

☆ کیونکہ حسن کی شرط یہ ہے کہ وہ معروف من غیر وجہ ہو اور غریب وہ ہے جس کا کوئی راوی اس حدیث کیساتھ منفرد ہو جائے اور ان دونوں میں منافات ہے۔ علامہ زرکشی نے کہا کہ غریب کی قسموں میں سے ایک قسم من جهت المتن ہے، دوسری قسم غريب من جهت الاسناد، امام ترمذی کے قول میں قسم ثانی مراد ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث صحابہ کی ایک جماعت سے معروف ہے لیکن کوئی راوی صحابی سے روایت کرتے ہوئے منفرد ہو گیا ایسی صورت میں وہ حدیث متن کے اعتبار سے حسن ہے اور اسناد کے اعتبار سے غریب۔

تساهل ترمذی

☆ امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ علوم حدیث میں عظیم وجلیل امام ہونے کے باوجود بعض اوقات احادیث کی تصحیح و تحسین میں تساہل سے کام لیتے ہیں مثلاً امام ترمذی نے جامع ترمذی میں کثیر بن عبداللہ بن عوف المرنی کی حدیث "الصلح جائزة بين المسلمين" روایت کر کے اس کی تصحیح کر دی حالانکہ نقاد حدیث نے اس پر شدید جرح کی ہے۔ امام ذہبی نے "میزان الاعتدال" میں لکھا کہ ابن معین نے اس کے حق میں "ليس بشيء" کہا اور امام شافعی اور ابوداؤد نے اسے "ركن من اركان الكذب" قرار دیا۔ امام احمد نے اس کی روایت کو رد کیا اور دار قطنی وغیرہ نے اس متروک کہا۔ ابو حاتم اور امام نسائی نے اس کے معتبر اور ثقہ ہونے کا انکار کیا۔ مطرف بن عبداللہ المدنی نے لکھا ہے وہ بڑا جھگڑالو تھا ہمارے اصحاب اس سے روایت نہ کرتے تھے۔ آخر میں امام ذہبی نے کہا "واما الترمذی فروی من حديثه الصلح جائز بين المسلمين وصححه فلهٰذا لا يعتمد العلماء على تصحيح الترمذی." انتھیٰ

☆ لیکن حق یہ ہے کہ امام ترمذی کی تصحیح یا تحسین پر محدثین کا عدم اعتماد اس وقت ہے جب کہ وہ اس تصحیح و تحسین میں منفرد ہوں۔ اگر کوئی دوسرا محدث ان کے ساتھ موافقت کرے تو ان کی تصحیح و تحسین معتبر اور لائق اعتماد ہوگی۔

شروح ترمذی

☆ جامع ترمذی کی بکثرت شروح اور تعلیقات ہیں اس کے مختصرات بھی ہیں اور اس پر مستخرجات بھی، اس کی شروح میں سب سے زیادہ مشہور شرح "عارضۃ الاحوذی" ہے جس کے مصنف قاضی ابوبکر بن عربی مالکی متوفی ۵۴۶ھ ہیں۔

☆ امام سیوطی نے قوت المغتذی میں کہا کہ عارضة الاحوذی کے سوا جامع ترمذی کی کوئی کامل شرح ہمارے علم میں نہیں۔

☆ ترمذی کی دوسری شرح "المنقح الشذی" ہے جو دس جلدوں میں ہونے کے باوجود مکمل نہیں لیکن اس میں علوم حدیث کا بیش بہا خزانہ پایا جاتا ہے۔ اس کے مصنف محمد بن محمد بن محمد المعروف بابن سید الناس کا تکملہ ہے۔ چوتھی شرح حافظ ابن ملقن کی ہے۔ حافظ ابن ملقن ائمہ محدثین میں عظیم وجلیل امام ہیں جنہوں نے بکثرت شروح اور علوم حدیث میں کتابیں تالیف فرمائیں۔ آپ کی وفات

۸۰۴ھ میں ہوئی۔ پانچویں شرح حافظ ابن رجب بغدادی حنبلی کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے "الدرر الکامنۃ" میں کہا کہ ابن رجب آٹھویں صدی کے جلیل القدر علماء محدثین میں سے تھے ان کی ولادت ۷۰۶ھ میں ہوئی اور آپ کی وفات ۷۹۵ھ میں ہوئی۔ آپ دمشق میں فوت ہوئے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک کے نزدیک دفن کیے گئے۔ چھٹی شرح حافظ ابن حجر عسقلانی کی ہے جس کا ذکر انہوں نے فتح الباری میں کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی عظیم و جلیل محدث ہوئے ہیں جن کی تصنیفات علوم حدیث میں بے شمار ہیں۔ آپ کی ولادت ۷۷۳ھ میں ہوئی اور وفات ۸۵۲ھ میں، ساتویں شرح "العرف الشذی" ہے جس کے مصنف حافظ عمر بن ارسلان بلقینی متوفی ۸۰۵ھ ہیں۔

☆ یہ شرح بھی مکمل نہ ہو سکی۔ آٹھویں شرح "قوت المغتذی" ہے اس کے مصنف حافظ جلال الدین عبد الرحمٰن سیوطی ہیں جنہیں ہر علم میں کمال حاصل تھا۔ خصوصاً علم حدیث میں آپ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر علوم کی طرح علوم حدیث میں بھی بے شمار کتابیں لکھیں۔ آپ کی ولادت ۸۴۹ھ میں اور وفات ۹۱۱ھ میں ہوئی۔

☆ شروح ترمذی میں علامہ محمد طاہر صاحب "مجمع البحار" متوفی ۹۸۶ھ کی شرح بھی قابل ذکر ہے۔ اسی طرح ترمذی کی شرح ابو الطیب السندی اور شرح سراج احمد سرہندی اور شرح ابو الحسین عبد الہادی السندی المدنی متوفی ۱۱۳۹ھ بھی قابل ذکر ہیں۔ شرح سراج احمد سرہندی فارسی میں ہے جو عارضۃ الاحوذی اور شرح ابی الطیب اور قوت المغتذی للسیوطی کے ساتھ ہندوستان میں طبع ہوئی اور شرح ابی الحسن بن ابی الہادی جامع ترمذی کے ساتھ مصر میں طبع کی گئی۔

ترجمہ امام ابو عیسیٰ ترمذی

☆ امام ابن اثیر نے جامع الاصول جلد اول ص ۱۹۰ میں کہا کہ امام ترمذی ابو عیسیٰ محمد بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک السلمی الضریر البوغی الترمذی مشہور حافظ حدیث اور جامع کے مصنف ہیں۔ کتاب علل الکبیر اور شمائل کے مصنف بھی امام ترمذی ہیں۔ آپ علمائے حفاظ اعلام میں سے ہیں۔ آپ کی ولادت ۲۰۹ھ میں ہوئی۔ انتہی

☆ حافظ ابن حجر نے "تہذیب التہذیب" میں کہا کہ امام ترمذی ائمہ محدثین میں عظیم و جلیل امام ہیں آپ نے علم حدیث حاصل کرنے کے لئے دور دراز شہروں کا سفر کیا اور بے شمار لوگوں سے حدیث سنی۔ آپ کے مشائخ خراسانی، عراقی اور حجازی ہر مرکز علم کے شیوخ ہیں جن کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ امام ترمذی سے ابو حامد احمد بن عبد اللہ بن داؤد المروزی التاجر اور ابو سعید الہیثم بن کلیب الشاشی اور ابو العباس محمد بن احمد بن محبوبی المروزی اور احمد بن یوسف النسفی اور ابو الحارث اسد بن حمدویہ اور داؤد بن نصر بن سہیل البزدوی اور عبد بن محمد بن محمود النسفی اور محمود بن نمیر اور ان کے بیٹے محمد بن محمود اور محمد بن مکی ابن نوح اور ابو جعفر محمد بن سفیان بن نضر اور محمد بن منذر بن سعید الہروی اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے روایت حدیث کی۔ انتہی

☆ امام ترمذی سے امام بخاری نے بھی دو حدیثیں سماع کیں۔ ایک عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث جو آیہ کریمہ "ما

قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا“ کی تفسیر میں ”قال اللینۃ النخلۃ“ الحدیث ہے۔ امام ترمذی نے سورۂ حشر کی تفسیر میں اس حدیث کے اخراج کے بعد کہا ”سمع منی محمد بن اسمٰعیل ھذا الحدیث“ انتھٰی۔

☆ دوسری ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ”یا علی لا یحل لاحد ان یجنب فی ھذا المسجد غیری وغیرک“ انتھٰی۔

☆ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے مناقب علی کرم اللہ وجہہ میں اس حدیث کا اخراج کر کے فرمایا ”قد سمع محمد بن اسمٰعیل منی ھذا الحدیث و استغربہ“ انتھٰی

☆ امام ذہبی نے کہا کہ ابن حبان نے کتاب الثقات میں فرمایا کہ امام ابوعیسیٰ ترمذی حدیث کے جامع مصنف، حافظ اور ذاکر ہیں۔ ابوسعید ادریسی نے کہا ”امام ابوعیسیٰ حفظ میں ضرب المثل تھے۔“ اور حاکم نے کہا کہ میں نے عمر بن علک سے سنا وہ کہتے تھے ”امام بخاری دنیا سے تشریف لے گئے اور انہوں نے خراسان میں ابوعیسیٰ جیسا عالم اور حافظ و متقی و زاہد اپنے بعد نہ چھوڑا۔ امام ترمذی خدا کے خوف سے اس قدر روتے تھے کہ نابینا ہو گئے اور کئی سال انہوں نے دنیا میں نابینا ہونے کی حالت میں گزارے۔ کسی محدث نے امام ترمذی کا امتحان لینے کے لئے امام ترمذی کے سامنے ایسی چالیس حدیثیں پڑھیں جو اس محدث کے غرائب میں سے تھیں۔ امام ترمذی نے انہیں سن کر اسی طرح وہ حدیثیں سنا دیں۔ اس محدث نے کہا کہ اے ابوعیسیٰ ترمذی میں نے تجھ جیسا حافظ نہیں دیکھا۔ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں کہا کہ ابوسعید ادریسی فرمایا کرتے تھے کہ امام ترمذی ائمہ حدیث میں سے ہیں کہ علوم حدیث میں ان کی اقتدا کی جاتی ہے۔

☆ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی قوت حافظہ بے نظیر تھی آپ کے حفظ کے عجیب و غریب واقعات تذکرۃ الحفاظ، تہذیب الحدیث وغیرہ میں بکثرت مذکور ہیں جنہیں بخوفِ طوالت ہم نے نقل نہیں کیا۔

تصانیف ترمذی

☆ سب سے زیادہ نافع کتاب ان کی ”جامع“ ہے اس کے علاوہ ”علل الکبیر“ بھی ان کی ایسی تصنیف ہے جو تعریف سے مستغنی ہے۔ تصانیف ترمذی میں شمائل النبی ﷺ اپنے باب میں بہترین کتاب ہے۔ جس کے الفاظ بھی بے شمار برکتوں کے حامل ہیں۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بارے میں فرمایا ”وخواندان آں برائے مجرب اکابر است“ تفسیر میں بھی امام ترمذی کی ایک بلند پایہ کتاب ہے اور تاریخ اور زہد میں اور الاسماء والکنیٰ میں جیسا کہ تدریب الراوی میں جلال الدین سیوطی نے فرمایا۔

امام ترمذی کی وفات

☆ ابن خلکان نے کہا کہ سمعانی کا قول ہے امام ترمذی کی وفات بمقام قوبیہ بوغ ۲۷۹ھ میں ہوئی شہر ترمذ کے مضافات میں ترمذ سے ۶ فرسخ کے فاصلہ پر ایک قریہ واقع ہے جس کا نام بوغ ہے اور ترمذ نہر بلخ کے کنارے پر ایک پرانا شہر ہے نہر بلخ کو نہر جیحوں بھی کہا

جاتا ہے۔

ابن حزم اور ترمذی

☆ امام ترمذی کے حفظ و اتقان اور ان کے تفقہ پر اعلام امت کا اتفاق ہے اور ان کا ثقہ ہونا متفق علیہ ہے لیکن ابن حزم پر تعجب ہے کہ انہوں نے امام ترمذی کو مجہول کہا۔ محققین اہل علم نے ان پر رد کیا جیسا کہ امام ذہبی نے "میزان الاعتدال" میں امام ترمذی کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا

"محمد بن عیسٰی بن سورۃ الحافظ العلم ابو عیسٰی الترمذی صاحب الجامع ثقۃ مجمع علیہ ولا التفات الی قول ابی محمد بن حزم فیہ فی الفرائض من کتب الاتصال انہ مجہول فانہ ماعرفہ ولا دری بوجود الجامع والعلل التی لہ۔ انتہٰی

☆ اسی طرح "سیر النبلاء" میں بھی امام ذہبی نے ابن حزم کے قول مذکور کی تردید فرمائی ہے اور امام حجر عسقلانی نے "تہذیب التہذیب" میں امام احمد بن حنبل کا قول نقل کر کے ابن حزم کا رد فرمایا۔

امام ترمذی کا نابینا ہونا

☆ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے نابینا ہونے میں اختلاف نہیں اس میں اختلاف ہے کہ وہ نابینا پیدا ہوئے تھے یا بعد میں نابینا ہو گئے۔ حق یہ ہے کہ وہ آخر عمر میں نابینا ہو گئے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر نے "تہذیب التہذیب" میں فرمایا اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "بستان المحدثین" میں امام ترمذی کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا "بخوفِ الٰہی بسیار گریہ وزاری کردو نابینا شد"

ایک غلطی کا ازالہ

☆ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بستان المحدثین میں فرمایا کہ حکیم ترمذی صاحب "نوادر الاصول" امام ابو عیسٰی ترمذی صاحب الجامع کے غیر ہیں۔ اکثر جہلاء غلطی سے یہ گمان کر لیتے ہیں کہ حکیم ترمذی ہی ابو عیسٰی ترمذی ہیں الخ۔ کتب اسماء الرجال وتراجم ائمہ حفاظ سے ثابت ہے کہ تین ائمہ حدیث ترمذی کے نام سے مشہور ہیں ایک ابو عیسٰی ترمذی صاحب الجامع، دوسرے ابو الحسن احمد بن الحسن جو "الترمذی الکبیر" کے نام سے مشہور ہیں۔ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں کہا "الترمذی الکبیر ہو الحافظ العلم ابو الحسن احمد بن الحسن الترمذی"

☆ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں حاکم کا قول نقل کیا کہ ترمذی کبیر ۲۴۱ھ میں وارد نیشاپور ہوئے اور تیسرے حکیم ترمذی ابو عبد اللہ محمد بن علی بن الحسن بن بشیر الزاہد الحافظ المؤذن صاحب التصانیف ہیں وھو مشہور بالحکیم الترمذی امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حکیم ترمذی کے ترجمہ میں کہا کہ علمائے نیشاپور نے ان سے روایت حدیث کی۔ وہ ۲۸۵ھ میں نیشاپور تشریف لے گئے۔

امام ترمذی کی کنیت

☆ امام ترمذی کے ترجمہ میں ہم بتا چکے ہیں کہ ان کا نام محمد اور ان کی کنیت ابو عیسٰی ہے۔ بعض علماء نے ابو عیسٰی کنیت رکھنے کو مکروہ قرار

دیا۔ ان کی دلیل مصنف ابن ابی شیبہ کی وہ حدیث ہے جسے انہوں نے "باب الرجل ان یکتنی بابی عیسٰی" میں روایت کیا۔ زید ابن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ تعالٰی عنہ نے اپنے بیٹے کو مارا جس نے اپنی کنیت ابوعیسٰی رکھی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے فرمایا "ان عیسٰی لیس لہٗ اب"

☆ نیز اسی باب میں امام ابن شیبہ نے ایک مرفوع حدیث بھی روایت کی۔ موسیٰ بن علی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی کنیت ابوعیسٰی رکھ لی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ان عیسٰی لیس لہٗ اب"

☆ امام ترمذی کی طرف سے بعض لوگوں نے ان دونوں حدیثوں کے جواب میں کہا ہے کہ پہلی حدیث مرسل ہے اور دوسری موقوف اور مرفوع۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ اس میں اس کنیت رکھنے سے نہی وارد نہیں ہوتی بلکہ ایک امر واقع کا بیان ہے کہ عیسٰی علیہ السلام کا کوئی باپ نہیں اور حضور ﷺ کا یہ قول مزاح پر محمول ہے اور ابوعیسٰی کے ساتھ کنیت رکھنے کے جواب پر وہ ابوداؤد کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ نے اپنی کنیت ابوعیسٰی رکھی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے ان سے کہا، کیا تمہیں یہ بات کافی نہ تھی کہ تم اپنی کنیت ابوعبداللہ رکھ لیتے۔ انہوں نے فرمایا کہ میری یہ کنیت رسول اللہ ﷺ نے رکھی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی شان یہ ہے کہ "قد غفر له ما تقدم من ذنبه و ما تاخر"

☆ ہم تو حضور ﷺ جیسے نہیں اور حافظ ابن حجر نے اصابہ میں کہا کہ بغوی نے زید بن اسلم کے طریق سے روایت کی کہ مغیرہ بن شعبہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازے پر آ کر اذن طلب کرتے ہوئے اپنے آپ کو ابوعیسٰی کہا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے فرمایا، ابوعیسٰی کون ہے؟ انہوں نے اپنا پورا نام لیا اور کہا کہ مغیرہ بن شعبہ حضرت عمر نے کہا، عیسٰی علیہ السلام کا کوئی باپ ہے؟ اس وقت بعض صحابہ شہادت دی کہ رسول اللہ ﷺ انہیں ابوعیسٰی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے کہا کہ نبی ﷺ "غفر له" ہیں۔ ہماری یہ شان نہیں۔ ہمیں کیا معلوم کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر ان کی کنیت ابوعبداللہ رکھ دی۔ انتہی

☆ حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث "تکنی بابی عیسٰی" کی تاویل کی اور کہا کہ حضور ﷺ نے ابو عیسٰی کے ساتھ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالٰی عنہ کی کنیت نہیں رکھی بلکہ بعض اوقات انہیں ابوعیسٰی کہہ کر بلایا ہے۔ حضور ﷺ اگر کوئی ایسا کام بھی کر لیں جو بظاہر مکروہ یا خلافِ اولیٰ ہو تو حضور ﷺ کے حق میں وہ کام مسلوب الکراہۃ ہے اور "لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ" کے یہی معنی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ امام ترمذی کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ کا اجتہاد درست نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ حدیث مرفوع اور موقوف دونوں کی روشنی میں "تکنی بابی عیسٰی" سے احتراز اولیٰ معلوم ہوتا ہے لیکن تعجب ہے کہ امام ترمذی کو جن کا نام محمد ہے اپنی کنیت زیادہ محبوب تھی بلکہ نام کی بجائے ابوعیسٰی کنیت ہی کو اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے کہ انہوں نے پوری جامع ترمذی میں کسی ایک جگہ بھی اپنے نام سے اپنے آپ کو ذکر نہیں کیا بلکہ ہر جگہ ابوعیسٰی ہی سے اپنی ذات کو تعبیر کیا ہے۔ فلیتناء مل.

مذہب امام ترمذی

☆ اکثر علماء نے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کو شافعی المذہب کہا اور بعض نے انہیں حنبلی قرار دیا۔ جس کی تصریح کتب طبقاتِ شافعیہ وغیرہ میں موجود ہے لیکن حق یہ ہے کہ وہ شافعی تھے اور جس نے انہیں مجتہد کہا اس کی مراد یہ نہیں کہ وہ شافعی المذہب نہ تھے کیونکہ امام ترمذی میں ملکۂ اجتہاد و استنباط کا پایا جانا اور چند مسائل سے مسلک شافعیہ سے مختلف ہونا شافعی نہ ہونے کو مستلزم نہیں۔

☆ اس مسئلہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا خلاصہ بھی یہی ہے جیسا کہ مقدمہ تحفة الاحوذی میں بحوالہ ''الانصاف'' حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے ''واذا خالف احیانا لم یبال بالمخالفة ولم یخرج عن طریقه الافی مسائل و ذٰلک لا یقدح فی دخوله فی مذهبا الشافعی۔'' (مقدمہ تحفة الاحوذی ص ۱۷۵)

☆ خلاصہ یہ کہ ان کا فی الجملہ مجتہد ہونا ہرگز اس بات کی دلیل نہیں کہ مذہب شافعی میں داخل نہ تھے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اسلام اور عیسائیت

☆ اسلام اور عیسائیت کا تقابل کرنے سے پہلے اسلام اور عیسائیت کے معنی سمجھ لینا ضروری ہے۔

عیسائیت کا مفہوم

☆ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ لفظ عیسائیت کا مفہوم ایک ایسے اضافی معنی کے سوا کچھ نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مسیح ابن مریم کی ذات سے نسبت رکھنے پر دلالت کرتے ہیں۔

اسلام کے معنی

☆ اس کے برخلاف اسلام کے معنی ہیں ''گردن نہادن بطاعت'' یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنا سر جھکا دینا۔ سر جھکانا، خوف اور طمع و محبت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ گویا لفظ اسلام یہ بتاتا ہے کہ ان تینوں حالتوں میں بندے کو صرف خدا کے سامنے جھکنا چاہئے۔

☆ یہاں اتنی بات اور ذہن نشین کر لی جائے کہ خوف، طمع اور محبت تینوں میں اصل محبت ہے کیونکہ محبت کی وجہ سے محبوب کی ناراضگی اور جدائی کا خوف پیدا ہوتا ہے اور اسی محبت کے باعث محبوب کے وصال اور اس کی خوشنودی کی طمع پیدا ہوتی ہے۔ محبت نہ ہو تو نہ خوف ہو نہ طمع۔

☆ اسلام کی روح محبت ہے جس کے باعث مسلم اپنے محبوبِ حقیقی کے سامنے جھک کر مسلم قرار پاتا ہے اور انسانیت کی اصل بھی انس و محبت ہے جس کا حامل ہو کر وہ انسان کہلاتا ہے۔

اسلام اور انسانیت کا تلازم

☆ ان مختصر جملوں سے اہل فہم پر روشن ہو گیا ہو گا کہ اسلام انسانیت کے لئے لازم اور انسانیت اسلام کے لئے ملزوم ہے۔ مزید

وضاحت کے لئے یوں کہیئے کہ بنی نوع آدم کے سلسلہ کو بہ نظر بصیرت دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ انسانیت سے اسلام جدا نہیں ہوتا اور اسلام سے انسانیت علیحدہ نہیں ہوتی۔ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ محبت محبوب کے سامنے اہل محبت کا سر جھکا دیتی ہے۔ اسلام اس معنی کا آئینہ دار ہے۔ جس طرح اسلا کے لفظ سے محبت کے معنی مفہوم ہوتے ہیں اسی طرح لفظ انسان بھی محبت کے معنی دیتا ہے۔

لفظ انسان کی تحقیق

☆ اہل لغت کا قول ہے کہ انسان ''اُنس'' یا ''نَسِی'' سے مشتق ہے۔ انس کے معنی ہیں وہ مانوس ہوا اور نسی کے معنی ہیں وہ بھول گیا۔

☆ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسیت بھولنے کے بغیر نہیں ہوتی اور بھولنا انسیت کے بغیر نہیں پایا جاتا کیونکہ جب کسی کو کسی سے انسیت ہوگی تو اس کی پوری توجہ اور کامل التفات اسی کی طرف ہوگا جس سے وہ مانوس ہے۔ ایسی صورت میں اپنے مانوس یعنی محبوب کے غیر سے توجہ اور التفات کا زائل ہونا ضروری ہے اسی کو نسیان اور بھولنا کہتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی چیز کو بھولتا ہے تو اس کی پوری توجہ کسی دوسری چیز کی طرف ہوتی ہے اور کسی چیز کی طرف کامل توجہ اور التفات کا ہونا انس ہے۔ معلوم ہوا کہ انس بغیر نسیان کے نہیں ہوتا اور نسیان بغیر انس کے نہیں پایا جاتا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انسان کی فطرت میں نسیان اور محبت ہے۔

محبت اور انس کس کے لئے ہے

☆ اب یہ معلوم کرنا چاہئے کہ محبت کس کی ہے اور نسیان کس کا ہے۔ انسان حسن ازل کا آئینہ اور شانِ خالقیت کا نمونہ ہے تو گویا وہی احسن الخالقین اور رب کائنات اس کے لئے بمنزلہ اصل ہے اور یہ بمنزلہ فرع۔

☆ لہٰذا جس طرح فرع اپنی اصل کی طرف مائل اور اس سے مانوس ہوتی ہے اسی طرح انسان اللہ تعالیٰ سے مانوس ہے۔ جب اس کا محبوب اللہ تعالیٰ ہوا تو ضروری ہوگا کہ یہ ماسوی اللہ کو بھول جائے۔ کیونکہ ماسوائے محبوب سے نسیان کا ہونا انسیت کے لوازمات سے ہے۔ جیسا کہ میں ابھی تفصیل سے بین کر چکا ہوں۔

ایک سوال کا جواب

☆ یہاں ایک سوال کا جواب دیتا جاؤں اور وہ یہ کہ اگر آپ فرمائیں کہ ماسوی اللہ کو بھول جانا انسانیت کے لوازمات سے ہے تو دنیا میں انسان کیلئے کوئی مقام نہ رہے گا نہ وہ کاروبار کر سکے گا نہ اپنی زندگی کے ضروریات ولوازمات مہیا کر سکے گا کیونکہ یہ سب چیزیں ماسوی اللہ ہیں۔ تو میں جواباً عرض کروں گا کہ جب کوئی کام خواہ وہ زندگی کے لوازمات سے ہو یا کوئی دوسرا کاروبار ہو محبوب کے حکم کو بجا لانے کے لئے کیا جائے گا تو وہ محبوب کے ماسویٰ کی یاد نہ ہوگی بلکہ محبوب ہی کی یاد قرار پائے گی کیونکہ محبوب کا حکم بجا لانا یہی لوازماتِ محبوت سے ہے۔ ہاں جب محبوب کے احکام کو بھلا کر کوئی کام کیا جائے تو وہ ماسوائے محبوب کی یاد اور محبوب کا بھولنا قرار پائے گا۔ اہل محبت کی شان تو یہ ہے کہ ''دل بہ یار و دست بہ کار'' خلاصہ یہ کہ دنیا کا جو کام خدا کے حکم کی تعمیل میں ہوگا وہ خدا کی یاد ہوگی اور جو کام اس کے حکم کو پس پشت ڈال کر کیا جائے گا وہ اس کی طرف سے غافل ہونے اور اسکے بھولنے کے مترادف قرار پائے گا۔ معلوم ہوا کہ جس

طرح اسلام کے معنی میں محبت پائی جاتی ہے اسی طرح لفظ انسان بھی محبت کے معنی دیتا ہے۔ رہا خوف وطمع تو وہ دونوں لوازمات محبت سے ہیں کیونکہ محبت ہوتی ہے تو محبوب کی ناراضگی کا خوف اور اس کی خوشنودی کی طمع ضرور ہوتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اسلام کے پورے معنی انسانیت میں پائے جاتے ہیں اور انسانیت کے معنی مکمل طور پر اسلام میں موجود ہیں۔ اسلئے ایک دوسرے سے جدا ہونا ممکن نہیں۔

اسلام اور انسانیت کی وسعت

☆ اسلام کی وسعت کو سمجھنے کے لئے انسانیت کی وسعت معلوم کر لینا ضروری ہے۔ وسعت انسانیت کا یہ عالم ہے کہ ایک فرد انسان اٹھارہ ہزار عالم کی حقیقتوں کا اجمالی طور پر مجموعہ ہے۔ تمام عالم خلق کی حقیقتیں انسان کے جسم میں پائی جاتی ہیں اور عالم امر کے حقائق روح انسانی میں مضمر ہیں۔ یہ مجموعہ کائنات اور خلاصۂ موجودات جب اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا سر جھکائے گا تو اس کے دامن انسانیت سے لپٹے ہوئے اٹھارہ ہزار حقائق کائنات کے ذرے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جائیں گے۔

☆ سر کا جھکنا ایک علامت ہے اور دل کا جھکنا حقیقت ہے۔ کوئی علامت حقیقت کے بغیر قابل قبول نہیں ہوتی۔ لہٰذا جس شخص کا دل اللہ تعالیٰ سے باغی ہو اس کا سر جھکنا بالکل بے معنی اور نا قابل اعتبار ہے۔ اسلام کے معنی اور اس کی وسعت کو انسانیت کے معنی اور اس کی وسعت کے سامنے لایا جائے تو میری بات اور زیادہ روشن ہو جائے گی کہ اسلام اور انسانیت چولی دامن کی طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

صداقت اسلام کی دلیل

☆ جب اسلام کے معنی رب تعالیٰ کے سامنے جھکنے کے ہوئے اور انسانیت کو اسلام نے اللہ تعالیٰ کے در پر جھکا دیا تو اس سے بڑھ کر صداقت اسلام کی اور کون سی دلیل ہو سکتی ہے۔ گویا ''اسلام'' اپنے سچا ہونے کی دلیل آپ ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

گر دلیلت باید از وے رومتاب

اسلام کے بعد عیسائیت

☆ اب عیسائیت کی طرف آئیے تو ہر شخص جانتا ہے کہ لفظ عیسائیت یا مسیحیت میں بجز ایک معنی اضافی کے اور کچھ نہیں رکھا۔ ایسی صورت میں اسلام کے ساتھ عیسائیت کے مقابل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسلام انسان کا پیدائشی دین ہے

☆ لطیفہ کے طور پر میرا کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام بنی نوع انسان کا اصلی اور پیدائشی دین ہے کیونکہ اسلام کے معنی ہیں زمین پر سر رکھنا اور انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ سر کے بل پر پیدا ہوتا ہے۔ گویا وہ زبانِ حال سے اعلان کرتا ہے کہ میں اسلام پر پیدا ہوا ہوں اور اپنا سر اپنے رب کے سامنے رگڑتا ہوا دنیا میں آیا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ'' یعنی ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے اس کے ماں باپ اسے یہودی بنالیں یا نصرانی یا مجوسی۔

ایک اور سوال کا جواب

☆ یہاں بھی ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض بچے پاؤں کے بل پیدا ہوتے ہیں پھر یہ کہ سر کے بل پیدا ہونے والوں کے حق میں آپ کا یہ کہنا کہ یہ خدا کے سامنے سر جھکا کر پیدا ہوتے ہیں اور ان کا پیدائشی دین اسلام ہے ایک دعویٰ بلا دلیل ہے کیونکہ ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کا سر میرے معبود کے سامنے ہے۔ آگ، پانی، چاند، سورج، پتھروں، درختوں اور لات ومنات کے پجاری کہہ سکتے ہیں کہ پیدا ہونے والے بچے کا یہ سر ہمارے معبودوں کے سامنے ہے۔

☆ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ شاذ ونادر کسی بچے کا پاؤں کے بل پیدا ہو جانا ولادت کے قانونِ عام کا مناقض نہیں ہو سکتا بلکہ وہ بجائے خود کالعدم ہے اور پیدا ہونے والے بچے کا سر معبودانِ باطلہ کے سامنے جھکا ہوا ہونا اس لئے باطل ہے کہ پیدا ہونے والے شب وروز، بحر وبر کوہ بیاباں اور مختلف مقامات میں پیدا ہوتے ہیں مگر اس وقت وہاں پیدا ہونے والے بچے کے سامنے مشرکین کے معبودانِ باطلہ موجود نہیں ہوتے مگر حق تعالیٰ معبودِ حقیقی زمان ومکان سے پاک اور مبرا ہونے کے باوجود ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے "اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰہِ" جہاں منہ کرو وہیں اللہ تعالیٰ موجود ہے۔ "وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ" تم جہاں ہو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ پیدا ہونے والے بچے کا سر کسی معبود باطل کے سامنے جھکا ہوا نہیں بلکہ اسی معبودِ برحق کے سامنے جھکا ہے جو قید زمان ومکان سے پاک اور بے نیاز ہو کر ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر بچہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا ہوا اس کے سامنے سر جھکاتا ہوا پیدا ہوتا ہے اور یہی اسلام ہے۔

اسلامی تعلیمات صداقت اسلام کی روشن دلیل ہیں

☆ اس کے بعد اسلامی تعلیمات کی طرف آیئے تو صداقت اسلام کا آفتاب اور بھی زیادہ چمکتا ہوا نظر آئے گا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ حدیث شریف میں ہے

☆ "بنی الاسلام علٰی خمس شهادة ان لا الٰه الا اللّٰه وان محمدا عبدهٗ ورسولهٗ واقامة الصلٰوة وایتاء الزكٰوة وصوم رمضان وحج البیت من استطاع الیه سبیلا۔" یعنی اسلام پانچ چیزوں پر قائم کیا گیا ہے (۱) اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے عبد مقدس اور اس کے رسول برحق ہیں (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ دینا (۴) رمضان کا روزہ رکھنا اور (۵) استطاعت والے کے لئے کعبہ کا حج کرنا۔

حقیقت شہادت

☆ شہادت بظاہر زبان سے ادا کی جاتی ہے مگر اس کی حقیقت بڑی وزنی ہے۔ دیکھئے اگر کسی غریب آدمی سے کسی بڑے امیر آدمی یا کسی حاکم کے خلاف گواہی دلوائی جائے تو وہ گواہی دینے سے پہلوتہی کرے گا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ شہادت ان تمام طاغوتی طاقتوں کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اور باغی ہیں۔ اس کا پس منظر نہایت دہشت ناک ہے۔ عظیم ترین مصائب وآلام

اس کے نتائج کے طور پر سامنے آنے والے ہیں۔ جس پر تاریخ اسلام گواہ ہے۔ اس وزنی حقیقت کو سامنے رکھ کر جو شخص کلمۂ شہادت پڑھے گا اس کے دل میں بہت بڑی قوت اور عظیم الشان طاقت موجود ہوگی۔ وہ اپنے دل میں یہ بات طے کر لے گا کہ اگر مصائب و آلام کے پہاڑ بھی مجھ پر گرا دیئے جائیں تو میں اپنی شہادت سے روگردانی نہ کروں گا۔ دراصل یہی قوت کلمۂ شہادت کی حقیقت ہے۔

ارکانِ اسلام کا نماز میں پایا جانا

☆ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ پر الگ الگ تبصرہ کیا جائے تو بہت زیادہ وقت کی ضرورت ہوگی۔ اجمالاً اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ ان پانچوں کو اللہ تعالیٰ نے نماز میں رکھ دیا اور نماز کو پانچوں کا حسین مجموعہ قرار دے دیا۔ غور فرمایئے نماز میں تشہد موجود ہے۔ ہر نمازی قعدہ میں کہتا ہے "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" نماز خود نماز ہے، زکوٰۃ بھی نماز میں موجود ہے اس لئے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی جس کپڑے سے بدن چھپایا جائے گا وہ مال ہے تو گویا مال خرچ کئے بغیر نماز نہ ہوگی یہ زکوٰۃ کی حقیقت ہے۔ روزہ بھی نماز میں ہے اور وہ اس طرح کہ نمازی جب نماز شروع کرتا ہے اور تکبیر تحریمہ کہہ کر ہاتھ باندھتا ہے تو وہ سلام پھیرنے تک نہ پانی پی سکتا ہے نہ کھانا کھا سکتا ہے نہ کوئی اور ایسا کام کر سکتا ہے جس سے روزہ جاتا رہے۔ معلوم ہوا کہ نمازی جتنی دیر تک نماز پڑھے گا اتنی دیر تک اسے روزہ دار رہنا بھی ضروری ہوگا۔ یہ روزہ کی اجمالی حقیقت نماز میں رکھ دی گئی۔ اسی طرح حج کی لطیف حقیقت کی چمک بھی نماز میں نظر آتی ہے جس کا مختصر بیان یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے فرمایا کہ اے میرے بندو! تمام اطراف زمین سے سمٹ کر ہر نماز کے وقت تم کعبہ تو نہیں جا سکتے مگر کعبہ کی طرف منہ کر کے تو کھڑے ہو سکتے ہو یعنی جس طرح کعبہ کے بغیر حج نہیں ہو سکتا اسی طرح بغیر کعبہ کے نماز بھی نہیں ہو سکتی۔ الغرض نماز میں کعبہ مطہرہ کی طرف منہ کر کے ارکانِ صلوٰۃ ادا کرنا حج کی جھلک ہے جو نماز میں پائی جاتی ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

☆ اس مقام پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ نماز میں جب تمام ارکانِ اسلام آ گئے تو بس نماز ہی کافی ہے۔ کلمۂ شہادت، زکوٰۃ، روزہ اور حج کی کیا ضرورت رہی۔ میں کہوں گا کہ نماز میں تمام ارکان و عبادات کی روح کا آ جانا اس لئے نہیں کہ نماز کے علاوہ اور سب عبادتیں ترک کر دی جائیں بلکہ اس لئے ہے کہ نماز کی روح اور اس کے دل کا رابطہ ہر عبادت کے ساتھ قائم ہو جائے تا کہ جب بھی کسی عبادت کا وقت آئے نمازی کو اس کے ادا کرنے میں تامل نہ ہو۔

اسلام میں توحید کی تعلیم

☆ اسلام نے خدا تعالیٰ کی توحید کی تعلیم اس حسن و خوبی کیساتھ دی کہ عقل سلیم کی روشنی میں اس سے بہتر ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق کوئی تعلیم تصور میں نہیں آ سکتی۔ قرآن فرماتا ہے "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ" اے نبی! فرما دو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، اس نے کسی کو نہیں جنا، نہ وہ کسی سے جنا گیا، اس کا کوئی مثل نہیں، وہ اپنی شانِ الوہیت

میں یکتا و بے نظیر ہے۔" عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت اسلام نے عبدهٗ ورسولهٗ سے زیادہ نہیں بتائی بلکہ ان کی الوہیت کا ابطال کیا۔

اسلام میں رسالت کا پاکیزہ تصور

☆ توحید کے بعد رسالت و نبوت کے بارے میں جو پاکیزہ نظریات پیش کیے ہیں وہ بھی اپنی نظیر آپ ہیں۔

اسلام نے عقائد و اعمال اور مکمل دستور العمل قرآن میں پیش کیا

☆ مقدس اسلام نے جزا و سزا، دوزخ و جنت، حسن و قبح، حرام و حلال، پاک و ناپاک حتیٰ کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق جزئیات تک کی تفصیلات اور مکمل ہدایات پیش کیں اور قرآن مجید ایک جامع کتاب ہمارے سامنے پیش کی جو انسانیت کے لئے مکمل دستور العمل اور حیات بعد الموت کے تمام مراحل میں مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔ جس میں شک و شبہ اور تحریف و تبدیل کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ جس کا اعتراف کئے بغیر چارہ کار نہیں۔

اسلام کے مقابلہ میں عیسائیت

☆ اب اس کے مقابلہ میں عیسائیت کو دیکھا جائے تو اس کا کوئی ایک نظریہ بھی اسلام کے نظریات کے سامنے اس قابل نہیں کہ عقل سلیم کی روشنی میں اسے قبول کر لیا جائے۔

☆ لفظ عیسائیت یا مسیحیت سے جو معنی مفہوم ہوتے ہیں وہ خود بتا رہے ہیں کہ اس میں کوئی ٹھوس حقیقت موجود نہیں ہے۔

☆ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس لفظ کا مفاد محض ایک اضافی معنی ہیں جن کا تصور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال و اعمال اور ان کی سیرت طیبہ کے احوال اور تعلیمات کے موجود ہوئے بغیر قائم نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ مدعیانِ مسیحیت کے پاس بھی حضرت مسیح کی کوئی ایسی سیرت موجود نہیں جو مسیحیت کے معنی کے صحیح ہونے کے لئے کافی ہو۔

عیسائیت میں نہ کوئی علمی نظریہ ہے نہ عملی پروگرام

☆ عیسائیت میں بنی نوع انسان کے لئے نہ کوئی علمی نظریہ ہے نہ عملی پروگرام۔ حیاتِ انسانی کے کسی شعبہ کے لئے کوئی ضابطہ عیسائی پیش نہیں کر سکتے۔

عیسائیت کے بنیادی نظریات

☆ مسیحیت یا عیسائیت کے نام سے آج تک جو بنیادی نظریات عیسائیوں نے پیش کیے ہیں وہ صرف دو ہیں "تثلیث" اور "کفارہ"

تثلیث

☆ تثلیث کے متعلق ان کا قول ہے کہ اب، ابن اور روح القدس۔ تینوں کا مجموعہ خدا ہے یہ تین بھی ہیں اور تینوں مل کر ایک بھی اس کی دلیل میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو پیش کرتے ہیں کہ دیکھئے قرآن بھی تثلیث کی تعلیم دیتا ہے قرآن میں سب سے پہلے بسم اللہ ہے جس میں اللہ "رحمٰن" اور "رحیم" تین کا ذکر ہے۔ یہ تینوں مل کر ایک بھی ہیں اور تین بھی مگر اتنا نہیں سمجھتے کہ قرآن نے ایک ذات واجب الوجود کے تین نام بتائے ہیں ہر نام اس کی جداگانہ شان کا مظہر ہے کیونکہ وہ صفاتِ کمالیہ سے متصف ہے کوئی ذات اپنی

شان یا صفت کیساتھ مرکب نہیں ہوا کرتی نہ کوئی ذات اپنی صفات سے مل کر مجموعہ قرار پاتی ہے اور یہ ایسی کھلی ہوئی روشن بات ہے کہ جو معمولی سمجھ رکھنے والا انسان بھی بلا تامل سمجھ سکتا ہے مگر عیسائیوں کی سمجھ پر حیرت ہوتی ہے کہ ایسی واضح بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

کفارہ

☆ یہی حال کفارہ کے مسئلہ کا ہے۔ اس اجمال کا مختصر بیان یہ ہے کہ عیسائی آدم وحوا علیہما السلام اور ان کی نسل کے فرد کو گناہ گار مانتے ہیں۔ یہاں تک کہ نبیوں اور رسولوں کے بارے میں بھی ان کا اعتقاد ہے کہ کوئی نبی اور رسول گناہ سے پاک نہیں۔ لوط علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام اور بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام پر انہوں نے بدترین گناہوں کا الزام لگایا۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ گناہ کی ابتدا عورت سے ہوئی کیونکہ جنت میں خدا کے حکم کی خلاف ورزی کا پہلا گناہ حوا نے کیا۔ پھر آدم کو اس درخت سے کھانے کی ترغیب دی جس کے قریب جانے سے اللہ تعالیٰ نے انہیں روکا تھا۔ جب نسل آدم گناہ گار ٹھہری تو اب نسل انسانی کو گناہ سے نجات دلانے کے لئے ایک ایسی ہستی ہونی چاہئے کہ جو خود گنہگار نہ ہو اور ایسا شخص جو گناہوں سے پاک ہو سوائے مسیح کے دوسرا نہیں ہو سکتا کیونکہ سب آدم وحوا کے بیٹے ہیں۔ صرف مسیح علیہ السلام ابن اللہ ہیں جو خدا کا بیٹا ہونے کی وجہ سے گناہ اور معصیت سے پاک ہیں۔

عدل اور رحم

☆ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے مسیح سے کہا کہ میں عادل بھی ہوں اور رحیم بھی، عدل چاہتا کہ گناہگاروں کو سزا دوں اور رحم کا تقاضا ہے کہ انہیں معاف کردوں لیکن سزا دیتا ہوں تو میرا رحم جاتا ہے اور معاف کرتا ہوں تو عدل باقی نہیں رہتا۔ اب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اے پیارے بیٹے مسیح! گناہ گاروں کے گناہوں کا بوجھ تیرے سر پر رکھ کر صرف تجھ ہی کو سزا دے دوں۔ تو صلیب پر چڑھ جا اور تین دن تک (معاذ اللہ) لعنت کی موت مردہ رہ کر گناہ گاروں کے گناہوں کا کفارہ کردے تا کہ میری صفت عدل ورحم دونوں قائم رہیں اور بنی نوع انسان کی نجات بھی ہو جائے۔

اسلام اور کفارہ

☆ اسلام نے اس نظریہ کو بھی مردود قرار دیا اور جس طرح تثلیث کے مقابلہ میں توحید کی ٹھوس حقیقت پیش کی تھی اسی طرح یہاں بھی کفارہ کے مقابلہ میں جزا وسزا کا ناقابل تردید نظریہ پیش فرمایا اور قرآن کریم میں واضح اعلان کردیا کہ "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" کوئی شخص کسی کا بار قطعاً نہیں اٹھائے گا۔ یہ کیسی نامعقول بات ہے کہ گناہ گار گناہ کرے اور بے گناہ کو سزا دی جائے۔ رہا یہ امر کہ آدم وحوا اور ان کی پوری نسل گناہ گار ہے تو قرآن نے جابجا اس کی بھی تردید فرمائی جس طرح ایک کے گناہ کی سزا دوسرے کو دینا سراسر ظلم ہے اسی طرح ماں باپ کا گناہ وراثت کے طور پر اولاد میں منتقل ہونا بھی باطل اور نامعقول ہے۔ اسلام نے رسول وانبیاء علیہم السلام کو قرآن مجید میں عبادِ صالحین اور عبادِ مخلصین قرار دیا۔ عیسائیوں نے آیاتِ قرآنیہ سے انبیاء علیہم السلام کا گناہ گار ہونا ثابت کرنے کی سعیٔ ناتمام کی ہے۔ وہ آیات ہرگز اس دعویٰ کی دلیل نہیں بلکہ عیسائیوں کی کج فہمی ہے کہ انہوں نے بغیر سوچے سمجھے آیاتِ

قرآنیہ کو ایک صریح بطلان دعوے کے ثبوت میں پیش کر دیا۔ ان شاء اللہ دوسرے موقع پر ان آیات کی مکمل تشریح کی جائے گی۔

سزا رحم کے اور معافی عدل کے منافی نہیں

☆ رہا یہ امر کہ سزا رحم کے خلاف ہے اور معاف کرنا عدل کے منافی ہے تو یہ بھی نادانی و جہالت پر مبنی ہے۔ رحم سے عدل کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ ظلم سے عدل کا دامن داغدار ہوتا ہے پھر یہ کہ عدل کو رحم کے منافی قرار دے کر بھی عیسائیت کو سہارا نہیں ملتا کیونکہ جب سزا دینا رحم کے خلاف ہے تو دوسروں کے گناہوں کی سزا مسیح علیہ السلام کو دینا بھی رحم کے خلاف ہوگا بلکہ یہاں تو یہ خلاف اور زیادہ قوی ہو جائے گا کیونکہ جب گناہ گار کو سزا دینا رحم کے خلاف ہے تو بے گناہ کو سزا دینا سراسر ظلم ہوگا پھر سمجھ میں نہیں آتا عیسائی بے گناہ مسیح علیہ السلام کو سزا دینے کا اعتقاد کیوں رکھتے ہیں؟

کفارہ صرف عیسائیوں کا ہوا یا تمام بنی آدم کا

☆ اس کے علاوہ میں دریافت کروں گا کہ مسیح کا مصلوب ہو کر (معاذ اللہ) لعنت کی موت مرنا تمام بنی آدم کا کفارہ کہو تو سب کی نجات ہو گی۔ اب عیسائیت قبول کرنے کی کیا ضرورت رہی۔ کوئی مسیحی ہو یا یہودی، مجوسی ہو یا مسلمان، جب تمام بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا تو مسیحیت بالکل بے معنی اور غیر ضروری ہو گئی۔ آپ بلاوجہ کروڑوں روپیہ صرف کر کے عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں اور اس دردِ سر میں مبتلا ہیں اور اگر صرف عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ہوا تو غیروں کے گناہوں کا کیا ہوگا۔ سزا ملے گی یا معافی؟ جس کو بھی اختیار کرو گے وہی اعتراض وارد ہوگا کہ سزا کی صورت میں رحم نہ رہے گا اور معافی کی صورت میں عدل کا خاتمہ ہو جائے گا اور حسب سابق دوبارہ کفارہ کے لئے یسوع مسیح کے بعد خدا کے دوسرے بیٹے کی ضرورت ہوگی پھر اس کفارہ پر بھی یہی اشکال وارد ہوگا جسکو حل کرنے کے لئے تیسرے کفارہ کا قول کرنا پڑے گا اور اس طرح نہ کفارے ختم ہوں گے نہ خدا کے بیٹے۔ ایسی صورت میں تمام بنی نوع انسان کے لئے یسوع مسیح کا نجات دہندہ ہونا باطل قرار پائے گا اور عیسائیت بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

کفارہ کا نظریہ انتہائی خطرناک ہے

☆ کفارہ کا نظریہ بجائے خود مضحکہ خیز ہونے کے علاوہ بنی نوع انسان کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔ اس لئے کہ کفارہ پر ایمان لانے کے بعد انسان خواہ کتنے ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرے اس کے دل میں سزا یابی کا تصور نہیں آ سکتا کیونکہ اس قسم کا تصور کفارہ پر ایمان لانے کے قطعاً منافی ہے۔ جب گناہوں اور جرائم کی سزا کا تصور بھی جرم و گناہ قرار پایا تو بنی نوع انسان کا کسی قسم کے جرم و گناہ سے محفوظ رہنا ممکن نہیں رہا بلکہ دنیا کا کوئی گناہ اس صورت میں گناہ نہیں رہتا کیونکہ گناہ وہی کام ہو سکتا ہے جس پر کوئی سزا ہو سکے۔ جب سزا کا تصور نہ رہا تو گناہ اور معصیت کا وجود ہی ختم ہو گیا۔ چلو چھٹی ملی، نہ قتل و غارت پر کوئی پکڑ رہی، نہ ظلم و جور پر کوئی گرفت، زنا، چوری، حرام خوری سب کچھ کیے جایئے۔ کسی کو پوچھنے کا حق نہیں کہ تو نے یہ کام کیوں کیا؟

☆ اس اعتقاد کے بعد عیسائیوں کا اپنی حدود مملکت میں جرائم کیلئے سزاؤں کے قوانین وضع کرنا عیسائیت کیساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

قرآن کا توراۃ و انجیل کی تصدیق کرنا موجوہ توراۃ و انجیل

کے غیر محرف ہونے کی دلیل نہیں

☆ اسلام جس طرح انبیاء سابقین علیہم السلام کی عزت وعظمت کا ضامن ہے اسی طرح کتب سماویہ کا بھی مصدق ہے اور توراۃ و انجیل کا نام لے کر قرآن نے ان کی تصدیق کی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہود ونصاریٰ کی تحریفات بھی اس تصدیق کے ماتحت ہیں کیونکہ قرآن کریم نے اہل کتاب کی تحریفات کا واشگاف الفاظ میں اعلان کیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے "یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ" دوسری جگہ فرمایا "وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" اس کے علاوہ دیگر آیاتِ قرآنیہ میں بھی یہ مضمون وارد ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی اس تحریف کے سامنے جب توراۃ وانجیل کی قرآنی تصدیق کو رکھا جائے تو صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے اصل توراۃ وانجیل کی تصدیق کی ہے۔ یہود ونصاریٰ کی تحریفات کی ہرگز تصدیق نہیں کی۔ البتہ ان کی تحریفات کے واقعی تحریفات ہونے پر ضرور مہرِ تصدیق ثبت فرمائی ہے۔

حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کا جزو نہیں بلکہ نور ذات کا جلوہ ہیں

☆ آخر میں یہ مسئلہ بھی صاف کر دوں کہ حضور ﷺ کو خدا کے نور سے مخلوق ماننے کا یہ مطلب نہیں کہ (معاذ اللہ) حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کا جزو ہیں بلکہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے نورِ ذات کا جلوہ ہیں بلا تشبیہ جس طرح آئینہ میں سورج کی روشنی اس کے انوار کا جزو نہیں ہوتی بلکہ ایک تجلی ہوتی ہے اسی طرح نبی کریم ﷺ نورِ ذات کی تجلی اور اس کا جلوہ ہیں۔ حضور ﷺ نے خود فرمایا "انا مراۃ جمال الحق" میں اللہ تعالیٰ کے جمال کا آئینہ ہوں۔ البتہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اقانیم ثلاثہ میں سے ایک اقنوم مانتے ہیں اور "اب وابن وروح القدس" تینوں کو اجزاء قرار دے کر ان کے مجموعہ کو خدا کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ خدائے قدوس کے لئے اس کے نورِ ذات کا جلوہ ماننا اسلام ہے اور اس کے لئے جز ثابت کرنا عیسائیت ہے۔

اسلام اور اشتراکیت

☆ کوئی ذی شعور انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا کا اقتصادی اور معاشی نظام دولت کے جائز حصول اور اس کی صحیح تقسیم پر موقوف ہے۔ موقوف علیہ کا فقدان موقوف کے بطلان کا موجب ہوتا ہے۔

☆ اس دورِ پر آشوب میں اقتصادی اور معاشی نظام کی خرابیوں کی وجہ صرف یہ ہے کہ نہ دولت کا حصول جائز طریقہ سے ہو رہا ہے نہ اس کی تقسیم صحیح طور پر کی جا رہی ہے

☆ افراط وتفریط کا بازار گرم ہے کہیں سرمایہ پرستی اور جاگیرداری کا تسلط ہے کہیں اشتراکیت اور کمیونزم کا دور دورہ۔

☆ جب یورپ کی چالاک وعیار بلکہ ظالم وسفاک سرمایہ پرست قوموں نے دولت کو امیروں میں محدود کر دیا اور دنیا کے کمزور انسانوں کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر ظالمانہ قوت کے ساتھ ان کی آواز کو دبا دیا ان کے احساسات وجذبات کو کچل دیا اور کھٹملوں

کی طرح ان کا خون چوس کر ان کی دولت بٹوری تو ان مظلوموں کے دل میں ٹھیس لگی۔ ان کے جلے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے حلق سے آہ نکلی مگر غربت و مظلومیت کے مارے ہوئے انسانوں کی آواز میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ وہ سرمایہ پرستی کے بنائے ہوئے جیل خانے کی مضبوط آہنی دیواروں سے باہر جا سکتی۔ وہ اٹھی اور اٹھتے ہوئے کمر شکستہ مزدور کی طرح گر پڑی اور سرمایہ پرستی کے بھیڑیئے ان مظلوم بھیڑوں کے حق سے بدستور اپنا منہ رنگتے رہے۔

☆ جب مظلوم غریب کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو غیرت الہیہ جوش میں آئی اور اس نے کمیونزم کا عذاب نازل کر دیا جو کہ سانپوں کے پھن کچلتا ہوا اور ناجائز جاگیرداری کے بھیڑیوں کے بڑے بڑے پیٹوں کو پھاڑتا ہوا آندھی کی طرح چلا آ رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ غریبوں کا خون پینے والے اس ظالم و سفاک گروہ کا ایک ایک فرد اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔ خوب یاد رکھئے کمیونزم عذابِ الٰہی ہے اور عذاب ارتکاب جرائم کا ہی نتیجہ ہوتا ہے (وہ جرائم کیا ہیں؟)

سرمایہ پرستی اور جاگیرداری کا ناجائز نظام

☆ جس چیز کی بنیاد ہی غلط ہو گی اس کا انجام کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ پرستی کی بنیاد دولت کا ناجائز حصول ہے۔ جب حصول دولت ہی غلط ہے تو اس کی تقسیم کیونکر صحیح ہو سکتی ہے جو قوم سرمایہ پرستی کے ذریعہ کمیونزم کی روک تھام کرنا چاہتی ہے وہ سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ اس کو یہ معلوم نہیں کہ کمیونزم کا مرض سرمایہ پرستی سے پیدا ہوا ہے۔

☆ سرمایہ پرستوں نے جب ناجائز اور ظالمانہ طریقوں سے عوام غرباء کا خون چوسا اور مزدوروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے اپنی تجوریاں بھریں غریب مزدور کو اپنا خون اور پسینہ ایک کر دینے کے باوجود بھی تن کے لئے کپڑا اور پیٹ کے لئے ٹکڑا نصیب نہ ہوا ان کے بچے سوکھی روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو ترستے رہے۔ فاقوں نے انہیں مردہ بنا دیا اور اس کو محنت و مزدوری کا صلہ اس حالت میں ملتا ہے کہ وہ بیمار پڑ جائے تو دوا نہیں، مر جائے تو کفن نہیں اور مرنے کے بعد اس کے اہل و عیال بھیک مانگ کر گزارا کریں۔ بچوں کی تعلیم کا انتظام نہیں اور ان بے رحم سرمایہ پرستوں اور جاگیرداروں کو کبھی یہ خیال نہ آیا کہ جن مزدوروں، مزارعوں اور ملازموں کی قوت بازو کے ذریعہ سے کمائی ہوئی دولت سے ہمارے خزانے بھرپور ہیں جن کی تکلیفیں ہمارے عیش و آرام کا موجب ہیں جن کے کمزور جسم ہمارے بے پناہ موٹاپے کا سبب ہیں جن کا خون پی کر ہم اس قدر موٹے ہو گئے ہیں کہ زمین ہمارے بوجھ سے پناہ مانگتی ہے۔

☆ ان غریبوں کو بھی ان کی حاصل کردہ دولت میں سے زیادہ نہیں تو اتنا ہی دے دیں جس سے ان کے تن پیٹ کا گزارہ ہو جائے اور ان کے فاقوں کے مارے ہوئے بچوں کی قوت لایموت ہو سکے۔

☆ اس سنگ دل طبقے نے یہ جانتے ہوئے کہ ہماری دولت و عزت، راحت و فرحت سب کچھ ان غریبوں کا صدقہ ہے، کبھی ان کے حال پر رحم نہ کیا بلکہ ہمیشہ ان کو پامال کرنے اور کچلنے کی کوشش کی اور ان کی کمائی ہوئی دولت پر سرمایہ کا سانپ بنے بیٹھے رہے تو اس کا نتیجہ اور ردِ عمل لازمی طور پر یہی ہو سکتا تھا کہ مظلوم اور غریب مزدور کے دل میں اس خونخوار طبقہ کے خلاف ایک خوفناک جذبہ انتقام پیدا

ہوا اور وہ سرمایہ پرستی کے خلاف ایک زبردست محاذ جنگ قائم کردے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اس جذبۂ انتقام نے مظلوم اور غریب مزدور کے دل ودماغ کو اس درجہ متاثر اور ماؤف کردیا کہ وہ بے چارہ عقل وخرد سے بیگانہ ہوکر جادۂ اعتدال سے دور جاپڑا اور جوشِ انتقام میں ایسا مغلوب الغضب ہوا کہ دوست دشمن کی تمیز کئے بغیر اس نے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کردیا۔

☆ ملکیت اور سرمایہ کاری کا تصور اس کے لئے ہوا بن گیا اور ناجائز جاگیرداری اور سرمایہ پرستی کی عداوت نے اسے جائز ملکیت اور جاگیرداری کی مخالفت پر بھی مجبور کردیا اور وہ اپنے جذبات کی رو میں ایسا بہا کہ اس نے اسلام کے خوب صورت اور حسین اقتصادی و معاشرتی نظام کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ اسلامی نظام کے حسین چہرہ کے نورانی خدوخال اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور وہ راہِ صواب سے بھٹک گیا اور اس نے اپنی آنکھوں پر عناد کی پٹی باندھ کر تعلیمات ربانی اور وحی آسمانی کے خلاف ایک نئی تحریک کی بنیاد رکھ دی جس کا نام اشتراکیت ہے اب آپ ہی بتایئے کہ جو اشتراکیت سرمایہ داری سے پیدا ہوئی ہے وہ سرمایہ پرستی کو فروغ دینے سے کیونکر رک سکتی ہے۔

اشتراکیت کیا ھے؟

☆ اشتراکیت اس تحریک کا نام ہے جو شخصی اور انفرادی ملکیت کو مٹا کر حصول دولت کے تمام اسباب وذرائع اور لوگوں کی اجتماعی جدوجہد سے حاصل شدہ دولت کی تقسیم کو حکومت کے حوالے کردینا چاہتی ہے تاکہ مجموعی دولت تمام افراد پر عدل وانصاف کے ساتھ تقسیم ہوسکے۔

☆ اشتراکیت معاشی اونچ نیچ اور طبقاتی امتیازات، امیر وغریب کے تفاوت کی سخت دشمن ہے وہ ایک ایسی جماعت کو برسر اقتدار لانے کی حامی ہے جس میں طبقوں کا کوئی وجود نہ ہو اس لئے کہ اشتراکی نظریہ کے مطابق طبقاتی امتیاز دنیا میں ظلم اور خون ریزی کا سنگ بنیاد ہے۔

☆ جہاں تک اصل مقصد کا تعلق ہے قریب قریب تمام اشتراکی متفق ہیں لیکن حصول مقصد کے طریق کار میں انکے مابین شدید اختلاف پائے جاتے ہیں بعض اشتراکیوں کی رائے یہ ہے کہ آہستہ آہستہ اصلاح کیجائے۔ جسکی صورت یہ ہے کہ موجودہ جمہوری حکومتوں کو برقرار رکھتے ہوئے اشتراکیت کے حامیوں کو ان پر قبضہ کرلینا چاہئے اور اپنے اقتدار کو کام میں لاکر تدریجی طور پر اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ شخصی ملکیت محدود ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوجائے تاکہ مجموعی دولت افراد ملک پر مساویانہ طریقہ سے تقسیم ہوسکے۔

☆ جب تک طبقاتی امتیاز اور معاشی تفاوت باقی رہے اس وقت تک حکومت کا برقرار رہنا بھی ضروری ہے اور جب تک اشتراکیت کا پورا پورا تسلط ہوجائے اور امتیاز وتفاوت مذکور کا نام ونشان باقی نہ رہے تو پھر حکومت کی بھی ضرورت نہیں بلکہ ایسی صورت میں نظام حکومت خود بخود ختم ہوجائے گا۔ اس نظریہ کو ارتقائی اشتراکیت کہا جاتا ہے۔

☆ اس کے مقابلے میں بعض اشتراکیوں کی رائے یہ ہے کہ موجودہ جمہوری طریقوں میں سے کسی حکومت کو برقرار رکھنا حصول

مقصد کے لئے نہایت مضر بلکہ اصل مقصد کے منافی ہے۔ اس لئے تمام موجود جمہوری نظاموں کو مٹانا ضروری ہے۔ اس کے بغیر اشتراکیت کا غلبہ وتسلط کسی طرح نہیں ہوسکتا۔ اس نظریہ کا نام انقلابی اشتراکیت یا کمیونزم ہے۔

☆ کمیونزم کے حامی کمیونسٹ کہلاتے ہیں کمیونسٹ حصول مقصد میں تدریج یا آہستگی کے قائل نہیں۔ یہ لوگ جمہوری نظام کے بیخ و بن اکھاڑ کر اس کا نام ونشان تک مٹا دینا چاہتے ہیں۔ سرمایہ پرستی اور اشتراکیت دونوں کا منتہائے نظر اصولی طور پر مادی وجسمانی خوشحالی اور لذت پرستی کے سوا کچھ اور نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سرمایہ پرستوں کا طبقہ ایک مخصوص گروہ کے عیش وآرام کا متمنی ہے اور اشتراکی جماعت طبقاتی پابندیوں سے بالاتر ہو کر بلا امتیاز ہر فرد کے لئے راحت وآرام حاصل کرنے کی مدعی ہے۔ اسی وجہ سے امیروں اور جاگیرداروں کے ماسوا تمام لوگ سرمایہ پرستی کے نظام کو انتہائی نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں (اور عام طور پر اشتراکی نظام کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے)

☆ اشتراکی نظام کی مقبولیت عامہ سے متاثر ہو کر بعض کم فہم اور ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے بھی اشتراکیت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور انہوں نے اسلام کو اشتراکیت کے سانچے میں ڈھالنے کی ناپاک کوشش کی۔

☆ انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور اس بات پر صرف کر دیا کہ قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں شخصی وانفرادی ملکیت کو ناجائز ثابت کیا جائے اور اسی طرح اسلام اشتراکیت میں تبدیل ہو کر رہ جائے۔ حالانکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اسلام اور اشتراکیت کا اتحاد کسی نقطہ پر نہیں ہوسکتا۔ اشتراکیت کا سنگ بنیاد مادہ پرستی اور شکم پروری ہے۔ اشتراکیوں کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں جس قدر ادیان وملل اور مذاہب پائے جاتے ہیں وہ معاشی نظام کی خرابی اور طبقہ واریت کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

☆ اشتراکیت کا منتہائے مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا میں کوئی بھوکا نہ رہے اور تمام لوگوں کی جسمانی ضرورتیں برابری کے ساتھ پوری ہوتی رہیں اور اس راہ میں جتنی رکاوٹیں ہیں ان سب کو ختم کر دیا جائے۔ اشتراکیت کی نظر میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہب اور طبقہ واریت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طریقہ نکاح وازدواج بھی اشتراکی نقطۂ نگاہ کے بالکل خلاف ہے۔ اشتراکیوں کے نزدیک انسانی ضرورت کی ہر چیز تمام انسانوں میں برابر مشترک ہے۔ اسلئے وہ تمام دنیا کی عورتوں کو تمام دنیا کے مردوں کے لئے مشترک سمجھتے ہیں۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اشتراکیت کی نظر میں اس عالم مادیات کے علاوہ کچھ نہیں اور مقدس اسلام کا بنیادی نقطہ اس عالم رنگ و بو سے بہت دور ایمان بالغیب ہے تو پھر اشتراکیت کو اسلام کیساتھ کسطرح مخلوط کیا جاسکتا ہے اور ان دونوں کی صلح کیونکر ہوسکتی ہے؟

اشتراکیت کے بنیادی اصول پر تنقید

☆ ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے کہ اشتراکیت کا بنیادی اصول طبقاتی امتیاز کو مٹانا ہے لیکن عقل سلیم کی روشنی میں یہ اصول قانونِ فطرت کے خلاف اور ناممکن الحصول ہے۔

☆ ہم نے مانا کہ اشتراکی دنیا میں مال ودولت کے لحاظ سے تمام انسانوں کو برابر کر دیں گے لیکن طبعی اور فطری امتیازات تو وہ کسی طرح

نہیں اٹھا سکتے مثلاً ایک شخص عالم ہے دوسرا جاہل، ایک عقل مند ہے دوسرا بے وقوف، ایک پاکیزہ اخلاق سے متصف ہے تو دوسرا بد خلق۔

☆ اسی طرح فنی کارکردگی کے لحاظ سے انسانوں میں نمایاں طور پر امتیاز و تفاوت پایا جاتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس انسانوں کے محرکات طبعی بداہتہً مختلف ہیں۔

☆ ایسی صورت میں کیا یہ امر یقینی نہیں کہ جو لوگ ایک قسم کی صفات کے حامل ہوں وہ تقاضائے فطرت رفتہ رفتہ ایک طبقہ کی صورت اختیار کر لیں اور اسی طرح طبقاتی امتیازات قائم ہو جائیں۔ اس لئے اشتراکی اصول کے غلط ہونے میں ادنیٰ تردد باقی نہیں رہتا۔

☆ حیات انسانی کا مقصد شکم پروری قرار دینا انسانیت کو حیوانیت میں تبدیل کر دینا نہیں تو اور کیا ہے؟

اشتراکیت کے مقابلہ میں اسلامی نظریہ

☆ اب آیئے اس کے بالمقابل مقدس اسلام کے نظریہ کو ملاحظہ فرمایئے جو فطرت انسانی کے عین مطابق اور عقل سلیم کے نزدیک ہر اعتبار سے قابل تسلیم ہے۔ اسلام نے طبقاتی امتیاز کو برقرار رکھتے ہوئے ایسے اصول تعلیم فرمائے جن کی بنا پر کوئی طبقہ حد اعتدال سے آگے نہ بڑھ سکے اور کسی قسم کا ناخوشگوار تصادم پیدا نہ ہونے پائے جو امن عامہ میں خلل انداز ہو۔ ارشاد فرمایا

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ۔ (نحل : ۷۱)

ترجمہ☆ اللہ تعالیٰ نے تمہارے بعض کو بعض پر رزق میں فوقیت دی۔

☆ یہ ایک طبقاتی امتیاز ہے اس کے لئے ایک قانون مقرر فرمایا کہ

وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (بقرة : ۱۸۳)

ترجمہ☆ تم اپنے مال کو آپس میں باطل کے ساتھ نہ کھاؤ۔

اسلام میں شخصی ملکیت

☆ مقدس اسلام نے انسانی عظمت واہلیت کے ماتحت شخصی ملکیت کو برقرار رکھا کیونکہ اس کے بغیر کوئی شخص دولت کے لئے اپنے قوائے فکریہ اور عملیہ سے آزادی کے ساتھ پوری طرح کام نہیں لے سکتا۔

☆ ایسی صورت میں انسان کی علمی اور عملی قوتیں ضائع ہو جاتی ہیں اور اشرف المخلوقات کا علم و عمل کی قوتوں سے بالکل خالی ہو جانا حکمت تخلیق کے منافی تھی۔ اس لئے اسلام نے شخصی ملکیت کے قوانین مقرر فرما دیئے اور صنعت و حرفت، تجارت و زراعت وغیرہ کے لئے ایسے مکمل قوانین تعلیم فرمائے جس طرح حصول دولت کے لئے تعلیم فرمائے تھے۔ اہل دولت کو مال خرچ کرنے میں ان قوانین کا پوری طرح پابند کر دیا کیونکہ مالداروں کی مطلق العنانی اقتصادی اور معاشرتی نظام کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔

☆ رزق کی کمی بیشی کی بنا پر طبقاتی امتیاز اور ذاتی ملکیت جن آیات سے ثابت ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہیں

(۱) وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ۔ (نحل : ۷۱)

اور اللہ نے بڑائی دی تم میں ایک کو ایک پر روزی میں

(۲) وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ (النساء : ۳۲)

اور ہوس مت کرو جس میں بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر

(۳) اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا۔ (بنی اسرائیل : ۲۱)

دیکھو تو سہی ہم نے دنیا میں بعض کو بعض پر کیسی برتری دی ہے اور البتہ آخرت کے درجات کہیں بڑھ کر ہیں اور اس طرح ان کی برتری بھی کہیں بڑھ کر ہے۔

(۴) اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ۔ (رعد : ۲۶)

اللہ جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے

(۵) يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (شوریٰ : ۱۲)

(اللہ تعالیٰ) جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے نپی تلی کر دیتا ہے۔ وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

(۶) قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ۔ (سبا: ۳۹)

(اے حبیب ﷺ!) فرما دیجئے میرا پروردگار اپنے بندوں میں جس کو روزی دینا چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نپی تلی کر دیتا ہے۔

☆ روزی کی کمی بیشی کے لحاظ سے طبقاتی امتیاز اور انفرادی ملکیت بالکل واضح ہے کیونکہ قومی ملکیت اور اشتراک کی صورت میں کمی بیشی متصور نہیں۔ ان کے علاوہ آیات میراث بھی طبقاتی تفاوت اور شخصی ملکیت پر روشن دلیلیں ہیں کیونکہ اشتراکیت اور قومی ملکیت میں میراث کا تصور بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

☆ اب وہ آیات ملاحظہ فرمایئے جن سے انفرادی ملکیت ثابت ہونے کے علاوہ ان اصول وقوانین پر بھی پوری روشنی پڑتی ہے جن کی پابندی سے وہ تمام خرابیاں کلیۃً دور ہو سکتی ہیں جن کا شخصی ملکیت اور طبقاتی امتیاز کی وجہ سے پیدا ہونا ممکن ہے۔

☆ ارشاد ہوتا ہے

(۷) وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ (بقرہ: ۸۳)

اور ماں باپ کے ساتھ سلوک کرتے رہنا اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ۔

☆ اگر صاحب دولت اپنے والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں کے حق میں اس قانونِ الٰہی پر عمل کرے اور ان کے ساتھ احسان وصلہ رحمی کرتا رہے تو طبقاتی کش مکش اور معاشی نظام میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہونے پائے۔

(۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (بقرہ : ۲۵۴)

اے ایمان والو! ہمارے دیئے ہوئے رزق میں (نیک راہ میں) خرچ کرو مگر اس دن سے پہلے جس میں نہ خرید وفروخت ہوگی، نہ دوستی، نہ سفارش اور جو لوگ (راہِ خدا میں خرچ نہ کریں) ناشکری کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔

(۹) لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ. (آل عمران : ۹۲)

لوگو! جب راہِ خدا میں ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو گے جو تمہیں پیاری ہیں نیکی کے درجہ کو ہرگز نہ پہنچ سکو گے اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

(۱۰) وَالَّذِیْنَ فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ. (معارج : ۲۴۔ ۲۵)

اور جو وہ لوگ (فلاح کے مستحق ہیں) جن کے مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں دونوں کا حصہ مقرر ہے۔

اسلام نے دولت کو ایک جگہ محدود ہونے سے بچایا ہے۔ اسی لئے میراث کا قانون جاری کیا۔ نیز ارشاد فرمایا

(۱۱) مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَایَکُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ. (الحشر : ۷)

جو کچھ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو بستیوں والوں سے بطور فے عطا فرمادے تو وہ اللہ کے لئے ہے اور رسول کے لئے اور رسول کے رشتہ داروں کے لئے یتیموں محتاجوں اور مسافروں کے لئے تاکہ وہ صرف دولت مندوں کے درمیان گردش نہ کریں۔ نیز ارشاد فرمایا

(۱۲) وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ. (التوبہ : ۳۴)

اور وہ لوگ جو جمع کرتے ہیں سونا چاندی اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں سخت عذاب کی خوشخبری سنادو۔

☆ دولت سے بے شمار قسم کی برائیاں اور مصیبتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دولت کو صرف کرنے کے لئے پاکیزہ اصول تعلیم فرمائے۔ بھلائی اور نیکی کے کاموں میں صرف دولت کو منحصر فرما کر فضول خرچی اور بے راہروی سے روکا۔ ارشاد فرمایا

(۱۳) وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ. (بنی اسرائیل : ۲۶۔ ۲۷)

اور رشتہ دار، غریب اور مسافر (ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو فضول خرچی نہ کرو اور فضول خرچی کرنیوالے شیاطین کے بھائی ہیں۔

☆ دوسری جگہ وضاحت سے فرمایا

(۱۴) اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ. (نحل : ۹۰)

بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے انصاف اور احسان کا اور ضرورت مند قرابت داروں کی امداد و اعانت کا اور تمہیں بے حیائی اور کاموں اور سرکشی سے روکتا ہے۔

☆ اسلام نے دولت مندوں کے لئے زکوٰۃ کا قانون اسی حکمت کے لئے مقرر فرمایا ہے کہ غرباء و مساکین جو اپنی ضروریات کو پورا

کر کے ذرائع و وسائل سے محروم ہیں مبتلائے تکلیف نہ رہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا

(۱۵) اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاکِیْنِ وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغَارِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ۔ (توبہ : ۶۰)

خیرات کا مال تو بس فقیروں کا حق ہے اور محتاجوں کا ان کارکنوں کا جو مال خیرات کے وصول کرنے پر متعین ہیں اور ان لوگوں کا جن کے دلوں کو اسلام کی طرف راغب کرنا منظور ہے اور قید غلامی سے غلاموں کی گردنیں آزاد کرانے میں اور قرض داروں کے قرض میں اور خدا کی راہ یعنی مجاہدین کے ساز و سامان میں اور مسافروں کے زادِ راہ میں۔ یہ حقوق اللہ کے مقرر کیے ہوئے ہیں اور اللہ بہت علم و حکمت والا ہے۔

☆ قرآن کریم کی ان تصریحات سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ اسلام ایسی سرمایہ پرستی سے بھی دور ہے جس میں دولت ایک جگہ محدود ہو کر رہ جائے اور دولت مندوں کے سوا کوئی اس سے مستفید نہ ہو سکے اور اشتراکیت سے بھی اسلام کا کوئی تعلق نہیں جو انسان کی کمائی ہوئی دولت سے اس کا جائز حق بھی سلب کرتی ہے بلکہ اسلام اس اعتدال کا حامی ہے جو سرمایہ پرستی اور اشتراکیت کے بین بین ہے۔ مقدس اسلام ہر معاملہ میں افراط و تفریط سے بچا کر میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے موجودہ دور میں سرمایہ پرستی اور اشتراکیت کا تصادم دنیا کو ہلاکت کی طرف تیزی سے لئے جا رہا ہے۔ ہلاکت سے بچنے اور نجات و فلاح دارین حاصل کرنے کا واحد ذریعہ مقدس اسلام اور اس کا معاشی نظام ہے۔

سائنس و مذہب

آفتاب بخت مشرق آہ مغرب میں چھپا
صبح مشرق، شام مغرب سے مبدل ہو گئی

☆ سائنس کی عبرتناک ترقی کے کارنامے اہل علم حضرات سے مخفی نہیں۔ عصر جدید میں اس کی ترقی بظاہر محیر العقول سہی لیکن فلسفہ قدیمہ کے حالات کا مطالعہ اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ زمانے کا ہر نیا دور اپنی انقلابی کیفیات میں جب گونا گوں جدتیں اور بوقلموں اسباب انکشاف و ذرائع معلومات لے کر آتا ہے تو ہر لاحق دور سابق سے منازل ارتقا میں بلند و بالا ہوتا ہے جس کی نظیر میں جنس نباتاتی و حیوانی اور نوعِ انسانی کے افراد موجود ہیں۔ ایک چھوٹے سے پودے کو دیکھ لیجئے کہ وہ اپنے ابتدائی دور میں وصف نباتیت تو رکھتا ہے لیکن اوصاف شجریت کے ظہور تام سے معرا ہے، کمزور تنے اور چند نرم و نازک پتیوں کے سوا ابھی تک کسی

اور چیز سے وابستہ نہیں۔ اس کے بعد رفتارِ زمانہ ہی سرعت کے ساتھ اس کو ضعف سے قوت اور نرمی سے سختی کی طرف لے جاتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے کمالات شجریت کو پوری طرح حاصل کر لیتا ہے۔ یہی حال ہر جاندار اور تمام انسانوں کا ہے بلکہ کائنات کی تمام انقلابی کیفیات اور عالم کے تغیرات اسی نہج پر ہیں۔

☆ ماہرین تاریخ پر یہ امر بخوبی واضح ہے کہ انسانی زندگی کا معیار ابتداء کیا تھا اور نسلاً بعد نسل اس میں کس کس طرح تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں، موجودہ زمانے میں اس کی تہذیب وتمدن اور معاشرت کا جو معیار ہے کیا ابتدائً بھی وہی تھا؟ اصول سلطنت اور آئین حکمرانی جس طریق پر آج یا آج سے چند صدیوں پہلے ہمارے پیش نظر ہے ابتدائے دورِ انسانی میں اسی طرح تھا یا اس سے کچھ مختلف۔ ضروریاتِ انسانیہ لباس وطعام، صنعت وحرفت وغیرہ کا اقتضاء کس نوعیت پر تھا؟ کیا موجودہ اور ابتدائی حالات کو یکساں قرار دیا جا سکتا ہے؟ اوائل عہد انسانی میں علوم وفنون کا معیار کیا تھا اور اب کیا ہے؟

☆ واقعات کی روشنی میں اس امر کا تسلیم کرنا ضروری ہے کہ قدرت رفتارِ زمانہ کے ساتھ فطرتِ انسانیہ کے بالقوۃ کمالات کو بالفعل کرتی اور منظر شہود ومعرضِ ظہور پر لاتی رہتی ہے چونکہ اقوام عالم کے افراد اپنے تسلسل میں جنسی اور نوعی لگاؤ کی بنا پر بہت ہی گہرا تعلق رکھتے ہیں اس لئے جوہر مشترک کا قوت سے فعل میں آ جانا (جس کا ظہور نسل لاحق میں ہے) بعید از قیاس نہیں۔ انقلابِ زمانہ اس امر کا مقتضی ہے!

☆ ہاں، رفتارِ زمانہ جس طرح بعض بالقوۃ اشیاء کو بالفعل کرتی ہے اسی طرح اس کی بادِ سموم کے جھونکے درخت کی ٹہنیوں اور انسان وحیوان کے اعضاء کو بھی مضمحل اور بے کار کر دیتے ہیں اور درختوں کی قوت نباتی، حیوانوں کی قوت حیوانی اور انسانوں کی صفت انسانیت کا خاتمہ کر ڈالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ ماسبق میں بہت سے ایسے علوم وفنون جاری ہوئے جن کو رفتارِ زمانہ کی ناہمواریوں نے پامال کر ڈالا اور ان موجدان باکمال کو اس جہانِ فانی سے روپوش کر دیا۔

☆ ان حالات میں سائنس جدید کا مجیر العقول ہونا کسی طرح قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں سائنس جدید کو برا سمجھتا ہوں بلکہ اس سلسلہ میں میرے نزدیک جو چیز قابل اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ سائنس جدید کے پرستاروں نے سائنس کو جو مرتبہ دے رکھا ہے وہ سائنس دانی کا کچھ اچھا مظاہرہ نہیں کر رہا۔ مثلاً قدیم اہل مذاہب نے اپنے مذہبیات اور معتقدات کو اس کی قربان گاہ پر قربان کر دیا اور اپنے خرمن ایمانیات کو سائنس کی آگ میں جلا کر خاکستر کر ڈالا یعنی سائنس کے اصول مخترعہ کے مطابق جو چیز غلط سمجھ لی گئی اس کو کسی طرح صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ خواہ الہام ربانی ہی اس کی صحت پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہو جس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی خلقی کمزوری کے باعث ہر اس چیز کو لغو تصور کرتا ہے جو اس کے ادراک ومشاہدہ سے دور ہو۔

☆ میرے ایک دوست نے اپنا ایک عجیب وغریب خواب بیان کیا جس کو سن کر میں نے اس حقیقت کو بخوبی سمجھ لیا کہ واقعی انسان کا ناقص مشاہدہ اور کمزور ادراک ایک بے اصل چیز کو اصلی اور واقعی سمجھ لیتا ہے اور اصلی وواقعی چیز تک دماغ نہ پہنچنے کی وجہ سے اس کو بے

حقیقت قرار دے کر انکار کر جاتا ہے۔

☆ دوست محترم یو۔ پی کے باشندے اور خاندانی رئیس ہیں۔ انہوں نے ایک نہایت حسین وجمیل عورت کو خواب میں دیکھا اور بیک نظر اس پر شیفتہ وفریفتہ ہو گئے۔ ہر چند کوشش کی کہ وہ حسینہ کسی طرح میرے عقدِ نکاح میں آ جائے لیکن ناکام رہے۔ بالآخر حسینہ کے اقارب نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر آپ اپنا دین اسلام ترک کر کے ہمارا مذہب عیسائی قبول کریں اور اپنی زوجۂ اول کو طلاق دے دیں نیز کل جائیداد اس حسینہ کے نام لکھ دیں تو کامیابی ہو سکتی ہے۔ بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہ دیکھتے ہوئے تینوں کام کرنے ہی پڑے۔ مذہب بھی بدلا، زوجۂ اول کو طلاق بھی دی اور تمام جائیداد منقولہ وغیر منقولہ بھی اس کے نام لکھ دی۔ اسٹامپ پر رجسٹری کرا کر جب فارغ ہوئے تو نہ وہ عالم تھا اور نہ وہ دوشیزہ۔

گھر بھی چھوٹا دیار بھی چھوٹا کیا غضب ہے کہ یار بھی چھوٹا

☆ یہ ظاہر ہے کہ عالم خواب میں فی الواقع نہ کوئی دوشیزہ تھی اور نہ اس کے عزیز و اقارب! یہ صرف صاحب خواب کے اپنے فانی اور بے اصل تخیلات و تصورات کے مناظر تھے جس کو ناقص مشاہدے اور کمزور ادراک نے جامۂ اصلیت پہنا کر گھر بار، مال و دولت، سب کچھ قربان کر دیا۔ اس پر بھی بجز کف افسوس ملنے کے نتیجہ کچھ نہ ملا۔

☆ آپ کہیں گے خواب کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ واقعی آپ کا خیال صحیح ہے مگر میں نے سنداً یا استدلالاً اس کو پیش نہیں کیا بلکہ بر سبیل تذکرہ تمثیلاً کہہ گیا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ سائنس کی بنیاد عقل اور مشاہدہ پر ہے اور صرف عقل و مشاہدہ ہی انسان کی صحیح رہنمائی کے لئے کافی نہیں۔ عقل و مشاہدہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں۔ مشاہدہ کا تعلق حواس خمسہ سے ہے اور عقل کا دماغ سے۔ مشاہدہ محکوم ہے اور عقل حاکم، مشاہدہ کی کمزوریوں اور غلطیوں کو عقل دور کیا کرتی ہے اور اگر مشاہدہ کے ساتھ عقل نہ ہوتی تو انسان اپنے مشاہدات میں ہر مرتبہ غلطی کرتا اور اس سے رہائی کا راستہ اسے کبھی نہ ملتا۔

☆ ہمارا تجربہ ہے کہ ہم ریل میں بیٹھے ہوئے جب کہیں جاتے ہیں اور ریل اپنی پوری رفتار سے چل رہی ہوتی ہے تو ادھر ادھر کے درخت (جو زمین پر کھڑے ہوتے ہیں) بڑی تیزی سے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مشاہدہ نے غلطی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی مگر عقل کا خدا بھلا کرے جس نے صاحب مشاہدہ کی گوشمالی کر کے اسے لغزش سے بچا لیا۔ اسی طرح رات کے وقت جب چاند بھی روشن ہو اور بادل کے ٹکڑے بھی کہیں کہیں منتشر نظر آئیں اور تیزی سے کسی سمت کو جا رہے ہوں تو اس وقت ہمیں چاند چلتا نظر آتا ہے حالانکہ یہ واقعہ نہیں۔

☆ بہر حال مشاہدہ غلطیاں کرتا ہے اور عقل ان کی تصحیح۔ اس صورت میں مشاہدہ کا ناقص ہونا ظاہر ہے۔ اب رہی عقل سو وہ بھی نقص سے پاک نہیں۔ عقل کا کام ہے نامعلوم چیز کو معلوم کر لینا اور اس کی حقیقت سے بقدر وسعت واقف ہو جانا۔

☆ یہ ظاہر ہے کہ جس قدر عقلا پیدا ہوئے وہ سب عقل کے مدعی رہے اور واقعی وہ اپنے دعوے میں حق پر بھی تھے پھر وہ سب

عقلیات میں ایک دوسرے کے نظریہ کا نقص اور عیب نکالتے رہے اور ایک کی عقل دوسرے کے مخالف اور متضاد رہی۔ اس ماحول میں ہم کس کی عقل کو اپنا رہنما بنائیں۔

☆ اگر ہر شخص اپنی ہی عقل کے تابع رہے تو دوسروں کی عقل اس کے نزدیک کیا مرتبہ رکھے گی؟ نہ یہ کسی کو اپنے برابر عقلمند خیال کرے گا نہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کے لئے دوسروں کی طرف رجوع ہوگا پھر اوروں کے نزدیک اس کی عقل کا کیا حال ہوگا؟ وہی جو اس کے نزدیک دوسروں کی دانائی کا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ صحیح رہنمائی کے معیار پر نہ اس کی عقل پوری اتری نہ اس کی یہ تو دو عقلوں کی جنگ تھی۔ اب سنیئے۔

☆ ایک شخص کسی اہم معاملہ میں اپنی عقل سے کام لینا چاہتا ہے اور ہر پہلو پر غور و خوض کر کے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ مجھے یہ کام ضرور کر لینا چاہیئے۔ مستقل ارادہ کے بعد اس کو معاً دوسرا خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کی رائے بدل جاتی ہے اور وہ اس کے نہ کرنے کو کرنے پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ جائے غور ہے کہ ایک ہی شخص کی عقل میں یہ اختلاف موجود ہے۔ ایک چیز کو کبھی اچھا اور کبھی برا سمجھنے لگتی ہے۔

☆ جب کسی معاملہ میں ایک شخص کا دوسرے سے اختلاف ہو تو عقلاً ایک ثالث کی ضرورت پڑتی ہے۔ مشاہدہ کے اختلاف کا فیصلہ تو عقل نے کیا۔ اب عقل کے جھگڑوں کو کون چکائے۔ اگر عقل اختلاف سے پاک ہوتی تو اس کے اوپر کسی حاکم یا ثالث کی ضرورت نہ تھی لیکن ہم نے ثابت کر دیا کہ ایک شخص کی عقل دوسرے کی عقل کے مخالف اور معارض ہوا کرتی ہے۔ پس ایسی صورت میں لازمی طور پر عقل کے تنازعات و اختلافات کے فیصلہ کے لئے کسی چیز کو تسلیم کرنا پڑے گا اور وہ چیز ایسی ہونی چاہیئے جو دوسروں کی طرح اختلافات سے پاک ہو۔ اس لئے کہ اگر وہ بھی آپس میں متنازعہ ہو تو پھر اس کے لئے بھی کسی تیسرے کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اس طرح یہ سلسلہ غیر متناہی ہو کر ہمیشہ کے لئے ناقابل اختتام ہو جائے گا اور یہ صراحتاً باطل ہے۔ بنابریں عقل کے ثالث کو اختلاف و تعارض کے عیوب سے مبرا ہونا چاہیئے۔

☆ وہ ثالث الہام ربانی ہے جو عقل کے تمام اختلافات کو ختم کر کے حقیقت واقعیہ کو پیش کرتا اور عقلاء کو لغزش سے بچاتا ہے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا کہ "وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا" اور اگر یہ قرآن حکیم غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پایا جاتا لیکن چونکہ یہ خالص وحی الٰہی ہے اس لئے ہر قسم کے اختلاف اور تناقض سے پاک ہے۔ ثابت ہوا کہ عقلیات کے انتہائی عروج اور ترقی کے باوجود بھی الہام ربانی اور وحی الٰہی کی ضرورت ہے۔ اسی کو مذہب کہا جاتا ہے۔ پس سائنس والوں کا اپنے گھڑے ہوئے اصول کے سامنے مذہب کو پس پشت ڈال دینا سراسر عقل کے خلاف اور نہایت افسوسناک امر ہے۔

☆ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو کمالاتِ انسانیہ کا ذمہ دار اور امن کا علمبردار ہے۔ نظام قدرت کی رفتار کا تعلق اور اصول مذہبیہ

کے ساتھ اس قدر استوار ہے کہ اگر ترد ید مذہب کو نظام قدرت کے درہم برہم کرنے کے مترادف قرار دیا جائے تو بعید از عقل نہ ہوگا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مذہب انسان کو ان اصولوں پر چلاتا ہے جن کے بغیر وہ اپنی ضروریاتِ زندگی اور اس کے متعلقات کو دائرہ انسانی میں رہ کر پورا نہیں کر سکتا۔ جس کی سرشت میں گناہ کا مواد بھرا ہو وہ کسی حال میں گناہ کرنے سے نہیں رک سکتا تاوقتیکہ کوئی زبردست طاقت اس کو روکنے والی نہ پائی جائے۔

☆ انسان کی فطرت میں گناہ کا مادہ موجود ہے۔ گناہوں کا صدور اس سے مختلف حالات میں ہوتا ہے۔ کبھی اس سے باز رہنے کے اسباب موجود ہوتے ہیں کبھی نہیں۔ مثلاً ایسے موقعہ پر گناہ کیا جائے جہاں اس کے افشا ہونے کا بظاہر کوئی احتمال نہیں یا اس گناہ پر حکومت کی طرف سے کوئی ممانعت نہیں یا اس ماحول میں اس کو گناہ نہیں سمجھا جاتا۔ اسبابِ انسداد معاصی کے ہوتے ہوئے تو کسی حد تک انسان گناہوں سے بچ سکتا ہے لیکن موخر الذکر تینوں صورتوں میں اور بالخصوص صورت اخیرہ میں کوئی طاقت انسان کو گناہ سے نہیں روک سکتی۔

ملحد گرسنہ در خانۂ خالی بر خوان
عاقل باور نکند کز رمضان اندیشد

☆ ایسی صورت میں اگر کوئی طاقت گناہ سے روک سکتی ہے تو صرف خوفِ خداوندی اور اصول مذہب کی پاسداری ہی ہے نہ کہ کچھ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ پر غور کر لیجئے۔ امراۃ عزیز کے مقاصد کی تکمیل کے اسباب میں کسی چیز کی کمی باقی تھی؟ حالات پر گہری نظر ڈالیے بجز خوفِ خداوندی اور الہام وحی ربانی کے آپ کو اور کوئی چیز نظر نہ آئے گی جس نے زلیخا کو محروم مدعا رکھا ہو۔

☆ معلوم ہوا کہ انسانیت کا نگہبان اور عصمت کا پاسبان مذہب ہے اور صرف مذہب! گناہ سے روکنے کے جب تمام اسباب کا فقدان ہو جائے تو اس وقت مذہب ہی اپنی طاقت سے کمزور انسان کی دستگیری کرتا اور نجاست گناہ میں ملوث ہونے سے بچاتا ہے۔ جن لوگوں نے مذہب کو بالائے طاق کر دیا ہے وہ حقیقتاً انسانیت کی حفاظت اور عصمت کی پاسبانی سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اب ان سے بہیمیت کے افعال سرزد ہوں یا سبعیت کے، بے حیائی پر کمر بستہ ہوں یا دیگر انسانیت سوز اعمال پر سب درست اور بجا ہے اور ذرہ بھر بھی مقام تعجب نہیں۔

☆ یہ مغرب کی پہلی ترقی جس نے مشرق کو بھی اپنی رو میں بہا دیا اور نہایت سرعت سے اطراف عالم میں پھیلی جارہی ہے۔

بدل دیا رخ مشرق کو تو نے اے مغرب
تری ہوا سے بچائے خدا زمانے کو

قرآن اور آسمان

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

ترجمہ☆ اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں

☆ جناب معلٰے القاب حضرت سید سید المفسرین تاج المحدثین مولانا قبلہ شاہ صاحب دام مجدکم۔ آداب تسلیمات مسنونہ وتکرمات مقونہ کے بعد عرض ہے کہ مسئلہ مندرجہ ذیل میں جناب عالی کی تحقیقاتِ علمیہ اور تدقیق محققانہ کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ اپنے قیمتی اوقات سے فرصت نکال کر متوجہ مسئلہ متذکرہ ذیل ہوں گے۔ وعلی اللّٰہ تعالیٰ اجرکم۔

الاستفسار ما قولکم دام طولکم اندریں باب کہ

☆ آسمان کی بابت ہم اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک مضبوط بنا ہے اور اس میں دروازے ہیں وہ ملائکہ کرام کا مستقر ہے اور اس میں خرق والتیام وغیرہ لوازماتِ جسمیہ کے قائل ہیں۔

قَالَ تَعَالٰى وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا۔ وَقَالَ عَزَّ مِنْ قَائِلٍ۔ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا۔ وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا

☆ استواء انفطار، انشقاق وغیرہ صفات سے ثابت ہے کہ عام اجسام کی صفات سے ثابت ہے کہ عام اجسام کی صفات سے متصف اور حدوث وفنا میں ان کے ساتھ ملحق ہے۔

☆ اسی طرح اجرام فلکیہ ستارہائے ثوابت وسیارہ کا افلاک میں مرکوز ہونا اور بعض کا ثابت وساکن اور بعض کا متحرک ہونا معلوم ہوتا ہے۔ كَمَا يُشِيْرُ اِلَيْهِ قَوْلُهٗ تَعَالٰى وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا. وَكُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ. فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ.

☆ برخلاف اس کے حکمائے یونانیین آسمان کو جسم بسیط اور متحرک تو مانتے ہیں مگر اس میں خرق والتیام کو ممتنع بتاتے ہیں اور اس کی قدامت کے قائل اور فنا کے منکر ہیں اور اہل سائنس جدید وجود آسمان کے منکر اور خلا کے قائل ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ سب ستارے نظام شمسی کے ماتحت سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں اور اب راکٹوں اور میزائلوں کے ذریعے ثابت کرتے ہیں کہ ۷۰ لاکھ میل تک خلا میں سفر کرنیکے بعد بھی آسمان کا وجود نہیں بلکہ خلا ہی خلا ہے۔ حتیٰ کہ ان کا مصنوعی سیارہ چاند سے گزر کر سورج کے گرد گھوم رہا ہے۔

☆ اس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ نظریۂ اہل اسلام وحکماء اہل رصد متقدمین برصواب نہیں۔ براہِ کرم اس بارہ میں مفصل روشنی ڈال کر ماجور ومشکور ہوں۔

کتبہ، الفقیر حافظ محمد عفی عنہٗ

الجواب: مکرمی وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کے استفسار کا مفصل جواب حسب ذیل ہے۔

☆ تخلیق انسانی کا وہ مقصد عظیم جس کی تکمیل کے لئے فطرتِ انسانی عقل سلیم کی روشنی میں بے تاب نظر آتی ہے صرف معرفت الٰہی ہے۔ قال اللّٰہ تعالٰی "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ" خازن میں ہے "وقیل معناہ الا لیعرفون وھو احسن" (ص ۲۰۶) اسی لئے ارشاد فرمایا "اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب۔" اور یہی وجہ ہے کہ ہر فرد انسان کسی نہ کسی رنگ میں ہستی باری تعالٰی کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کا تسلیم کرنا عقل سلیم کی روشنی میں شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ لیکن اس میں شک نہیں کہ اصنام و احجار بحار و اشجار خاک و نار شمس و قمر ماؤ مطر کو الٰہ ماننے والے زبان حال سے پکار رہے ہیں کہ ہم بھی الٰہ حق کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہیں۔ یہ ہماری بدنصیبی اور محروم القسمتی ہے کہ ہم نے غیر الٰہ کو الٰہ سمجھا۔ عابد کو معبود اور ساجد کو مسجود جانا لیکن ان مظاہر کائنات کی پرستش ہماری فطرت کے تقاضے کا پتہ دے رہی ہے کہ ہم بھی ہستی معبود کے مقر ہیں۔ حتیٰ کہ دہریہ نے بھی دہر کو موثر حقیقی مان کر تسلیم کرلیا کہ موثر کے بغیر اثر ناممکن ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے

دہری نے کیا دہر سے تجھ کو تعبیر
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

☆ اور یہ امر بھی ظاہر ہے کہ معرفت الٰہیہ ہی ایسی چیز ہے جس کے دامن سے سعادت دارین فلاح کونین راحت ابدی اور نجات حقیقی وابستہ ہیں جس کے لوازمات سے تخلی عن الرذائل اور تجلی بالفضائل ہے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اسلام جو اللہ تعالٰی کا بھیجا ہوا دین ہے اور قرآن جو اسی خالق حقیقی کا کلام بلاغت نظام ہے وہ عامۃ الناس کے لئے وضاحت کے ساتھ انہی مسائل کا بیان کرتا ہے جن سے اس کے مقصد تخلیق اور اس کے لوازمات اور مناسبات کا تعلق ہے۔ اگر عوام کے حق میں آپ دین کے ہر گوشے اور قرآن کے ہر بیان پر گہری نظر ڈالیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جن مسائل و مضامین کا تعلق اس مقصد عظیم سے نہیں یا جن چیزوں میں الجھ کر اس کے اپنے مقصود حقیقی کے دور ہو جانے کا اندیشہ ہو قرآن اور اسلام نے ان کو ایسے مضامین کے ساتھ مخاطب نہیں فرمایا نہ انہیں بنیادی حیثیت دی۔ البتہ خواص کے لئے ایسے اشارات رکھ دیئے جن کی روشنی میں ان کے لئے وہ تمام علوم و حکم اور مسائل و مضامین واضح اور روشن ہیں جو عوام کے حق میں بجائے مفید ہونے کے مضر ہو سکتے ہیں۔ زمین و آسمان و دیگر مصنوعات کائنات میں اللہ تعالٰی نے جس تفکر کی دعوت دی ہے وہ صرف ایسے طریقے سے ہے جس کا تعلق معرفت الٰہیہ سے ہو۔ اس کے علاوہ تفکر کے دوسرے طریقے جو معرفت الٰہی کا ذریعہ نہیں بلکہ بسا اوقات گمراہی کا سبب ہو سکتے ہیں قرآن نے پیش نہیں کئے۔ کسی چیز میں تین طرح تفکر ہو سکتا ہے۔ (۱) یہ چیز اصل حقیقت میں کیا ہے؟ (۲) اپنے اوصاف میں کیسی ہے؟ (۳) اس کا فائدہ کیا ہے؟

☆ پہلی صورت میں کم علم عوام کے لئے گمراہی کا سبب بن سکتی ہے۔ اس لئے اس طرزِ تفکر سے عوام کو بچایا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے "وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔" یعنی معرفت روح کے بارے میں "اَلرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" سے آگے تفکر نہ کرو کیونکہ تم اتنا علم نہیں رکھتے۔ دوسری صورت کا تعلق جس جگہ معرفت الٰہیہ سے ظاہر و باہر ہو

وہاں وہ اندازِ فکر شرعاً مطلوب ومحمود ہے۔

قال اللہ تعالیٰ "اَفَلَا یَنظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَاءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ۔" (غاشیہ ۱۷۔ ۲۰)

☆ تیسری صورت کا بھی یہی حال ہے کہ اگر وہ طریقہ تفکر معرفت ایزدی کا ذریعہ ہو تو عند اللہ مطلوب ومرغوب ہے ورنہ مذموم و مبغوض۔ قرآن کریم میں ہے "یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ۔" (بقرۃ : ۱۸۹)

☆ چاند کے گھٹنے بڑھنے کا فائدہ اوقات، عبادات کا مفہوم ہوتا ہے۔ اگر اس انداز سے اس میں تفکر واقع ہو تو بلا شک مطلوب ومحمود ہے۔ مصنوعات عالم میں قرآن کریم نے جو دعوت تفکر دی ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو ارشاد ہوتا ہے "اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَابَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ (بقرہ : ۱۶۴)

نیز ارشاد فرمایا "وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔" (آل عمران : ۱۹۱)

☆ ان آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن نے ہمیں اس حیثیت سے تفکر کی دعوت دی ہے کہ اس تفکر سے ہمیں معرفت الٰہیہ کا فائدہ حاصل ہو اور ہم سمجھیں کہ ہر شے کا حقیقی فائدہ یہ ہے کہ وہ وسیلہ معرفت خداوندی ہو۔ اس کے برخلاف جاہلیت کا نظریہ رکھنے والے مادہ پرست جو اندازِ فکر اختیار کرتے ہیں۔ وہ عموماً پہلی قسم کا ہوتا ہے اور وہ تفکر فی الماہیت ہے۔ یعنی اس بات کو سوچنا کہ اس چیز کی حقیقت کیا ہے؟ اس اندازِ فکر سے تو یہ ممکن ہے کہ مصنوعات عالم کے بعض دنیوی اور عارضی فوائد حاصل ہو جائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ غور وفکر کا یہ طریقہ ان کے لئے معرفت الٰہی کا ذریعہ اور سعادت دنیوی اور نجاتِ اخروی کا وسیلہ ہو سکے۔ مختصر یہ کہ اسلام نے ایک طرف تو ہمیں گمراہ کن اندازِ فکر سے بچایا اور دوسری طرف ہمارے لئے ان مسائل کی وضاحت پر اکتفاء کیا جن کا تعلق معرفت خداوندی، سعادتِ ابدی اور نجاتِ اخروی سے تھا۔ چاند، سورج، ستاروں اور آسمانوں کے مسائل بھی اسی قسم کے ہیں۔ قرآن مجید نے ان کے موجود اور محسوس ومشاہدہ حالات وکیفیات کو دلائل قدرت وبراہین معرفت سے شمار کیا اور صرف اسی حیثیت سے ان میں تفکر کی دعوت دی ہے۔ ان کی حقیقت وماہیت میں سوچ بچار اور ان کے احوال وتغیرات کے اسباب وعلل کی چھان بین چونکہ انسان کے مقصد تخلیق سے بہت دور تھی اور اس کے عارضی فوائد کے مقابلے میں گمراہی کے خطرات بہت زیادہ اور شدید تھے۔ اس لئے قرآن مجید نے عامۃ الناس کے لئے ان کی وضاحت سے پہلو تہی کی اور ان کے بیان میں وہی انداز رکھا جو انسانوں کے لئے ان کے مقصد تخلیق کے اعتبار سے مفید ثابت ہو۔ جہاں تک آسمانوں کے وجود کا تعلق ہے۔ قرآن مجید کی روشنی میں ان کا تسلیم کرنا ضروریاتِ دین سے ہے۔ جو شخص آسمانوں کے مطلق وجود کا انکار کرے گا وہ مومن نہیں رہ سکتا۔ رہا یہ امر کہ آسمانوں کے وجود کی حقیقت وماہیت کیا ہے؟ وہ اجسام ثقیلہ

ہیں یا خفیف ان کے اجزاء سخت ہیں یا نرم؟ وہ لطیف ہیں یا کثیف؟ نیز یہ کہ ستارے ان میں مرکوز ہیں یا غیر مرکوز؟ ان امور کے متعلق قرآن نے کوئی قطعی حکم بیان نہیں کیا نہ ان مسائل کو اصولی و بنیادی حیثیت دی۔ جن میں آیات خلق سمٰوٰت کا ذکر ہے۔ ان کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو موجود کیا ان کا وجود کیا ہے؟ یہ امر مسکوت عنہ ہے۔ آپ نے جن آیاتِ قرآنیہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ "وہ عام اجسام کی صفات سے متصف اور حدوث و فنا میں ان کے ساتھ ملحق ہیں" اور اس کے بعد آپ نے چند آیات تحریر فرمائیں جن کے پیش نظر ارقام فرمایا کہ "وہ اجرام فلکیہ اجسام فلکیہ ستارہائے ثوابت و سیارہ کا افلاک میں مرکوز ہونا اور بعض کا ثابت و ساکن اور بعض کا متحرک ہونا معلوم ہوتا ہے" وہ آیات آپ کے تحریر فرمودہ نظریات سے بالکل ساکت ہیں۔ آسمان یقیناً حادث ہیں مگر ان کے متعلق یہ نظریہ کہ وہ عام اجسام (کثیفہ محسوسہ) کی صفات سے متصف ہیں نیز یہ کہ ستارہائے ثوابت و سیارہ افلاک میں مرکوز ہیں بعض ساکن اور بعض متحرک ہیں۔ علماء ہیئت کا نظریہ ہے جمہور محققین اسلام اس کو صحیح نہیں مانتے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ علماء ہیئت کا مذہب یہ ہے کہ

☆ (۱) آسمانوں میں خرق والتیام محال ہے۔ (۲) ہر ستارہ الگ آسمان میں ہے۔ (۳) ہر ستارہ اپنے آسمان میں مرکوز ہے۔ (۴) آسمان اجرام صلبہ یعنی بہت سخت قسم کے اجسام ہیں اور جمہور محققین اسلام کا مذہب اس کے خلاف یہ ہے کہ

☆ (۱) آسمانوں میں خرق والتیام نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہے۔ (۲) سب ستارے ایک آسمان میں گھومتے ہیں۔ (۳) کوئی ستارہ کسی آسمان میں مرکوز نہیں بلکہ ستارے آسمان میں جاری ہیں۔ (۴) آسمان کا وجود یقینی ہے لیکن اس اس کا جرم سخت نہیں بلکہ وہ پانی اور ہوا کی طرح لطیف ہے یا مجوف ہے اور اس کا جوف ہوا سے پر ہے یا مجوف ہے مگر ہوا وغیرہ سے خالی ہے۔ اس میں ستارے اس طرح چلتے ہیں جیسے پانی میں مچھلی یا یہ کہ آسمان میں ستاروں کے جاری ہونے کی جگہ ایسی لطیف ہے کہ اس میں ستاروں کا چلنا آسان ہے یعنی آسمان کی وہ سطح جس میں ستارے چلتے ہیں لطیف ہے اور باقی حصہ منجمد ہے۔ امام ضحاک نے کہا کہ فلک کوئی جسم نہیں بلکہ وہ ستاروں کا مدار ہے اور اکثر کا قول ہے کہ افلاک اجسام ہیں جن پر ستارے گھومتے ہیں۔ ان کے اجسام کی کیفیت میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ فلک ایک موج مکفوف ہے جس میں چاند سورج اور ستارے جاری ہوتے ہیں۔ امام کلبی نے کہا کہ وہ ماء مجموع ہے جس میں ستارے تیرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سباحت (تیراکی) پانی کے بغیر ناممکن ہے۔ ہم ان کو جواب دیں گے کہ سباحت کا اطلاق پانی کے بغیر جائز ہے۔ دیکھئے تیز رفتار گھوڑے کو عربی محاورات میں سابح (تیراک) کہا جاتا ہے۔ ان تمام اقوال اور نظریات کے ثبوت میں حسب ذیل عبارات نقل کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) وکل تنوینة عوض عن المضاف الیه من الشمس والقمر والنجوم (جلالین)

(۲) فی فلک واحد من الافلاک وهی السماء الدنیا بدلیل قوله تعالٰی "اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ. یَسۡبَحُوۡنَ کَمَا یَسۡبَحُ السَّمَکُ فِی الۡمَاءِ." (تفسیر مظهری ص ۵ پ ۲۳)

(۳) والسبب فی ذٰلک عن الھیئة انھا مرتکزۃ فی فلاک جزئیة۔ (تفسیر مظھری پ ۳۰ ص ۲۰۸)

اس سے آگے چند سطور کے بعد فرماتے ہیں "واما عندنا فالکواکب کل منھا فی فلک یسبحون علٰی ما اراد اللّٰہ سبحانہٗ۔ (پ ۳۰ ص ۲۰۸)

(۴) (المسئلة الثالثة) الفلک فی کلام العرب کل شیء دائر وجمعه افلاک واختلف العقلاء فیه فقال بعضهم الفلک لیس بجسم وانما هو مدار هٰذه النجوم وهو قول الضحاک وقال الاکثرون بل هی اجسام تدور النجوم علیها وهٰذا اقرب الٰی ظاهر القراٰن ثم اختلفوا فی کیفته فقال بعضهم الفلک موج مکفوف تجری الشمس والقمر والنجوم فیه وقال الکلبی ماء مجموع تجری فیه الکواکب واحتج بان السباحة لا تکون الا فی الماء قلنا لا نسلم فانه یقال فی الفرس الذی یمدیدیه فی الجری سابح وقال جمهور الفلاسفة واصحاب الهیئه انها اجرام صلبة لا ثقیلة ولا خفیفة غیر قابلة للخرق والالتئام والنمو والذبول فاما الکلام علی الفلاسفة فهو مذکور فی الکتب اللائقة به والحق انه لا سبیل الی معرفة صفات السمٰوٰت الا بالخبر۔ (تفسیر کبیر جلد ۶ ص ۱۴۹)

(۵) وهٰذا المجری فی السماء ولا مانع عندنا ان یجری الکوکب بنفسه فی جوف السماء وهی ساکنة لا تدور اصلاً وذٰلک بان یکون فیها تجویف مملوء هواء او جسمًا آخر لطیفًا مثله یجری الکوکب فیه جریان السمکة فی الماء او البندقة فی الامتبوب المستدیرة مثلا او تجویف خال من سائر ما یشغله من الاجسام یجری الکوکب فیه اوبان تکون السماء باسرها لطیفة او ما هو مجری الکوکب منها لطفا فیشق الکوکب ما یحاذیه وتجری کما تجری السمکة فی البحرا وفی ساقیة منه وقد انجمد سائره وانقطاع کرة الهواء عند کرة النار المماسة لمقعر فلک القمر عند الفلاسفة وانحصار الاجسام اللطیفة بالعناصر الثلاثة وصلابة جرم السماء وتساوی اجزاءها واستحالة الخرق والالتیام علیها واستحالة وجود الخلاء لم یتم دلیل علی شیء منه واقوی ما یذکر فی ذٰلک شبهات او هن من بیت العنکبوت وانه ورب السماء لا وهن البیوت۔ انتهٰی۔ (روح المعانی پ ۲۳ ص ۲۲)

عبارت منقولہ سے حسب ذیل فوائد حاصل ہوئے

(۱) محققین اسلام کے نزدیک آسمانوں کا وجود ایسا لطیف ہے جس میں تمام ستارے اس طرح جاری ہیں جیسے پانی میں مچھلی جاری ہوتی ہے۔

(۲) آسمانوں میں خلق والتیام واقع ہے۔

(۳) ستارے آسمانوں میں مرکوز نہیں۔

(۴) ہر ستارے کے لئے الگ الگ آسمان نہیں بلکہ تمام ستارے ایک ہی آسمان میں ہے۔

(۵) بعض محققین جیسے امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ ستاروں کے جاری ہونے کی جگہ (فلک) کو جسم نہیں مانتے۔

(۶) آسمانوں کے جرم کی سختی وصلابت فلاسفہ کا مذہب ہے، اہل اسلام کا نہیں۔

(۷) فلک اور آسمان کی ماہیت وکیفیت کے بارے میں جلیل القدر ائمہ تفسیر اور محققین کا اختلاف اقوال اس امر کی روشن دلیل ہے کہ قرآن کریم نے عامۃ الناس کے لئے اس مسئلے کی وضاحت سے پہلو تہی کر کے تخلیق انسانی کے مقصد عظیم کی تکمیل کے لئے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور وہ کوئی ایسا بنیادی اور اصولی مسئلہ نہیں جس میں اختلاف کا امکان نہ ہو۔ ان فوائد کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل ظاہر ہے کہ اگر کسی وقت کوئی شخص چاند، سورج سے آگے بھی چلا جائے اور اسے آسمانوں کے وجود کا احساس وادراک نہ ہو تو کچھ بعید نہیں۔ اس لئے کہ اشیاء لطیفہ کثیف چیزوں کی طرح محسوس ومدرک نہیں ہو سکتیں۔ جس کی دلیل سائنسدانوں کا یہ نظریہ ہے کہ سورج اور زمین کے درمیان ایک رقیق مادہ (ایتھر) ہر وقت متحرک ہے جو تمام اجسام کا مبداء واصل مادہ ہے لیکن حواسِ خمسہ میں سے کوئی حس آج تک اس کا ادراک نہ کر سکا۔ محض اس لئے کہ وہ نہایت رقیق ولطیف ہے۔ لہٰذا اگر آسمان بھی اسی رقت ولطافت کی وجہ سے محسوس نہ ہوں تو اس میں کون سا تعجب ہے؟ بالخصوص اس صورت میں جبکہ وہ مستقر ملائکہ ہے اور ملائکہ لطیف ہیں اسلئے ان کا مستقر بھی لطیف ہونا چاہئے۔

☆ ہاں وہ فلاسفہ جن کے نزدیک آسمان کا جرم نہایت سخت اور کثیف اور اس میں خرق والتیام بھی نہیں ہو سکتا وہ اپنے اصول کے مطابق جواب نہ دے سکیں گے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی نظریات کی روشنی میں چونکہ یہ مسئلہ اصولی اور بنیادی حیثیت نہیں رکھتا اس لئے اگر کسی مسلمان متکلم نے بھی یہاں فلاسفہ کے بعض اقوال کو تسلیم کر لیا ہو تو اس سے ہمارے بیان پر زد نہیں پڑتی۔ زیادہ سے زیادہ اسی کے مسلک پر اعتراض ہوگا جس نے فلاسفہ کے قول کی تائید کی ہے۔ اسی طرح وہ بعض روایات جو ضعیف ہیں یا ضعیف نہیں مگر اخبار واحاد ہیں اور ان سے بظاہر اجسام فلکیہ کی کثافت اور ثقل وصلابت مفہوم ہوتی ہے ہمیں مضر نہیں کیونکہ ایسی روایات پر کسی اصولی اور بنیادی مسئلے کا ابتناء نہیں ہو سکتا۔ ہماری بحث صرف اصولی اور بنیادی مسائل میں ہے۔ ضعیف ظنی باتیں ہمارے پیش نظر نہیں۔ یہ تقریر اس تقدیر پر ہے کہ سائنس دانوں کا آسمانوں سے گزر جانا اور چاند سورج سے آگے بڑھ جانا دلیل سے ثابت ہو جائے ابھی تک تو کسی ادنٰی حیوان کا بھی وہاں تک پہنچنا ثابت نہیں ہوا۔ چہ جائیکہ انسان کی رسائی۔

☆ چند ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر آج تک کوئی نہ جا سکا تو ۴ لاکھ میل کی بلند پروازی کسی کے حق میں کیونکر متصور ہو سکتی ہے؟

☆ رہا یہ امر کہ راکٹ اتنی مسافت طے کر گیا تو اگر اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو آسمان کے جسم لطیف سے اس کا گزر جانا اس طرح ممکن ہوگا جیسے وہ ایتھر سے گزر گیا اور اگر اصل حقیقت پر غور کیا جائے تو راکٹ کے متعلق بھی یہ دعویٰ بلا دلیل ہے کیونکہ اس کی کیفیت رفتار معلوم نہیں اس بات پر کوئی سی دلیل قائم ہے کہ وہ بخط مستقیم حرکت کر رہا ہے جس کی بنا پر یہ اندازہ صحیح مانا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی

حرکت ایسی نوعیت کی ہو جس کی بنا پر یہ اندازہ غلط قرار پائے۔

☆ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں نے راکٹ چھوڑے ہیں وہ یہ دعویٰ یقین کیساتھ نہیں کرتے بلکہ محض اندازہ لگا کر کہتے ہیں کہ ہمارا راکٹ اس رفتار کے حساب سے اتنے عرصہ میں اتنی بلندی پر پہنچ گیا۔ اس اٹکل پچو اندازے کے متعلق قرآن کریم نے پہلے ہی فرمادیا

"اَنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ۔" (یونس: ٦٦)

☆ ایسی صورت میں اگر ہم اس دعویٰ کو یقینی قرار دیں تو وہی مثال صادق آئے گی کہ مدعی سست گواہ چست۔ اب ان آیات پر کلام کرتا ہوں جن کے پیش نظر بیان سابق میں شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ فاقول وباللّٰہ التوفیق۔

(۱) "وجعلنا السماء سقفا محفوظا۔" (انبیاء: ۳۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے آسمان کو گرنے سے محفوظ کر دیا۔ یہ نہیں کہ مطلقاً وہاں سے کسی کا گزرنا ہی محال ہے۔

(۲) "وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ۔" (الحجر: ۱۷) اس سے بھی یہ مراد نہیں کہ علی الاطلاق وہاں کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ آسمانوں کو ہم نے شیاطین کے استراق سمع سے محفوظ کر دیا۔

(۳) "وَبَنَیْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا۔" (انبیاء: ۱۲) اس کے معنی یہ نہیں کہ سماوات سبع نہایت محکم پائیدار اور ایسے قوی الخلقت ہیں کہ مرور زمانہ ان میں اثر نہیں کرتا۔ وہ اپنی پائیدار پیدائش کی وجہ سے فطور وفروج کے آثار وتغیرات سے محفوظ ومصؤن ہیں۔ دیکھئے تفسیر کبیر میں اسی آیت کے تحت ہے "شداد" جمع "شدیدۃ" یعنی محکمۃ قویۃ الخلق "لا یؤثر فیھا مرور الزمان لا فطور فیھا ولا فروج۔" (تفسیر کبیر ص ۴۳۱ جلد ۸)

(۴) "ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا۔" (نٰزعٰت: ۲۷، ۲۸) اس آیت کے بھی یہ معنی نہیں کہ آسمان کا جسم سخت ہے بلکہ آیت کریمہ کا مفہوم ہے کہ تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بنایا اس کے ابھار کو اونچا کیا پھر اسے ابر کیا۔ لطیف چیز کا ابھار بھی لطیف ہوتا ہے۔

(۵) "وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا۔" (النباء: ۱۹) اصول یہ ہے کہ موصوف جیسا ہوگا اس کی صفات اسی نوعیت کی ہوں گی۔ جب "وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ۔" (یٰس: ۴۰) یہ امر ثابت ہو گیا کہ آسمان لطیف شے ہے جس میں ستارے سباحت (تیراکی) کرتے ہیں تو اس کا بست وکشاد اور اس کے ابواب بھی اس کے حسب حال اور شایان شان ہوں گے۔ دیکھئے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔" (طٰہٰ: ۵) میں وہی استویٰ مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے یعنی جو اس کی جسمانیت کو مستلزم نہ ہو اسی طرح آسمانوں کا کھلنا بند ہونا اس کے دروازے علیٰ ہذا القیاس اس کا انفطار وانشقاق سب اس کی لطافت کے موافق ہوگا۔ اس طرح اس کے بروج اور اس میں مختلف الحال ستاروں کا پایا جانا یہ سب کچھ ایسے ہی لطیف اوصاف ہوں گے جیسے موصوف لطیف ہے۔ قرآن مجید میں "یَوْمًا ثَقِیْلًا۔ قَوْلًا ثَقِیْلًا" اور اسی قسم کے بکثرت الفاظ وارد ہیں لیکن آج تک کسی نے ثقل سے مادی ثقل مراد نہیں لیا کیونکہ

"ثَــقِيلًا" یوم اور قول کی صفت ہے جب موصوف جسمانی اور مادی نہیں تو صفت کس طرح جسمانی اور مادی ہوگی اسی طرح افلاک و سماوات کے لوازم ملزوم کے حسب حال اور اس کے شان کے لائق و مناسب ہی ہو سکتے ہیں اس کے خلاف کیونکر مراد لئے جاویں گے۔ نیز قرآن مجید کی آیت "ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ." (حٰم السجدة : ۱۱) سے آسمان کے جسم کے لطیف ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

(۶) "يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ" (الرحمٰن : ۳۳) اس آیت سے بظاہر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آسمانوں اور زمینوں سے نکل بھاگنا ممکن نہیں تو ظاہر ہے کہ آسمانوں سے گزرنا بھی محال ہوگا۔

☆ اسکا جواب یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت سے نکل جانے اور اس کے احاطۂ اختیار سے باہر ہو جانے کی نفی مراد ہے اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم زمین و آسمان سے نکل بھی جاؤ تب بھی اللہ تعالیٰ کے سلطان یعنی اس کی قدرتِ کاملہ اور قدرتِ غالبہ سے باہر نہیں جاسکتے۔ یا یہ کہ قیامت کے دن اس کی قدرتِ کاملہ کے بغیر اس کے عذاب سے نہیں چھوٹ سکتے۔ آیۂ کریمہ کا سیاق و سباق ان معنی کی روشن دلیل ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر ص ۳۰، ۳۱ جلد ۸۔ تفسیر مظہری جلد ۱۰)

☆ آخر میں ایک چھوٹے شبہ کا جواب عرض کردوں۔ اگر کسی وقت یہ ثابت ہو جائے کہ چاند وغیرہ میں آبادی ہے تو رسول اللہ ﷺ کی تعلیم انہیں کس طرح پہنچے گی پھر وہاں نہ قرآن ہے نہ کعبہ ہے نہ چاند ہے کیونکہ وہ خود چاند میں رہتے ہیں تو وہ روزہ، نماز وغیرہ کس طرح ادا کریں گے۔ اگر وہاں کوئی نبی مانا جائے تو حضور ﷺ خاتم النبیین نہیں رہتے۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ باوجود اختلاف احوال کے تمام مکلفین کے لئے احکام شرعیہ یکساں ہوں۔ علاوہ ازیں یہ کہ یہ اعتراض بھی فلاسفہ کے مذہب پر ہوگا اسلام اس امر کو محال نہیں جانتا کہ ایک وجود بیک وقت متعدد مقامات پر پایا جائے۔ نہ اسلامی اصول کی رو سے یہ امر ضروری ہے کہ مصنوعات عالم کی ہر چیز سب کے علم میں ہو۔ ممکن ہے کہ ایک چیز موجود ہو اور کسی مانع کی وجہ سے ہم اس کا مشاہدہ نہ کرسکیں۔ سائنس دان اور علماء ہیئت نے ایسے بہت سے ستاروں کو معلوم کرلیا جن کو پہلے فلاسفہ نہ جانتے تھے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ چاند میں رہنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی اور ستارہ بنایا ہو جو ان کے لئے چاند کا کام دیتا ہو اور ہمیں ابھی تک اس کا علم نہ ہوا ہو اور حضور ﷺ کے علاوہ کسی نبی کو ان کے لئے تسلیم کرنے کی اجازت نہیں۔ جب سائنس کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ فردِ واحد آنِ واحد میں کروڑوں مقامات پر موجود ہو سکتا ہے اور ہمارے لئے تو حضرت عبداللہ بن عباس کا وہ اثر کافی ہے کہ جس میں زمین کے ہر طبقے میں آدم علیہ السلام کی طرح آدم اور نوح علیہ السلام کی طرح نوح اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی طرح محمد ﷺ کا وجود ثابت ہے۔ بعض محدثین نے اس حدیث میں لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کی طرح حرف تشبیہ کو زائد قرار دیا ہے۔ جس کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ تمام طبقاتِ زمین میں یہ سب انبیاء عندکورین علیہم السلام بیک وقت قرار پائے جاتے ہیں اسی طرح اگر حضور ﷺ کا وجود مبارک اور ایسے ہی کعبہ شریفہ چاند میں بھی پائے جاتے ہیں اور وہاں کے سب باشندے حضور ﷺ ہی کی شریعت کے مکلف ہوں تو اس میں کون سا استحالہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

شہری زندگی

☆ زیرِ نظر مقالہ ۲۶ر نومبر ۱۹۶۰ء کو حسب پروگرام سیمینار منعقدہ نظامت اوقاف سنٹرل زون لاہور۔ بمقام حزب الاحناف حضرت علامہ کاظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھا۔

☆ عام طور پر شہر میں رہنے کو شہری زندگی کہا جاتا ہے مگر فنی اصطلاح کی رو سے اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اصطلاحی اعتبار سے اس کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی جائے گی۔

شہری زندگی کی تعریف

☆ کسی ملک کے معاشرے اور اس کی شہریت کو قبول کر کے اس کے تحفظ و بقا اور اسے ترقی دینے کے لئے نظم و ضبط کے ماتحت باہمی تعاون کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنا شہری زندگی کہلاتا ہے۔

☆ شہری زندگی کی بنیاد چونکہ معاشرہ اور شہریت پر ہے اس لئے ان دونوں کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔

معاشرہ

☆ کسی خاص مقصد کی تکمیل کے لئے انسانی گروہ کا مل جل کر زندگی بسر کرنا معاشرہ کہلاتا ہے۔

☆ معاشرے کی بنیادی اچھائی اور برائی مقصد پر موقوف ہے۔ اچھے مقصد کے لئے مل جل کر زندگی بسر کرنا اچھا معاشرہ ہے اور برے مقصد کے لئے مجتمع ہونا بنیادی طور پر بدترین معاشرہ ہے۔

☆ معاشرہ کے بعد شہریت ہے اس کی تعریف اس طرح کی جائے گی۔

شہریت

☆ کسی ملک کا بنیادی مقصد اس کا معاشرہ اور نظام اس ملک کی شہریت ہے اور اسے قبول کر کے اس میں شامل ہونیوالے اس ملک کے شہری کہلاتے ہیں۔ اس تعریف کی رو سے ہر ملک کا باشندہ اس کا شہری کہلائے گا یہاں تک کہ اگر وہ کسی دوسرے ملک میں بھی چلا جائے تو وہ اپنے ہی ملک کا شہری کہلائے گا۔ اسلیئے ہر حکومت غیر ممالک میں سفیروں کے ذریعے اپنے شہریوں کی حفاظت کا انتظام کرتی ہے۔

اجتماعیت

☆ شہری زندگی، معاشرہ اور شہریت تینوں کا بنیادی نقطہ اجتماعی زندگی ہے۔ اس لئے اس کا مختصر خاکہ اور اس کی ضرورت کا ذہن نشین ہونا مناسب ہے۔

اجتماعی زندگی اور اس کی ضرورت

☆ مل جل کر رہنا انسانی فطرت کا طبعی تقاضا ہے۔ کسی انسان کے لئے لاکھوں اسباب راحت اور آسائش مہیا کر دیئے جائیں اور

اسے بے شمار نعمتیں حاصل ہوں مگر اسے اس کے ہم جنسوں سے علیحدہ کر دیا جائے وہ نہ کسی سے مل سکے محض تنہائی کے عالم میں رہے تو یقیناً یہ تنہائی اس کے لئے سخت اذیت اور تکلیف کا موجب ہوگی اور وہ یہ چاہے گا کہ جملہ اسباب راحت و آسائش باقی رہیں نہ رہیں لیکن تنہائی کی اس قید سے مجھے نجات مل جائے اور میں آزاد ہو کر اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کروں۔

☆ اس طبعی تقاضے سے معلوم ہوا کہ اجتماعی زندگی انسان کی قلبی راحت اور ذہنی سکون کے لئے کس قدر اہم اور ضروری ہے۔

☆ علاوہ ازیں اجتماعی زندگی کے بغیر کسی صاحب کمال کی خوبیاں قوت سے فعل میں نہیں آسکتیں۔ کوئی کاریگر اجتماعی زندگی کے بغیر اپنا صناعی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی عالم و فاضل اپنے علم و فن کے جوہر دکھا سکتا ہے۔ نہ طبیب حاذق اپنی فنی حذاقت و مہارت کو کام میں لا سکتا ہے۔ غرض کوئی انسان اجتماعیت کے بغیر کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتا اور دنیا کا کوئی ارتقائی نظریہ پورا نہیں ہو سکتا۔

☆ صرف یہی نہیں بلکہ کسی شخص کی مادی ضرورتیں بھی اجتماعی زندگی کے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں۔ بڑی ضرورتوں کو چھوڑ کر ایک چھوٹی سی ضرورت اپنے سامنے رکھ لیجئے اور اس کے پورے ماحول پر ایک نظر ڈال لیجئے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اجتماعی زندگی کو ہماری ضروریات میں کتنا دخل ہے۔ مثلاً آپ کسی کو خط لکھنا چاہیں تو آپ کو قلم، روشنائی اور پوسٹ کارڈ کی ضرورت ہوگی۔ خط لکھنا ایک ضرورت ہے مگر اس ایک ضرورت کے ساتھ تین ضرورتیں آپ کو اور لاحق ہو گئیں۔ ان تینوں میں سے ہر ایک ضرورت کے ساتھ آگے کتنی ضروریات متعلق ہیں اور ان کا پورا ہونا افرادِ انسانی کی کسقدر عظیم تعداد سے وابستہ ہے اسکو سمجھنے کیلئے ذرا تفصیل کو ملاحظہ فرمائیے۔

قلم

☆ اگر آپ چوبی قلم بھی استعمال کریں تاہم تسلیم کریں گے کہ اس قلم کی لکڑی کو درخت سے کاٹ کر لانے کا کام کسی نے انجام دیا ہے پھر اس قلم کو بنانے اور ہموار کرنے کے لے چاقوں بھی استعمال کرنا پڑے گا۔ اس کا لوہا کسی کان سے نکالا گیا تھا۔ اسے ایک خاص طریقے سے صاف کیا گیا اس کام میں بھی بہت سے ہاتھ لگے ہیں پھر اس کی بار برداری میں کتنے مزدوروں نے محنت کی۔ اس کے بعد وہ تاجروں کے پاس آ کر فروخت ہوا اور رفتہ رفتہ کسی لوہار کے پاس پہنچا۔ اس نے اسے چاقوں کی شکل میں تیار کیا پھر اسے دستہ لگا دیا اور چاقو بن کر آپ کے ہاتھ میں آیا ان تمام مراحل میں کتنے ہاتھوں کا دخل ہے۔ آپ ان کی تعداد نہیں بتا سکتے لیکن اتنا تو سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک آدمی کا کام نہیں بلکہ بہت سے آدمیوں کی کارکردگی کا نتیجہ ہے۔

روشنائی

☆ اب روشنائی کی طرف آیئے۔ اسکا بھی یہی حال ہے کہ ہر مرحلے پر اس کی تیاری میں کثیر انسانوں کی کارکردگی شامل رہی ہے۔

پوسٹ کارڈ

☆ اس کے بعد پوسٹ کارڈ کو دیکھئے۔ مثلاً وہ روئی سے بنایا گیا۔ روئی کھیت میں کاشت کی گئی۔ کاشت کاری کے آلات استعمال ہوئے۔ ان آلات کو بنانے میں کتنے کاریگروں نے کام کیا پھر کاشت کے سلسلے میں کتنے آدمیوں کے ہاتھ شامل رہے۔ کپاس چننے اس

کے بنولے نکالنے میں کتنے مرحلے پیش آئے۔ پھر وہ روئی کارخانے میں لائی گئی جہاں تیار ہو کر کاغذ کے کارخانے میں پہنچی۔ کاغذ بننے میں کتنے کاریگروں اور مزدوروں کی ضرورت ہوئی اور اس کے بعد اس نے کارڈ کی صورت اختیار کی۔ پھر وہ کارڈ پریس میں پہنچا جہاں اسے حکومت کے قانون کے مطابق چھاپا گیا اور وہ پوسٹ کارڈ بن کر ڈاکخانہ میں آیا اور آپ نے خریدا۔ اتنے مرحلوں کے بعد وہ کارڈ آپ کے ہاتھ میں پہنچا اور آپ نے اسے لکھ کر لیٹر بکس میں ڈالا۔ لیٹر بکس سے آپ کا وہ کارڈ ڈاک خانہ کا ملازموں نے نکالا اور اسے ڈاک خانے پہنچایا۔ وہاں پہنچ کر مہر لگانے والوں کے ہاتھ میں آیا۔ الغرض اسی طرح ہاتھوں ہاتھ آپ کا وہ خط آپ کے مکتوب الیہ کے ہاتھ میں پہنچا اور آپ کی ضرورت پوری ہوئی۔ باقی تمام ضروریاتِ زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ معلوم ہوا کہ اجتماعی زندگی کے بغیر ہماری کوئی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔

نظم و ضبط

☆ کوئی اجتماعی زندگی اور معاشرہ کسی باقاعدہ طور طریقے اور قانون وضابطے کے بغیر نہیں چل سکتا۔

☆ ہر معاشرے کے لئے اس کا نظام قواعد وضوابط مجلسی آداب نظم وضبط کہلاتے ہیں لیکن شہری زندگی کا تعلق چونکہ ملکی معاشرے سے ہے اس لئے ہر ملک کا ملکی قانون اور حاکمانہ نظام ہی اس کی شہری زندگی کا بنیادی نظم وضبط ہے۔

نظم و ضبط کی ضرورت

☆ انسان میں جس طرح مل جل کر رہنے کی طبعی خواہش پائی جاتی ہے اسی طرح اس میں یہ تقاضا بھی بالکل فطری طور پر موجود ہے کہ اس کی ہر خواہش بلا روک ٹوک پوری ہوتی رہے۔ ظاہر ہے کہ تمام انسانوں کی جملہ خواہشات یکساں نہیں ہوتیں۔ اس لئے اگر ہر شخص اپنی ہر خواہش بلا روک ٹوک پوری کرنا چاہے تو یہ ممکن نہیں بلکہ ایسی صورت میں مخالف خواہشات باہم متصادم ہوں گی جس کا لازمی نتیجہ فتنہ فساد اور تباہی کی صورت میں نکلے گا۔ اس طرح اجتماعیت باقی نہ رہ سکے گی اور معاشرہ برباد ہو کر ختم ہو جائے گا چونکہ معاشرہ کا باقی رہنا بھی انسان کا فطری مقتضا ہے اس لئے اس کو بحال رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ باہم مخالف خواہشات کو متصادم ہونے سے روکا جائے اسی تصادم کو روکنے کا نام نظم وضبط ہے۔

☆ ہمہ گیر تصادم کا روکنا ہمہ گیر طاقت کے بغیر ناممکن ہے اس لئے ضروری ہے کہ پورا معاشرہ ایک مستحکم نظام اور حاکمانہ قوت کے ماتحت ہو۔ اسی قوت اور نظام کا نام ملکی قانون ہے۔ جس کے بغیر شہری زندگی کا قوام متصور نہیں ہو سکتا۔

باھمی تعاون

☆ نظم وضبط کے بعد باہمی تعاون اور ہمدردی کا مقام ہے۔ شہری زندگی میں جس تعاون کو دخل ہے اس کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ کسی معاشرے کو قبول کر لینے کے بعد افرادِ معاشرہ پر جو فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کے احساس تام اور عزم محکم کے ساتھ ان کی مکمل بجا آوری کا نام تعاون ہے۔

باہمی تعاون کی ضرورت

☆ کسی ملک کے باشندوں کے دل میں جب تک اخلاص، ہمدردی، ایثار اور باہمی تعاون کا جذبہ نہ ہو اس وقت تک نظم وضبط کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ کامیاب شہری زندگی بسر کی جا سکے۔

☆ شہری زندگی اور معاشرہ میں ایسے بے شمار مراحل ملیں گے جن پر ملکی حکومت کا کوئی قانون لاگو نہیں ہو سکتا۔ مثلاً غریبوں، مسکینوں اور ضرورت مندوں کی بعض ضرورتوں کے پورا نہ ہونے کی صورت میں ان کی زندگی ان کے لئے وبال جان بن جاتی ہے اور قانوناً ان کا پورا کرنا کسی کے ذمے نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اگر معاشرہ کے وہ افراد جن کے ساتھ ان ضرورتوں کے پورا ہونے کا تعلق ہے قانون کی آڑ لے کر خاموش بیٹھے رہیں اور کسی غریب، بے کس، حاجت مند کے ساتھ کوئی ہمدردی اور کسی قسم کا تعاون نہ کریں تو یقیناً معاشرہ کو سخت نقصان پہنچے گا اور اس کے نتائج نظم وضبط کے لئے بھی بے حد مضر ثابت ہوں گے۔ اس لئے نظم وضبط کے ساتھ باہمی تعاون بھی شہری زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

شہری زندگی کا تجزیہ

☆ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کو ذہن نشین کر لینے کے بعد شہری زندگی کا تجزیہ واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے یعنی اجتماعیت، معاشرہ اور شہریت اجتماعیت معاشرہ کا سنگ بنیاد ہے اور معاشرہ شریعت کی اصل ہے۔

☆ اور شہریت سے شہری زندگی وجود میں آتی ہے۔ ان تمام اجزاء اور ان کے مجموعے کے لئے نظم وضبط اور باہمی تعاون رگ جان کی حیثیت رکھتا ہے اور رگ جان پورے جسم میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس لئے اس کا تحفظ بھی سب سے زیادہ ضروری ہوگا۔ باہمی تعاون میں عوام اور نظم وضبط میں حکومت کی حیثیت بنیادی حیثیت ہے اس لئے شہری زندگی کی گاڑی ان دو پہیوں کے بغیر کسی طرح نہ چل سکے گی۔

نظم وضبط اور باہمی تعاون کی قدریں

☆ جب تک اقدار کا تعین نہ ہو ان کا تحفظ ناممکن ہے۔ نظم وضبط اور باہمی تعاون کی قدریں باہمی معاشرہ پر ابھرتی ہیں اس لئے سب سے پہلے معاشرہ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اجتماعی تقاضوں کی بنا پر معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے چونکہ وہ تقاضے مختلف معاشرے اجتماعی زندگی میں جنم لیتے ہیں مثلاً گھریلوں زندگی سے معاشرہ کی ابتدا ہوتی ہے اور اس کے تقاضوں کا لازمی نتیجہ تعلیمی، تجارتی، زراعتی اور صنعتی و دیگر مختلف معاشروں ک صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان تمام معاشروں میں انہی کے مطابق جو قواعد وضوابط طور طریقے اور قاعدے وقرینے وضع کئے جائیں گے وہ ان کے لئے ابتدائی اور جزوی نظم وضبط قرار پائیں گے۔ اسی طرح ہر معاشرے میں اس کے ماحول کے موافق افراد معاشرہ کا باہمی تعاون جزوی تعاون ہوگا۔ تمام جزوی معاشروں میں جزوی نظم وضبط اور جزوی تعاون نہ پایا گیا تو ہر معاشرہ اپنی جگہ تباہی کی نذر ہو جائے گا۔ علیٰ ہذا اگر تمام مختلف معاشروں کے کل افراد میں شہری زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے مجموعی

تعاون نہ پایا جائے اور اسی طرح ان سب معاشروں پر حکومت کا ہمہ گیر نظام قائم نہ رہے تو شہری زندگی کسی صورت میں برقرار نہ رہ سکے گی۔ اسلئے نہایت ضروری ہے کہ کلی اور جزوی تعاون اور نظم وضبط کی تمام اقدار کا ان کے مرحلوں پر پوری قوت کے ساتھ تحفظ کیا جائے۔

☆ اس اجمال کی تفصیلات بہت طویل ہیں۔ اختصار کے ساتھ اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ باہمی تعاون اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہر فرد اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس نہ کرے اور ان کی انجام دہی میں پوری سرگرمی سے کام نہ لے۔ ہر معاشرے کے افراد کے لئے فرائض اور ذمہ داریاں مختلف قسم کی ہیں۔ اس لئے ہر ایک کو چاہئے کہ وہ اپنے معاشرے میں اس کے ماحول کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے اور اپنے فرائض کو انجام دے۔ مثلاً گھریلو زندگی میں ہر ایک کی حق شناسی اور حق رسی لازمی سمجھی جائے اور اس پر پابندی کے ساتھ عمل کیا جائے اور ہمسائیگی کے حقوق صحیح معنی میں ادا کئے جائیں۔

☆ تعلیمی معاشرے میں طلباء آپس میں ہمدردی سے کام لیں۔ اساتذہ کے ساتھ ان کے شایانِ شان برتاؤ کریں اور اساتذہ طلباء کیساتھ شفقت وعنایت برتیں اور ان کے اخلاق وعادات اور تعلیم وتربیت کا پورا خیال رکھیں اور عملی طور پر کوئی فروگزاشت نہ کریں۔

☆ تجارتی معاشرے میں ایمانداری سے کام لیا جائے۔ عوام کی ضروریات زندگی کی اشیاء چھپا کر نہ رکھی جائیں اور ناجائز نفع اندوزی سے اجتناب کیا جائے۔

☆ زراعتی معاشرے میں اس بات کو اچھی طرح ملحوظ رکھا جائے کہ خوارک کی ذخیرہ اندوزی نہ ہونے پائے جس سے عوام کو تکلیف ہو۔ ایسا نہ ہو کہ خوراک مہیا نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ پیدا ہونے لگیں۔

☆ طبی معاشرے میں ڈاکٹروں، معالجوں، دوافروشوں کو دولت کمانے کی حرص دل سے نکال دینا چاہئے اور مریضوں کے ساتھ ہمدردی اور ایثار کے جذبات سے کام لینا چاہئے۔

☆ صنعتی معاشرے میں صرف اپنے ذاتی مفاد کو پیش نظر نہ رکھا جائے بلکہ عوام کی بہبود اور ملکی صنعت کو ترقی دینے کا جذبہ کارفرما ہے۔

☆ مذہبی معاشرے میں علماء ومشائخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ذاتی اغراض ومقاصد کو بالائے طاق رکھ کر خالص دینی اور مذہبی نقطۂ نظر سے عوام کی رہنمائی کی خدمت انجام دیں اور مذہب کو اپنے ذاتی اغراض کی تکمیل کا آلہ نہ بنائیں۔

☆ اسی طرح باقی تمام معاشروں میں ہر قسم کی خرابیوں سے بچنے کی پوری کوشش کی جائے اور معاشرے کو کامیاب بنانے کے لئے تنظیم، اتحاد اور باہمی اعتماد کے اصولوں پر عمل کیا جائے اور ہر مرحلے پر عوام کی بہبود اور خدمت خلق پیش نظر رہے۔

☆ پھر ان سب معاشروں کو مل کر حکومت کے ساتھ پورا تعاون کرنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ عوامی تعاون کے بغیر حکومت اپنے کاموں کو صحیح معنی میں انجام نہیں دے سکتی۔

☆ حکومت کے ساتھ بہترین تعاون کی صورت یہ ہے کہ ملکی قانون کا پورا پورا احترام کیا جائے اور کسی وقت بھی قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی مذموم کوشش نہ کی جائے۔ قانون کی خلاف ورزی ملک وملت کے ساتھ غداری ہے جو لوگ نڈر ہو کر جرائم کا ارتکاب کرتے

ہیں وہ معاشرے کے بدترین دشمن ہیں۔

حکومت اور عوام

☆ جس طرح عوام کے لئے حکومت کے ساتھ تعاون کرنا شہری زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے اسی طرح حکومت کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ عوام کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کرے۔ عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا حکومت کے اولین فرائض سے ہے۔عوام کی ضروریات زندگی کا انتظام، ان کی جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت، ظلم وجور کی روک تھام، رشوت ستانی کا انسداد، جرائم کا استیصال شہری زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہے۔

☆ شہری زندگی مستحکم نظام حکومت کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی اور یہ استحکام اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک عوام کا اعتماد حاصل نہ کیا جائے اور یہ اعتماد عوام کی خوشحالی میں مضمر ہے۔ لہٰذا عوام کی خوشحالی کے لئے حکومت کو پوری کوشش کرنی چاہئے تاکہ عوام اور عوام کے باہمی اعتماد اور تعاون کے ذریعے شہری زندگی کامیاب ہوسکے۔

باهمی تعاون کا اعلیٰ مقام

☆ معاشرے میں ہمدردی اور تعاون کا بلند مقام یہ ہے کہ ہر فرد اپنی زندگی گزارنے میں یہ سمجھے کہ میں اپنے لئے زندہ نہیں ہوں بلکہ میرا زندہ رہنا دوسروں کے لئے ہے۔ جب معاشرے میں یہ جذبہ پھیل جائے تو نہایت کامیاب معاشرہ قرار پائے گا اور جو شخص یہ سمجھے کہ میری زندگی میرے اپنے ہی لئے ہے وہ خود غرضی کا شکار ہوکر رہ جائے گا اور معاشرہ کو اس سے کوئی معتدبہ فائدہ نہیں پہنچے گا۔

عمدہ معاشرہ اور کامیاب شہری زندگی

☆ جس معاشرہ میں اپنی صلاحیتوں سے کام لینے والے افراد پائے جائیں گے وہ نہایت عمدہ معاشرہ ہوگا اور جہاں ایسے لوگ ہوں کہ اپنی ذہنی صلاحیتوں سے کام نہ لیں اور اپنی علمی وعملی قوتوں کو بروئے کار نہ لائیں وہ اپنے معاشرے اور شہری زندگی کے لئے اچھے افراد نہیں۔ خواہ وہ جرائم کا ارتکاب نہ کریں اور ان سے کوئی حرکت خلافِ قانون سرزد نہ ہو لیکن جب وہ جمود وخمود کا مجسمہ بن گئے تو شہری زندگی اور معاشرہ پر ان کا وجود ایک بوجھ بن کر رہ گیا۔ اس لئے وہ لوگ شہری زندگی کے لئے مفید ہونے کے بجائے مضر ہیں۔

☆ چونکہ شہری زندگی کا تعلق اولین ایک ہمہ گیر مقصد سے ہوتا ہے۔ اس لئے جس شہری زندگی میں اس بنیادی مقصد کے حصول کو نظر انداز کردیا جائے وہ کامیاب شہری زندگی قرار نہیں پاسکتی۔ اسے کامیاب اسی صورت میں کہا جائے کہ اس کا مطمع نظر بنیادی مقصد کا حصول ہو۔ مثلاً ہمارے ملک کی شہری زندگی ''پاکستانی شہری زندگی'' ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آزاد وطن پاکستان میں اسلامی طرز کی زندگی بسر کی جائے۔ اس بنیادی مقصد کی روحِ رواں اسلامی طرز کی زندگی بسر کرنا ہے۔ جب تک یہ روح اصل مقصد میں کارفرما نہ ہو مقصد متصور ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسلامی طرزِ زندگی بسر کرنے کی طرف پوری توجہ مبذول کی جائے اور پاکستان کی شہریت کے تمام شعبوں میں یہی روح کارفرما نظر آئے۔ اجتماعی زندگی کے تمام اصول، معاشرے کا نظم وضبط، باہمی تعاون کی جو

واضح اور روشن تعلیمات کتاب وسنت میں پائی جاتی ہیں کسی دوسری جگہ متصور نہیں۔ مختصر طور پر چند اقتباسات پیش کرتا ہوں

(۱) قرآن کریم اور اجتماعیت

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۔ (الحجرات : ۱۳)

☆ لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت پیدا کیا اور (پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں تا کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم سب میں زیادہ اللہ کے نزدیک عزت والا وہی ہے جو تم سب میں بڑا پرہیز گار ہے۔

☆ اس آیت کریمہ میں گھریلو زندگی خاندانی اور قبائلی اجتماعیت اور اس کے معاشرے کا نہایت جامع اور مختصر بیان ہے اور اچھے معاشرے کے لئے اعلیٰ کردار تقویٰ اور پرہیز گار کا ضروری ہونا مذکور ہے۔

(۲) قرآن اور شہریت کا بنیادی مقصد

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۔ (انعام: ۱۶۲،۱۶۳)

☆ کہہ دیجئے کہ میری نماز اور میری تمام عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور مجھ کو ایسا ہی حکم دیا گیا ہے اور میں اس کے فرمانبرداروں میں سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

☆ اس آیت کریمہ میں جماعت مسلمین کی زندگی اور موت کا بنیادی مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی فرمانبرداری کی قرار دیا گیا ہے۔

(۳) باهمی تعاون اور قرآن مجید

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ. (مائدة)

☆ اور نیکی اور پرہیز گاری (کے کاموں میں) ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی (کے کاموں میں) ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے۔

☆ اس آیت میں معاشرہ اور تعاون کے بنیادی مقصد کو بیان کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ معاشرہ میں نیکی اور تقویٰ تعاون کی بنیاد ہے اور گناہ پر تعاون سزا اور عذاب کا موجب ہے۔

(۴) نظم و ضبط اور قرآن

كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ (آل عمران : ۱۱۰)

ترجمہ ☆ تم بہترین امت ہو جو پیدا کئے گئے لوگوں کے لئے حکم کرتے ہو نیکی کا اور برائی سے روکتے ہو۔

☆ اس آیت کریمہ میں برائی سے روکنے کو پسندیدگی اور بہتری کا معیار بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ روک ٹوک اور برائی سے منع کرنا ہی نظم و ضبط ہے۔

(۵) اطاعت امیر اور قرآن کریم

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (نساء : ۵۹)

ترجمہ☆ اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے حکم والوں کی۔

☆ یہ آیت کریمہ خدا اور رسول کی اطاعت کے بعد صاحب امر لوگوں کی اطاعت کا فرض ہونا بتا رہی ہے۔

(٦) ضبط معاشرہ اور قرآن کریم

وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَاصْبِرُوْاؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (انفال : ٤٦)

☆ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور آپس میں نہ جھگڑو کہ (آپس میں جھگڑا کرنے سے) تم ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔

☆ اس آیت کریمہ میں بھی اجتماعی زندگی اور معاشرہ کے اصول اور اس کی برائیوں سے بچنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

☆ اس طرح حدیث شریف سے ان مسائل پر بہترین روشنی ملتی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویدہٖ (بخاری شریف)

☆ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان (کی اذیت) سے مسلمان محفوظ رہیں۔ یہ حدیث اجتماعیت، معاشرہ اور شہری زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے ایک نہایت جامع اور زریں اصول پیش کر رہی ہے۔ مسلمان کا مسلمان کی اذیت سے محفوظ رہنا اس کی اجتماعیت، معاشرہ اور شہریت سب کو کامیاب وخوش گوار بنا کر تکمیل مقصد وحصول مدعا کی طرف رہبری کرنا ہے۔

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہٖ۔ (بخاری شریف)

☆ تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اس حدیث میں ہر شخص کی ذمہ داریوں اور فرائض کا ذکر ہے اور اس بات کا بیان ہے کہ انسان اجتماعی زندگی کے ہر مرحلہ پر اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی بجا آوری کا پورا پورا لحاظ رکھے جو ضبط وتعاون کی اصل بنیاد ہے۔

ان تحب للناس ما تحب لنفسك وتکرہ لھم ما تکرہ لنفسك۔ (رواہ احمد۔ مشکوٰۃ)

☆ (افضل ایمان یہ ہے کہ) تو پسند کرے لوگوں کیلئے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور ناپسند کرے لوگوں کیلئے جو اپنے لئے ناپسند کرتا ہے۔

☆ اس حدیث میں کامیاب شہریت کا ایک سنہری اصول بیان فرمایا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ کتاب وسنت کی ہدایات کو سامنے رکھ کر اسلامی طرزِ زندگی بسر کرنا پاکستانی شہریت کا بنیادی مقصد ہے اور اس کو نظر انداز کر دینا پاکستانی شہری زندگی کی تعمیر نو کو اس کی اصل بنیاد سے منہدم کر دینے کے مترادف ہوگا۔

بنیادی نکات

☆ معاشرہ، اجتماعیت، شہریت، بنیادی مقصد، نظم وضبط، باہمی تعاون عوام اور حکومت، اسلامی طرزِ زندگی، کتاب وسنت۔

تعلیم میں دینی مدارس کا حصہ اور ان کی افادیت

☆ اس موضوع پر اظہارِ خیال سے پہلے ہم مروجہ تعلیم کا پس منظر اور اس کے عواقب و نتائج پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ تعلیم میں دینی مدارس کا حصہ اور اس کی افادیت کیا ہے۔ برصغیر میں انگریزوں نے تسلط حاصل کرنے کے بعد یہاں کے نظام تعلیم کو اپنا مطمع نظر بنایا۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ جب تک یہاں کے نظام تعلیم کو اپنے حسب منشاء نہ بدلا جائے گا اس وقت تک عوام کے اذہان پر غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

☆ فاتح اقوام کا ہمیشہ سے یہ دستور چلا آیا ہے کہ وہ اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کے لئے مفتوحین کے اذہان و قلوب کو مسخر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ان کی گرفت مضبوط نہیں ہوسکتی۔

☆ انگریزوں نے بھی اسی دستور کے مطابق برصغیر پر قبضہ جمانے کے بعد یہاں کے نظام تعلیم کو بدلا۔ متعدد ماہرین تعلیم انگریز یہاں کے نصاب تعلیم میں مختلف قسم کی تبدیلیاں کرتے رہے۔ مگر مستقل اور منظم انقلاب کا ذمہ دار میکالے تھا جس نے ۱۸۳۵ء میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کی تھی۔ چنانچہ ۱۸۴۴ء میں اعلان کردیا گیا کہ سرکاری ملازمتوں کے لئے انگریزی داں لوگوں کو ترجیح دی جائے گی۔ پھر وڈ منصوبہ پیش ہوا جس نے یہاں کا تعلیمی نقشہ یکسر بدل ڈالا۔ یہ منصوبہ مغربی تعلیم کا منشورِ اعظم کہلاتا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ طے ہوا کہ السنۂ شرقیہ بھی رہیں مگر ان شرقی زبانوں میں یورپی اور مغربی لٹریچر کی تعلیم دی جائے۔ اس سوچی سمجھی سکیم کے مطابق انگریزی زبان کے علاوہ ہماری ملکی زبانوں میں بھی مغربی افکار و مادہ پرستی اور الحاد کا پرچار ہونے لگا چنانچہ ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کردی گئیں اس کے بعد پٹنہ اور بنارس کی باری آئی اور قلیل مدت میں جدید تعلیم ہمہ گیر ہوگئی اور ملک کے ہر گوشہ میں اس تعلیم کے ذریعہ لوگوں کے دل و دماغ کو افکار مغرب کے سانچے میں ڈھالا جانے لگا۔ درسی کتابیں تالیف کی گئیں اور تاریخی کتب تصنیف ہوئی جن میں اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ مشاہیر اسلام بالخصوص حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کے خلاف معاذ اللہ الزامات قبیحہ تراشے جائیں چنانچہ بہت سے بدطینت یورپین نے اسلام دشمنی کا اظہار کیا۔ ولیم میور، سپرنگر اور گولڈ زہر وغیرہ کی متعصّبانہ تصانیف دیکھ کر ایک مسلمان کا خون کھولنے لگتا ہے۔

☆ انگریز نے نئی تعلیم کی اس تیز چھری سے عقائد و اصول اسلامیہ کو بے دردی کے ساتھ مجروح کرنا شروع کردیا اور ملت بیضاء کے مستحکم قلعہ کو متزلزل کرنے کی مذموم کوششوں میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہ لوگ عیسائیت قبول نہ کریں تو اسلام سے بہر حال دور ہوجائیں چنانچہ لادینیت کا ایک زبردست سیلاب آیا جس نے اخلاقی اقدار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایمانی قوت مضمحل ہوگئی اور قوئی روحانیہ ماؤف ہوکر رہ گئے۔ مادہ پرستی کا بھوت لوگوں پر سوار ہوگیا۔

☆ عیش و نشاط اور شکم پروری کے سوا کوئی چیز مطمع نظر نہ رہی اور فکر معاش فکر معاد پر غالب آگئی جو لوگ مادہ پرستی اور لامذہبیت کا شکار ہوجائیں اور خدا کی ہستی پر ان کا ایمان نہ رہے ان کے نزدیک نیکی اور عبادت کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ سکتی۔ نہ معصیت ان کے نزدیک

کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں حسن خلق اور بداخلاقی اور جرائم ہمارے معاشرے کا جزو لاینفک بن گئے اور مغربیت اپنی پوری طاغوتی طاقتوں کیساتھ ہم پر مسلط ہو گئی لیکن اسلام کی یہ معجزانہ شان تھی کہ اس تاریک ماحول میں مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح جیسی شخصیتیں مغربیت کے گہواروں میں تربیت پا کر امت مسلمہ کی فلاح و بہبود کیلئے آفتاب و مہتاب بن کر چمکیں۔

☆ پھر مقام شکر ہے کہ ہمارے مشائخ کرام اور علمائے عظام اسلام کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئے اور علماء و مشائخ کے وہ مقدس افراد جو حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ غریب نواز اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف کرام کے فیوض و برکات کی امانتیں اپنے سینوں میں لئے ہوئے تھے وہ ظلمت کے اس دور میں ہدایت کا مینار بن کر چمکے اور انہوں نے امت مسلمہ کی دست گیری فرمائی۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں اسلاف کے نقش قدم پر خانقاہی نظام قائم کیا اور دینی مدارس جاری کئے۔

دینی مدارس

☆ یہاں اس حقیقت کو واضح کرنا ضروری ہے کہ دینی مدارس سنگ و خشت کا نام نہیں بلکہ ہر وہ مقام مدرسہ ہے جہاں علماء اور صلحاء نے بندگانِ خدا کے قلوب کو علم و عرفان سے منور کیا خواہ وہ مسجد ہو یا خانقاہ کا حجرہ، ان کا مسکن ہو یا مکتب جہاں وہ تعلیم و تربیت کے لئے بیٹھ گئے وہی دینی مدرسہ بن گیا۔ ابن بطوطہ متوفی ۷۷۹ھ نے ہمیں بتایا کہ آٹھویں صدی ہجری میں مختلف اسلامی ممالک میں جگہ جگہ خانقاہی نظام برپا تھا۔ خانقاہ کو کبھی زاویہ کہتے اور کبھی رباط۔

☆ باقاعدہ مدارس قائم کرنے والوں میں نظام الملک متوفی ۴۸۵ھ اور میر علی شیر نوائی متوفی ۹۰۶ھ کے نام سرفہرست ہیں۔ بغداد، نیشاپور، ہرات وغیرہ کی نظامیہ یونیورسٹیاں دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ صرف نظامیہ بغداد میں چھ ہزار طلباء تھے۔ میر علی شیر نوائی نے بھی سینکڑوں مسجدیں اور مدرسے بنوائے۔ بغداد کی مستنصریہ یونیورسٹی تیرھویں صدی عیسوی میں عجائب روزگار سے تھی۔

☆ یہ دینی مدارس مسلمانوں کی علمی عظمتوں کے چمکتے ہوئے نشانات تھے اور ان تمام علوم و فنون کا مرکز رہے جو علمائے سلف سے انہیں بطور میراث پہنچے تھے۔ ان کی تعلیم کے سامنے جدید تعلیم ہیچ نظر آتی ہے۔ ان علوم کے ماہرین علماء سلف آسمان علم کے وہ چمکتے ہوئے آفتاب و مہتاب تھے جن کی عظمتوں کا اعتراف اغیار نے بھی کیا۔ غزالی، رازی، طبری، مسعودی، مقدسی، یاقوت حموی، خوارزمی کرخی، زکریا رازی، زکریا قزوینی، ابن الہیثم، زہراوی ایسے نامور علماء ہیں جن کے علم و فضل کا سکہ اہل یورپ کے دل و دماغ پر ابھی تک قائم ہے۔ اہل مغرب نے علمائے اسلام کے گراں قدر علمی شاہکار لاطینی، فرانسیسی اور جرمنی وغیرہ زبانوں میں منتقل کئے۔ یورپ کی موجودہ سائنسی ترقی مسلمان فضلاء کی مرہون منت ہے۔

☆ یورپ کے جس نشأۃ ثانیہ کے آغاز پر جدید تعلیم کے پرستاروں کو فخر ہے در حقیقت وہ علمائے اسلام خصوصاً اسپین اور سسلی کے عربوں کے علمی کارناموں کی بدولت ہے۔ ان مادہ پرستوں نے اپنے مخصوص مقاصد کی بنا پر صرف طبعی علوم پر زور دیا اور دیگر علوم و فنون جو انہوں نے مسلمانوں سے حاصل کئے تھے ان پر مغربی علوم کا لیبل چسپاں کر کے ہم تک پہنچانے کی کوشش کی۔

☆ برصغیر میں علمائے دین اور مشائخ عظام نے تعلیمی مراکز قائم کیے۔ ان کی تفصیل اس مختصر مضمون میں نہیں آ سکتی۔ دہلی، لکھنو، بدایوں، بریلی، خیرآباد، رامپور، ٹونک، کانپور، سہارنپور، مرادآباد، سندھ، پنجاب، بلوچستان، سرحد کے مختلف شہر مثلاً ٹھٹھہ، ملتان، لاہور، پشاور، سیالکوٹ، بہاولپور اور اسی طرح دوسرے مقامات علم و معرفت اور رشد و ہدایت کا گہوارہ رہے ہیں۔ دہلی میں ولی اللّٰہی درسگاہ کا فیض جاری تھا۔

☆ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز و شاہ عبدالقادر تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے۔ بدایوں میں شاہ عبدالقادر صاحب محبّ رسول جیسے عظیم اہل علم پیدا ہوئے جنھوں نے بدایوں جیسے مرکز علم کو چار چاند لگا دیئے۔ لکھنو میں فرنگی محل تعلیم اسلامی کا عظیم مرکز قرار پایا۔ خیرآباد میں آزادی ہند کے علمبردار حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی اور ان کے تعلیمی مرکز کا نام تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہے گا۔ ٹونک میں مولانا لطف اللہ صاحب ٹونکی اور ان کا مدرسہ کانپور میں مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور ان کا دارالعلوم علم و فضل کے چمکتے ہوئے نشانات ہیں۔ علاوہ ازیں مشائخ کرام کی خانقاہیں جیسے پنجاب میں خانقاہِ مجددیہ، یوپی میں خانقاہِ امدادیہ اور خانقاہِ صفیپہ (امروھہ) اسی طرح مشائخ کرام کے مقدس آستانے جیسے مہار شریف، کوٹ مٹھن شریف، تونسہ شریف، سیال شریف، گولڑہ شریف، بھیرہ شریف، علی پور شریف ان چمکتے ہوئے نقوش پر آج بھی ملک کے مختلف گوشوں میں علماء و مشائخ مدارس دینیہ و آستانہائے عالیہ کو علم و معرفت کا مرکز بنائے ہوئے ہیں اور اپنے اسلاف کی یادگاروں کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔

☆ باخبر حضرات اگر اسی ڈیڑھ سو سالہ دور کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور تعمق نظر سے جائزہ لیں تو انہیں برصغیرہ کے گوشہ گوشہ میں ایسے دینی مدارس کے چمکتے ہوئے نقوش نظر آئیں گے جنہیں صحیح معنی میں اسلاف کے دینی اور علمی مراکز کی عظمتوں کا ضامن کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مشائخ صوفیہ کی ان خانقاہوں کا تصور سامنے آئے گا جو بزرگان سلف کی روحانیت اور علم و معرفت کا گہوارہ تھیں۔ ان مدارس اور خانقاہوں میں جو تعلیم دی گئی وہ اس زہر کا تریاق تھی جو مغربی تعلیم کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں کو پلایا گیا۔

تعلیم میں دینی مدارس کا حصہ

☆ جمیع علوم کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے خواہ وہ علوم الٰہیات سے متعلق ہوں یا طبیعات سے۔ اسلیئے ہمارے نزدیک تمام علوم بلا امتیاز اسلامی علوم ہیں۔ البتہ مغربی مدارس اور دینی مدارس کی تعلیم میں فرق ہے۔ مغربی تعلیم اسی مخصوص اندازِ فکر کا نام ہے جو اہل یورپ کے مخصوص ملحدانہ مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ اسلامی تعلیم جو دینی مدارس سے حاصل ہوتی ہے وہ اسلامی فکر کے سانچے میں علوم کے ڈھل جانے کا نام ہے۔

☆ اندازِ فکر کے بدل جانے سے فکر بدل جاتی ہے۔ اگر ایک انسان کو دو شخص اپنا مطمح فکر بنالیں اور ان میں سے مثلاً ایک ماہر نفسیات ہو اور دوسرا ماہر امراض تو ہر ایک اپنے اندازِ فکر پر اس کے بارے میں غور و فکر کرے گا اور ہر ایک کا نظریہ اسی کے اندازِ فکر کے موافق ہوگا

اور دونوں کے اخذ کردہ نتائج الگ الگ ہوں گے۔

☆ اسلامی مدارس اور مغربی مدارس میں خواہ نصاب تعلیم ایک ہی ہو مگر دونوں کے اندازِ فکر کے اختلاف کے باعث نتائج واثرات یقیناً مختلف ہوں گے۔

مقصد تعلیم

☆ مغربیت کے پرستار آج تک تعلیم کا کوئی واضح مقصد اور اس کی غرض وغایت متعین نہ کر سکے لیکن ہمارے نزدیک علوم اور ان کی تعلیم کا ایک بنیادی مقصد اور غرض وغایت ہے جسے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں بیان فرماتے ہوئے کہا "وغایتھا معرفۃ اللّٰہ عز و جل." (احیاء العلوم ص ۲۹ ج ۱) علوم کا مقصد اور تعلیم کی غرض وغایت اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔

☆ انسان کا علم یا اپنی ذات سے متعلق ہوگا یا کائنات سے یا خالق کائنات سے جب اس کی نظر اپنی ذات پر پڑے گی تو اسے معلوم ہوگا کہ وہ حقائق کائنات کا جامع اور حسن خالقیت کا عظیم شاہکار ہے۔ یہ دونوں باتیں اس کے لئے خدا کی معرفت کا موجب ہوں گی۔ اس علم کی روشنی میں وہ اپنے دامن انسانیت سے وابستہ ہونے والے ہر ذرہ کو اپنے خالق اور صانع کی ہستی کے لئے دلیل سمجھے گا اور اپنے آئینۂ قلب میں اس کے حسن وجمال کی تجلیات کا مشاہدہ کرے گا۔

☆ اسی طرح جب وہ کائنات کو دیکھے گا تو افرادِ عالم اور اجزائے کائنات کا ہر فرد اور ہر جز اس کی نظر میں اس کی حقیقت جامعہ کے اجمال کی تفصیل ہوگا۔ وہ جانے گا کہ انسان کائنات اور خالق کائنات کے درمیان کیا تعلق ہے؟ یہ علم اس کے اخلاق کردار اور معاشرہ کی بنیاد قرار پائے گا۔

☆ مختصر یہ کہ قرآنی اور اسلامی علوم کی تعلیم اس مقصد عظیم کے پیش نظر صرف دینی مدارس میں ہوئی اور تعلیم کا یہ گراں قدر حصہ صرف مدارس دینیہ اور مراکز روحانیہ کے حصے میں آیا۔

☆ یہی وہ حصہ تعلیم ہے جسے دینی مدرسوں اور روحانی مرکزوں میں بیٹھ کر حضرت پیر جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت پیر سید مہر شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت پیر صاحب مانکی شریف، حضرت خواجہ غلام فرید کوٹ مٹھن شریف، حضرت خواجہ نور محمد قبلہ عالم مہاروی، حضرت مولانا ابو الحسنات الوری ثم لاہوری، حضرت مولانا ابو البرکات قادری، حضرت مولانا عبد الحامد بدایونی، حضرت مولانا پیر محمد کرم شاہ ازہری بھیروی جیسے کثیر علماء ومشائخ کرام نے حاصل کیا۔ ان میں سے موجودہ حضرات اور ان جیسے بے شمار فضلاء و صوفیائے عظام آج بھی اپنے مدرسوں اور مسجدوں میں درس وتدریس اور تلقین وتعلیم کا کام کر رہے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان جیسے اکابر فضلاء نے اپنی تصانیف جلیلہ کے ذریعہ قابل قدر علمی خدمات انجام دیں۔

دینی مدارس کی تعلیم کی افادیت

☆ اسلامی علوم دینی مدارس اور ان کی تعلیم سے متعلق جو تفصیل عرض کی گئی اس کے ضمن میں اس کی افادیت کھل کر سامنے آجاتی ہے

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے ذریعہ اسلامی علوم کا احیاء ہوا۔ تعلیمات قرآنیہ اور اسلامی اندازِ فکر سے عوام کو آگاہی حاصل ہوئی۔ خدا کی معرفت اور اس کے خوف کے اثرات سے مسلمانوں کے اذہان وقلوب منور ہو گئے۔ خیر وشر بد اخلاقی اور حسن خلق کا معیار قائم ہو گیا۔ حریت فکر اور جذبۂ جہاد ان ہی مدارس دینیہ کی تعلیم سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ دینی مدارس کی تعلیم ہی کا اثر تھا کہ نظریۂ پاکستان کی شدید ترین مخالفت کے دور میں بھی علماء اور مشائخ کی قیادت میں عامۃ المسلمین نے اسلامی قومیت کی بنیاد پر پاکستان کی حمایت کی اور بلا خوف لومۃ لائم اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

☆ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں علماء اور مشائخ نے جو کردار ادا کیا وہ بھی اس بات کی روشن دلیل ہے کہ دینی مدارس کی تعلیم عظیم الشان افادیت کی حامل ہے۔ البتہ اس پُر آشوب دور میں مدارس دینیہ کی حالت بہت کمزور ہے جس کے اسباب وعلل پر اس مختصر گفتگو میں تفصیلی روشنی ڈالنے کی گنجائش نہیں۔ اگر یہی صورتِ حال رہی تو خطرہ ہے کہ دینی تعلیم کا چراغ گل نہ ہو جائے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ عوام اور اربابِ حکومت دونوں اس سلسلے میں دلی ہمدردی اور دلچسپی کا مظاہرہ کریں۔

وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

فتویٰ حنفی

دربارۂ

پرائمری تعلیم مروجہ

☆ کہ وہ مسجد میں دینی ناجائز ہے اور ایسی تعلیم جس میں اردو، حساب، طوطے مینا کی کہانیاں ہوں مسجد میں دینی جائز نہیں

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

سوال نمبر ۱: شریعت میں حرمت کے لئے کیا کیا باتیں ہیں اس کی تفصیل بیان فرمائیں؟

جواب نمبر ۲: عالمگیری کی جلد خامس ۵ کے صفحہ ۳۲۱ پر حرمت مسجد کے پندرہ حال لکھے ہیں۔

اول: یہ کہ جب مسجد میں داخل ہو تو اس جماعت کو سلام کرے جو پڑھنے میں یا ذکر الٰہی میں مشغول نہ ہو اور اگر مسجد میں کوئی بھی نہ ہو یا جو ہیں وہ نماز میں مشغول ہوں تو مسلمان کو چاہئے کہ داخل ہو کر ”السلام علینا من ربنا علی عباد اللّٰہ الصالحین“ کہے۔

دوم: یہ کہ مسجد میں داخل ہو کر بیٹھنے سے قبل دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے۔

سوم: یہ کہ مسجد میں خرید وفروخت نہ کی جائے۔

چہارم: یہ کہ مسجد میں سل سیف نہ ہو۔ (تلوار نہ سونتی جائے)

پنجم: یہ کہ مسجد میں گم شدہ چیز کی تلاش کر کے مسجد کو مطعون نہ کرے۔

ششم: یہ کہ مسجد میں سوائے ذکر اللہ کے آواز بلند نہ کی جائے۔

ہفتم: یہ کہ مسجد میں دنیاوی کلام قطعاً نہ ہو (یعنی دینی تعلیم کے سوا دنیاوی تعلیم اور دنیاوی گفتگو بھی ممنوع ہے)

ہشتم: یہ کہ مسجد میں داخل ہو کر لوگوں کو پھاند کر آگے صف اول تک پہنچنے کی سعی نہ کرے۔

نہم: یہ کہ مسجد میں جگہ پر جھگڑا نہ کیا جائے۔

دہم: یہ کہ مسجد میں صفوں کے اندر گھس کر دوسرے نمازیوں کو تنگ نہ کیا جائے۔

یازدہم: یہ کہ مسجد کے اندر نمازی کے آگے سے نہ گزرے۔

دوازدہم: یہ کہ مسجد میں تھوکا نہ جائے (کہ صحن مسجد یا فرش خراب ہو اور دوسرے لوگوں کو اس سے نفرت ہو)

سیزدہم: یہ کہ مسجد میں انگلیاں چٹخا کر فعل دنیاوی کا مرتکب نہ ہو۔

چہاردہم: یہ کہ مسجد کو ہر قسم کی نجاست اور بچوں، مجنونوں سے محفوظ رکھا جائے اور سزا (تجویز کردہ حاکم) کا نفاذ بھی مسجد میں نہ ہو۔

پنجدہم: یہ کہ مسجد میں ذکر اللہ اور ذکر رسول کثرت سے کیا جائے۔ یہی شرائط حرمت مساجد کے غرائب میں ہیں۔

☆ اصل عبارت عالمگیری کی یہ ہے (جلد ۵ عالمگیری صفحہ ۳۲۱ مصری)

ذکر الفقیہ رحمۃ اللہ تعالٰی فی التنبیہ۔حرمۃ المسجد خمسۃ عشر

۱: اولہا ان یسلم وقت الدخول اذا کان القوم جلوسًا غیر مشغولین بدرس ولا بذکر فان لم یکن فیہ احد او کانوا فی الصلوۃ فیقول السلام علینا من ربنا وعلی عباد اللہ الصالحین

۲: والثانی ان یصلی رکعتین قبل ان یجلس

۳: والثالث ان لا یشتری ولا یبیع

۴: والرابع ان لا یسل السیف

۵: والخامس ان لا یطلب الضالۃ فیہ

۶: والسادس ان لا یرفع فیہ الصوت من غیر ذکر اللہ تعالٰی

۷: والسابع ان لا یتکلم فیہ من احادیث الدنیا

۸: والثامن ان لا یتخطی رقاب الناس

۹: والتاسع ان لا ینازع فی المکان

۱۰: والعاشر ان لا یضیق علی احد فی الصف

۱۱: والحادی عشر ان لا یمر بین یدی المصلی

۱۲: والثانی عشر ان لا یبزق فیہ

۱۳: والثالث عشر ان لا یفرقع اصابعہ فیہ

۱۴: والرابع عشر ان ینزھہ عن النجاسات والصبیان والمجانین واقامۃ الحدود

۱۵: والخامس عشر ان یکثر فیه ذکر اللّٰه تعالٰی کذا فی الغرائب

سوال نمبر۲: کیا اردو، حساب و کتاب پرائمری کے مروجہ تعلیم بالغ غیر بالغ، مسلم غیر مسلم بچوں، جوانوں کو مساجد میں دینا شرعاً جائز ہے؟

جواب نمبر۲: ہرگز نہیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے جلد۵ صفحہ ۳۲۱

ویکرہ کل عمل من عمل الدنیا فی المساجد

☆ اور ہر قسم کا عمل دنیاوی مسجد میں ناجائز ہے بلکہ مکروہ

☆ اس سے آگے اور وضاحت ہے کہ اگر مسجد میں قرآن کریم کی لکھائی بھی باجرت ہو تو بھی ناجائز ہے۔ ہاں اگر اپنے لئے کتابت قرآن کرے تو چونکہ ایک پہلوئے عبادت ہے بنابریں جائز ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر باجرت ماسٹر پڑھانے کو مسجد میں بیٹھے تو بھی ناجائز ہے۔ عالمگیری صفحہ ۳۲۱ جلد خامس ۵

☆ ولو جلس المعلم فی المسجد والوراق یکتب فان کان المعلم یعلم للحسبة والوراق لنفسه فلا بأس به لانه قربة فان کان للاجرة یکرہ الا ان یقع لهما الضرورة کذافی المحیط السرخسی. یہی حکم محیط سرخسی میں ہے۔

سوال نمبر۳: مسجد میں بیٹھ کر دنیاوی گفتگو کرنا جائز ہے یا کیا؟

جواب نمبر۳: ناجائز ہے بلکہ ایسی گفتگو کے لئے مسجد میں بیٹھنا بھی جائز نہیں۔ عالمگیری جلد خامس ۵ میں ہے

الجلوس فی المسجد للحدیث لا یباح بالاتفاق لان المسجد ما بنی لامور الدنیا اور خزانۃ الروایت سے منقول ہے کہ مسجد میں کلام دنیا کرنا حرام ہے۔ حتیٰ کہ مسجد کی چھت پر شدت گرما کی وجہ سے جماعت کے لئے چڑھنا بھی مکروہ ہے۔

وفی خزانة الدین ما یدل علٰی ان الکلام المباح من حدیث الدنیا فی المسجد حرام. قال و لا یتکلم بکلام الدنیا. والصعود علی سطح کل مسجد مکروہ ولهٰذا اذا اشتد الحر یکرہ ان یصلوا بالجماعة فوقه

سوال نمبر۴: مسجد میں نابالغ بچوں کو قرآن کریم پڑھانا کیسا ہے اور بچوں کو مسجد میں ادب سکھانے کے لئے زجر و توبیخ کا کیا حکم ہے؟

جواب نمبر۴: ناجائز ہے بلکہ پڑھانے والا گنہگار اور بچوں کو مسجد میں تادیب کے لئے مارنا پیٹنا بھی ممنوع ہے بشرطیکہ یہ تعلیم قرآنی باجرت ہو اور اگر بلا اجرت ہو تو جائز ہے۔ بحرالرائق جلد۵ کے صفحہ ۲۵۰ میں ہے

لو علم الصبیان القرآن فی المسجد لا یجوز و یأثم. وکذا التادیب فیه ای لا یجوز التادیب فیه اذا کان باجر وینبغی ان یجوز بغیر اجر.

☆ اور حضور ﷺ کے فرمان سے اس جزیہ کا اس طرح استناد فرمایا "واما الصبیان فقد قال النبی ﷺ جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم"

☆ اور مسجد کی حدود یعنی فناء مسجد کی دکانوں میں بھی ایسی دینی تعلیم ممنوع ہے اور یہی مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے جیسا کہ فرماتے ہیں "وکذا لا یجوز التعلیم فی دکان فی فناء المسجد هٰذا عند ابی حنیفة رحمه اللّٰه"

اسلامی معاشرے میں طلباء کا کردار

☆ غزالی زماں، رازیٔ دوراں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی مدظلہ' کی وہ تقریر جو انہوں نے انجمن طلباء اسلام پاکستان کے مرکزی اجتماع منعقدہ کراچی میں بروز اتوار ۷ اپریل ۱۹۶۸ء کو فرمائی۔

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ اللّٰھم صل علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ اٰل سیدنا محمد وبارك وسلم

☆ عزیز طلبا! یہاں حاضر ہو کر اور آپ کا اجتماع دیکھ کر میں اس قدر مسرور ہوں کہ میں اپنے ان جذباتِ مسرت کو ظاہر کرنے کے لئے نہ الفاظ پاتا ہوں نہ اس کے لئے وقت کی گنجائش محسوس کرتا ہوں۔ رسمی گفتگو کا میں عادی نہیں اور اس کے لئے بھی وقت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا یہ اجتماع اگرچہ بہت بڑا نہیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بڑے بڑے اجتماعات کے مقابلے میں آپ کا یہ اجتماع میرے لئے انتہائی مسرت کا باعث ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں یہ جانتا ہوں کہ قوم کا متاعِ عزیز آپ حضرات ہی ہیں۔ قوم کی نشوونما قوم کی فلاح، قوم کی صلاح، قوم کی بقا، یہ آپ حضرات کے دامنوں سے وابستہ ہے۔ معاشرے میں طلباء کا کیا کردار ہے اور انہیں کیا کردار ادا کرنا چاہئے۔ یہ ایک بہت وسیع موضوع ہے۔ اس کو نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

☆ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ حیاتِ انسانی کے دو ستون ہیں، ایک علم اور دوسرا عمل۔ علم بنیاد ہے اور عمل اس بنیاد کی تعمیر۔ علم ایک درخت ہے اور عمل اس درخت کے پھول۔ حضور تاجدارِ مدنی جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے دین متین کا جو نقشہ پیش فرمایا ہے یقین کیجئے کہ اس میں جمود و خمود نہیں ہے۔ اس کے اندر استنباط کے لئے، سوچنے کے لئے اور صحیح لائنوں پر غور و فکر کے لئے بڑی وسعتیں ہیں۔ مگر افسوس کہ ہماری اپنی تنگ نظری نے ان وسعتوں کو محدود کر دیا۔ ہم یہ سمجھے کہ حقائق کائنات پر غور کرنا اور حقائق کے علم کا حصول بے کاری بات ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے جس ذرہ کا آپ علم حاصل کریں گے وہ آپ کے حق میں نور ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ علم کا مقصد کیا ہے؟ علم کے معنی ہیں جاننا۔ کس چیز کا جاننا؟ جو چیز ہے اس کو جاننا لیکن نہ ہونے والی چیز کو ہم جانیں کہ وہ ہے تو یہ علم نہ ہوگا، جہل ہوگا۔ مثلاً اب رات نہیں ہے اور اگر کوئی شخص جانے کہ یہ رات ہے تو یہ جاننا کہاں ہے یہ تو نہ جاننا ہے جو چیز ہے نہیں اس کو ہم جانیں کہ ہے اور جو چیز ہے اس کو ہم جانیں کہ نہیں ہے۔ تو یقین کیجئے کہ ہست کو نیست جاننا اور نیست کو ہست جاننا یہ دونوں جہل ہیں۔ علم کے معنی یہ ہیں کہ نیست کو نیست اور ہست کو ہست جانے .... یہ ہے علم۔

حقیقتِ کائنات

☆ عزیزانِ گرامی! آج دنیا جس چیز کو علم قرار دے رہی ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدائے قدس جل مجدہٗ کی ذات ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی اور ساری کائنات میں جو کچھ ہے اسی کی صفات کا ظہور ہے، اسی کے اسماء کا ظہور ہے اور اسی

کے افعال کا ظہور ہے اور یوں کہیے کہ حقائق کائنات ...... اٹھارہ ہزار عالم ...... یہ سب کچھ اسی ذات واجب الوجود کا ظہور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا ہے اور خدا کے سوا کچھ نہیں۔ جس چیز کو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہے، خدا کی قسم! اس کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ مستقل وجود اگر ہے تو صرف خدا کا ہے۔ واجب الوجود کا ہے اور جس قدر کائنات کا وجود ہے، ہمیں نظر آ رہا ہے، سب اسی کے وجود کے ظلال ہیں۔ اسی کے وجود کا ظہور ہے۔ اسی کے وجود کی حقیقتوں کی نمائندگی کائنات کا ہر موجود ذرہ کر رہا ہے۔ میں کائنات کے وجود کی نفی نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی عاقل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے علم کلام کی بنیاد ہی حقائق کائنات کا ثبوت ہے۔ کیونکہ جب تک ہم حقائق کائنات کو ثابت نہیں مانیں گے تو اس وقت تک ہم مخلوق کو خالق پر دلیل کیسے بنائیں گے؟ ہمارا تو نظریہ یہ ہے کہ زمین اور آسمان کی جس چیز کو دیکھو، اسے دیکھ کر خدا کی ہستی کو پہچانو اور کائنات کے ہر ذرہ کو دلیل قرار دو اور کہو کہ سورج خدا کے ہونے کی دلیل ہے۔ چاند خدا کے ہونے کی دلیل ہے اور زمین و آسمان خدا کے ہونے کی دلیل ہیں۔ ہم تو تمام حقائق کائنات کو خدا کی ہستی کی دلیل بناتے ہیں اور اگر یہ چیزیں ہیں نہیں تو پھر دلیل کس کو بنائیں گے؟ عدم کو تو دلیل بنا نہیں سکتے۔ اس لئے ہمارا نظریہ یہ ہے کہ حقائق کائنات موجود ہیں لیکن ان کا وجود مستقل نہیں۔ مستقل وجود اگر ہے تو فقط واجب کا وجود ہے۔ تمام کائنات حقائق اسی واجب کا ظہور ہیں لیکن آج اس علم کا مفاد دنیا میں ہمارے سامنے علم کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ صرف مادہ ہے اور خدا کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ جو ہے اس کو نیست قرار دے دیا۔ نیست کو ہست بنا لیا اور ہست کو نیست سمجھ لیا۔ کائنات کا وجود کوئی مستقل وجود نہ تھا اور وجود مستقل صرف فقط خالقِ کائنات کا تھا لیکن آج اس مادہ پرستی کی دنیا میں، علم و فضل کے اس دعوے کی دنیا میں اس علم کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو تھا اس کو کہہ دیا کہ نہیں ہے اور جو نہیں تھا اس کو کہہ دیا کہ "ہے" کسی نے سچ کہا ہے

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

☆ علم کا مقتضا یہ ہے کہ عدم کو عدم جانے، وجود کو وجود جانے، ہست کو ہست جانے اور نیست کو نیست جانے اور یقین کیجئے کہ اس علم کا سرچشمہ فقط حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ اس راہ میں لوگوں کو بڑی ٹھوکریں لگتی ہیں۔ یہ وادی پرخطر ایسی نہیں کہ جہاں سے انسان آسانی سے گزر جائے۔ بڑے دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور نبی کریم ﷺ نے جو شاہراہ ہمارے لئے متعین کی ہے اس کے متعلق زبانِ رسالت نے فرمایا

ترکتم علی ملت بیضاء
لیلها ونهارها سواء

☆ میں نے تمہارے لئے وہ شاہراہ بنائی ہے کہ تم آنکھیں میچ کر گزر جاؤ اس کے دن رات برابر ہیں مگر شرط یہ ہے کہ راہ سے ہٹنے نہ پاؤ۔ اگر راہ سے ہٹ گئے تو ادھر بھی ہلاکت کے گڑھے ہیں اور ادھر بھی ہلاکت و تباہی کے گڑھے ہیں۔ اگر تم نے اس راہ کو اختیار کئے

رکھا، راہ پر رہے تو آنکھیں بند کر کے چلتے رہو۔ لیکن اگر راہ کو چھوڑ دیا تو پھر خواہ تمہاری دس آنکھیں بھی ہو جائیں کچھ کام نہیں ہوگا کیونکہ وہاں تو ہلاکت کے گڑھوں کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ اگر راہ پر استقامت اختیار کرو تو آنکھیں بند کر کے چلتے رہو۔ یہ راہ وہ ہے جس کے اندر کوئی کانٹا نہیں اور کوئی خطرہ اور خدشہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس صراطِ مستقیم پر خدا کے پیارے رسول ﷺ نے ہم کو لگایا ہے وہ ہمارے لئے شاہراہِ علم وعمل ہے۔ ہماری زندگی کا پہلا ستون علم ہے جو کہ بنیاد ہے۔ عمل اسی بنیاد پر تعمیر ہے۔

حقیقتِ علم

☆ طلباء کی شخصیت کیا ہوتی ہے؟ طلباء کا مقام کیا ہے؟ میں گوشت پوست کو طلباء کی شخصیت قرار نہیں دیتا۔ میرے نزدیک طلباء کا وجود اس ذہن کا نام ہے جو علم کے طلب کرنے والا ذہن ہے۔ علم ایک نور ہے اور نور جہاں آتا ہے ظلمت دور ہو جاتی ہے اور جہاں ظلمت دور نہ ہو سمجھ لو کہ وہاں نور آیا ہی نہیں، طلباء کا معیار، طلباء کے وجود کی علامت اور طلباء کے راہِ راست پر ہونے کی جو نشانی ہے وہ یہ ہے کہ جن طلباء کا ذہن صاف وروشن ہے، سمجھ لیجئے کہ وہ طلباء ہیں، علم کے طالب ہیں۔ علم کی راہوں پر چل رہے ہیں اور انہیں علم حاصل ہو رہا ہے۔ جو طالب علم اپنے ذہن کے اندر کوئی روشنی نہیں پاتا وہ سمجھ لے کہ میں علم سے محروم ہوں۔

☆ علم ایسا نور ہے جو ذہن کو روشن کرتا ہے جو دل کو روشن کرتا ہے جو دماغ کو روشن کرتا ہے۔ جو طلباء اس نور سے محروم ہیں، ان کو ان امور کی طرف نظر کرنی چاہئے جو اس کی راہ میں مانع ہیں اور جو نور علم کے لئے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرے اور ان راہوں کو صاف کرے جن راہوں سے ذہن اور دل کے اندر نور آتا ہے۔ مطلب یہ کہ طلباء وہ ہیں جن کا ذہن علم کے نور سے منور اور روشن ہوگا تو پھر ان کا عمل اور کردار بھی روشن ہوگا کیونکہ عمل کی عمارت تو ہمیشہ علم کی بنیادوں پر قائم ہوا کرتی ہے۔ تاریک کردار اس کا ہوگا جس کا دماغ تاریک ہوگا۔ طلباء کا معاشرے میں مقام یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن کو روشن کر کے قوم کے ذہن کو روشن کریں۔ طلباء کی جس جماعت کا ذہن روشن نہیں، سمجھئے وہ اپنے موقف پر نہیں ان کا وہ مقام نہیں ہے۔ تو طلباء کا پہلا مقام یہ ہے کہ وہ علم کے نور سے اپنے ذہن کو روشن کریں اور پھر وہی روشنی قوم تک پہنچا کر قوم کی ذہنی تاریکیوں کو روشنی میں بدل دیں۔ یہ ہے طلباء کا معیاری اور بنیادی کردار۔ اس کردار کو ادا کئے بغیر طالب علم کا نہ کوئی ابتدائی مقصد قرار پاتا ہے، نہ انتہائی، اور یہ روشنی جو تمہارے دماغوں کو صاف کرے گی، مادی علوم سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کا حاصل کرنا اسلامی علوم کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لئے کہ مادے میں تاریکی ہے۔ مادہ خود تاریک ہے۔ تاریکی سے تاریکی کے سوا کیا مل سکتا ہے۔ اگر آپ کو یہ نور حاصل کرنا ہے تو آپ اسلامی علوم کی طرف بھی توجہ دیں۔

☆ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اسلامی علوم کیا ہیں؟ آپ شاید یہ کہیں کہ ’’یہ ہمیں سائنس سے ہٹاتے ہیں۔ دنیا کے علوم سے ہٹاتے ہیں۔‘‘ لیکن خدا کی قسم! کائنات کا کوئی علم ایسا نہیں جو غیر اسلامی ہو۔ اسلامی علم سے کیا مراد ہے؟ اسلامی علم سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کا علم تم حاصل کرو، یہ سمجھو کہ وہ چیز خدا نے بنائی ہے۔ اس کے اندر یہ صفت، یہ خصوصیت، یہ کیفیت اسی نے پیدا کی ہے۔ اس چیز کے اثرات کو دیکھتے جاؤ۔ اس کی خصوصیات کا تجزیہ کرتے جاؤ جن چیزوں کے اندر حرارت ہے اس چیز کی حرارت کو دیکھ کر حرارت کے پیدا

کرنے والے کو پہچانو۔ کسی چیز کے اندر تم نے دیکھا کہ برودت ہے تو پھر اس سے برودت پیدا کرنے والے کو پہچانو۔ کیونکہ کسی پیدا کرنے والے کے بغیر کوئی چیز نہیں ہوا کرتی۔ اگر تمہارا دماغ رطوبت و برودت کے اندر پھنس کر رہ گیا تو سمجھو کہ تاریکی میں مبتلا ہو گئے۔ اگر یہ سمجھا کہ وہ ٹھنڈک ہے، یہ گرمی ہے، یہ خشکی ہے اس چیز میں فلاں صفت ہے، یہ تاثیر ہے، یہ اثر ہے، یہ خصوصیت ہے، ان تمام اثرات وخصوصیات کو معلوم کرتے چلے جاؤ اور حقائق کائنات سے واقف ہوتے چلے جاؤ اور جب کبھی حقیقت کا انکشاف ہو، سمجھ لو کہ حقیقت بنانے والے کے بغیر اس حقیقت کا وجود نہیں ہو سکتا۔

☆ یہاں مجھے ایک بات سمجھانا ضروری ہے کہ وہ طلباء جن کے ذہن مادی علوم میں گھرے ہوئے ہیں اور اسلامی علوم کی ہوا نہیں لگی، ان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی ہے کہ یہ خدا کا تصور اور خدا کی ذات کا عقیدہ محض ایک توہم ہے۔ لوگوں نے یوں ہی لوگوں کو ڈرانے کے لئے خدا کا تصور لوگوں کے ذہنوں میں ڈال دیا ہے۔ جیسے بچوں کو کہتے ہیں کہ ہوا آ گیا۔ ارے بھائی! اگر خدا نہیں تو یہ نظامِ کائنات آخر کیا ہے؟ ان کا کہنا ہے کہ مادے کے اندر یہ صفات خود بخود موجود ہیں۔ ایک مادہ ایک وقت میں ایک حال میں ہے۔ پھر وقت گزرا دوسرے حال پر آیا۔ پھر وقت گزرا تیسرے حال پر آیا۔ اس طرح مادے کے اندر جو خواص چھپے ہوئے ہیں، وہ ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ مادے کے اندر تمام ترقیات کے اثرات ہیں اور مادہ اپنے اپنے وقت میں ترقی کی منازل طے کرتا جاتا ہے۔ تو یہ تو تمام مادی خواص ہیں۔ مادی اثرات ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک گندم کا دانہ ہوتا ہے۔ اس کو ہم زمین میں ڈال دیتے ہیں وہ ایک نرم و نازک شاخ کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم کئی گندم کی بالیاں حاصل کر لیتے ہیں۔ تو یہ تو مادے کی خصوصیات اور اثرات ہیں جو اپنے اپنے موقعوں پر جیسا ماحول ان کی کیفیات کے ظہور کے لئے مہیا ہوتا جاتا ہے۔ اس کے مطابق وہ مادے کے اثرات قائم ہوتے جاتے ہیں۔ یہ تو مادے کے اپنے ذاتی اثرات ہیں۔ ان کی خصوصیات ہیں، جو خود بخود ظاہر ہوتی جاتی ہیں۔ اس کے لئے یہ نہیں کہ کسی بنانے والے نے بنائے ہوں یا پیدا کرنے والے نے پیدا کئے ہوں۔ اس کے متعلق میں ایک ذرا سی بات عرض کرنا چاہتا ہوں اور اپنے عزیز طلباء سے کہوں گا کہ خاص طور پر اپنے ذہن کو متوجہ کریں۔ دیکھیے! یہ ایک ایسی بات ہے جس کا جواب مشاہدات کی دنیا میں نہیں دیا جا سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مشاہدات کی دنیا میں یہ سوال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میں نے ارخاء عنان کے طور پر یہ بات تسلیم کر لی اور اس کے بعد پھر میں جواب کی طرف آتا ہوں۔

مادہ پرستوں کا عقیدہ

☆ بات یہ ہے کہ تمام نظامِ کائنات کے بارے میں خدا کے منکروں کا مادہ پرستوں کا، مادی علوم کے ماہرین کا بنیادی نظریہ یہی ہے کہ مادے کے اندر یہ اثرات وخواص ہیں اور وقت آنے پر وہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اب ہم نے ان سے پوچھا کہ بھئی یہ بتاؤ کہ مادے کے اندر ان اثرات وخواص کا مختلف مقامات پر مختلف صورتوں میں پایا جانا جو کہ فعل وظہور ہے تو اس کا تعلق کسی امر خارج کے ساتھ ہے یا یہ بھی مادے کی طرح ہے؟ انہوں نے کہا کہ بھئی بات یہ ہے کہ یہ اثرات تو مادے ہی کے ہیں لیکن ان کا ظہور کسی سے متعلق نہیں بلکہ وہ

ایک امر اتفاقی ہے۔ جیسا کہ قضیہ اتفاقیہ ہوتا ہے یعنی اتفاق سے ایک مادہ سورج بن گیا، اتفاق سے ایک مادہ چاند بن گیا، اتفاق سے مادے کے کچھ اجزاء جو تھے انہوں نے درخت کی شکل اختیار کرلی۔ تو یہ تو بالکل قضیہ اتفاقیہ ہے کہ کچھ اجزاء جو مادے کے تھے وہ اونٹ بن گئے اور کچھ گھوڑے بن گئے اور کچھ گدھے بن گے، کچھ بکریاں بن گئیں اور کچھ انسان بن گئے۔ یہ تو محض ایک اتفاقی بات ہے۔ یہ نہیں کہ اس کا تعلق کسی خارجی حقیقت کے ساتھ ہو۔ رہا یہ کہ ان کا اس نوعیت کے ساتھ ظاہر ہونا۔ تو اس ظاہر ہونے میں کسی ظاہر کرنے والے کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ یہ قضیہ اتفاقیہ ہے۔ جیسے اتفاق ہوگیا کہ آپ یہاں بیٹھے ہیں اور میں آیا، میں نے آپ کو دیکھ لیا۔ آپ نے مجھ کو دیکھ لیا۔ میں نے کچھ کہا۔ آپ نے میری باتیں سن لیں۔ گویا قضیۂ اتفاقیہ ہے۔ یہ ہے ان مادہ پرستوں کا نظریہ۔ اب میں اس نظریہ کو توڑتا ہوں ایک دلیل سے اور اپنے عزیز طلباء کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

☆ دیکھیے صاحب، جو چیز محض اتفاقی ہو، اس کا کیا حال ہوتا ہے؟ اور اس نظامِ عالم کا کیا حال ہے؟ ذرا دونوں کے حال پر ایک نظر ڈالیے تو آپ دیکھیں گے کہ ۱۸۰۰۰ کائنات کا جو نظام ہے وہ اتنا منظم، اتنا مربوط اور مستحکم ہے کہ ایک کی کڑی دوسرے کی کڑی سے جدا نہیں کی جاسکتی۔ چاند، سورج، ہوا، آگ اور پانی یہ عناصر و جواہر ہیں۔ اسی طرح دیگر جتنے بھی اجزائے عالم ہیں ان کا باہمی کتنا ربط ہے، کیسا عظیم ربط ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہوا نہ ہوتو ہم سانس نہیں لے سکتے۔ اگر حرارت نہ ہوتو ہمارے اندر حیات کا کوئی اثر باقی نہیں رہ سکتا۔ پانی نہ ہوتو ہماری حیات باقی نہیں رہ سکتی۔ زمین نہ ہوتو ٹھہریں گے کہاں؟ اور چاند سورج نہ ہوں تو ان کی طرف سے جو اثرات وخواص نباتات و جمادات پر مرتب ہوتے ہیں وہ مرتب کہاں ہوں گے؟ درختوں، پھلوں اور غلوں کی مختلف لذتیں اور گونا گوں مزے اور پھر ہر چیز کا مختلف رنگ اور مختلف حالت۔ یہ سب کیا ہیں؟ یہ سب چاند اور سورج کی گردشوں کے اثرات ہیں، جن سے یہ چیزیں رونما ہوتی ہیں، کھیتیاں پکتی ہیں، پھل پکتے ہیں۔ کہیں حیوانات ہیں، کہیں درخت ہیں، کہیں پانی ہے، کہیں آگ ہے، کہیں ہوا ہے، کوئی نظامِ ارضی ہے، کوئی نظامِ سماوی ہے۔ اسی طرح اگر ہم اپنے وجود پر بھی نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ سر سے لے کر پاؤں تک اتنا ربط ہے کہ اللہ اکبر! ہمارے بالوں کا رابطہ ہماری کھال کے ساتھ ہے۔ کھال کا رابطہ ہمارے گوشت کے ساتھ ہے اور گوشت کا ربط ہماری استخوان کے ساتھ ہے اور پھر ایک ایک رگ کا تعلق نیچے سے لے اوپر تک کہاں کہاں جاتا ہے۔ اگر ہماری انگلیوں کے جوڑ نہ ہوں تو نہ ہم کھول سکتے اور نہ بند کر سکتے۔ اگر یونہی ایک سیدھی سی ہڈی رکھ دی جاتی تو پھر یہ انگلیاں سیدھی ہی کھڑی رہتیں۔ اگر ہماری پشت کے اندر مہرے نہ رکھے جاتے تو اٹھنا بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ جسم ایک تختے کی طرح رہ جاتا جسے چاہو تو کھڑا کردو چاہو تو لٹادو۔ ہمارے گھٹنے کے جوڑ اس نوعیت کے ساتھ پیدا کیے گئے ہیں کہ ہم ان کو سکیڑنا چاہیں تو سکیڑ سکتے ہیں، موڑنا چاہیں تو موڑ سکتے ہیں، سیدھا کرنا چاہیں تو سیدھا کر سکتے ہیں۔ ہماری آنکھیں، ہمارے کان، ہماری زبان، ہمارے دانت سب اپنی اپنی مخصوص جگہوں پر لگے ہوئے ہیں، اب بتایئے کہ یہ دانت جو اللہ تعالیٰ نے منہ میں پیدا کیے ہیں، اگر سر کے اوپر پیدا کر دیتا......! بھئی یہ بھی تو قضیہ اتفاقیہ ہے نا! اتفاق سے کسی کے دانت سر پر ہی ہو جاتے تو کون سی بات تھی؟ لیکن دیکھیے کہ ہمارے دانت اس مقام پر ہیں جہاں ہونا چاہیے تھے۔ کسی زبان آپ

کان کی جگہ نہیں دیکھیں گے۔ کسی کے کان آپ آنکھ کی جگہ نہیں دیکھیں گے۔ کسی کی آنکھ آپ پاؤں کی جگہ نہیں دیکھیں گے۔ کسی کا پاؤں سر پر نہیں دیکھیں گے۔ کسی کا ہاتھ آپ پیٹھ پر نہیں دیکھیں گے۔ یہ بات کیا ہے؟ ہمارے وجود کا جو نظام ہے، اتنا منظم ہے، اتنا مربوط ہے اور اتنا مستحکم ہے کہ ایک کا تعلق دوسرے سے ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔

نظامِ کائنات

☆ لیکن میرے دوستو! اگر اس تمام نظام کو ہم قضیہ اتفاقیہ قرار دے دیں تو خوب سمجھ لیجئے کہ جو عمل اتفاقاً ہو جائے اس کے اندر نظم و ضبط نہیں ہوا کرتا۔ یہ ارتباط اس بات کی دلیل ہے کہ کسی ارتباط پیدا کرنے والے نے ارتباط پیدا کیا ہے۔ کسی نظام قائم کرنے والے نے نظام قائم کیا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب آپ بازار میں چلتے ہیں تو آپ کس انداز سے چلتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کی رفتار غلط نہ ہو، آپ کا قدم زیادہ آگے نہ بڑھ جائے۔ آپ چھوٹا قدم نہ اٹھائیں، اتنی تیزی سے نہ بھاگیں کہ لوگ دیکھ کر آپ پر ہنسنے لگیں اور نہ اتنے آہستہ چلیں کہ لوگ سمجھیں کہ شاید زمین پر چپکے ہوئے ہیں تو آپ اتنا آہستہ نہیں چلتے، اتنا تیز نہیں چلتے، قدم آپ کا نہایت ہموار ہوتا ہے اور آپ کے جسم کی حرکات بالکل معتدل ہوتی ہیں اور آپ کے جسم کے تمام اعضاء بالکل اعتدال کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں۔ آپ تو بڑے نظم کے ساتھ چل رہے تھے، لیکن اتفاقاً اگر چلتے چلتے اندھیرے میں کہیں کیچڑ آ گئی اور آپ کو پتہ نہ چلا یا اتفاق سے کہیں کیلے کے چھلکے پر پاؤں پڑ گیا اور دھڑام سے آپ گر پڑے تو ایمان سے کہنا کہ آپ کا گرنا اتفاقی ہے یا نہیں......! اب اس گرنے کو قضیہ اتفاقیہ کہیے اور اس نظم و ضبط کے ساتھ چلنے کو آپ مربوط نظام کے تحت لائیے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ جب آپ گریں گے تو گرنا تو اتفاقی ہے نا۔ لیکن گرنے میں کیا وہ نظم و ضبط باقی رہے گا......؟ بتائیے! اگر اس منظم کائنات کا اتفاقیہ مان لیا جائے تو پھر گرنے میں نظم و ضبط ہونا چاہیئے۔ کیونکہ کائنات کا نظم و ضبط تو ہمارے سامنے ہے۔ اس لحاظ سے گرتے وقت آپ خوب سنبھل کر گریں کہ پاؤں جہاں ہونے چاہئیں، وہیں ہوں، ہاتھ بالکل غیر محل پر نہ ہوں اور پاؤں بالکل نامناسب جگہ پر نہ ہوں اور سر کہیں ایسی نامناسب جگہ پر نہ ہو، جہاں سر کی توہین ہو جائے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ سر جہاں پڑ گیا پڑ گیا، ہاتھ جہاں گر گئے، گر گئے اور پاؤں جہاں پڑے گئے پڑ گئے، کوئی اس کے اندر نظم و ضبط نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ جو قضیہ اتفاقیہ ہوتا ہے، اس میں نظم و ضبط نہیں ہوا کرتا۔ چونکہ ساری کائنات میں نظم و ضبط ہے، اس لئے پتہ چلا کہ جہاں نظم و ضبط نہ ہو وہ اتفاقی بات ہوتی ہے اور جہاں نظم و ضبط ہو وہ کسی پیدا کرنے والی کی پیدائش پر ہوا کرتی ہے اور کسی ضبط قائم کرنے والے کی انضباط پر ہوا کرتی ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ کائنات کے ذرے ذرے کو دیکھو اور نظام قائم کرنے والے کی دلیل قائم کر کے اس ہستی کو پہچانو۔ کائنات کا ہر نظام دعویٰ ہے اور نظم اس کی دلیل ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ مادے اندر خواص ہوتے ہیں۔ پانی جو ہے وہ بارد، راطب ہے۔ آگ جو ہے وہ حار، یابس ہے۔ حار کے معنی ہیں گرم اور یابس کے معنی ہیں خشک، بارد کے معنی ہیں ٹھنڈا اور راطب کے معنی ہیں تر۔ آگ اور پانی دونوں متضاد ہیں۔ ایک خشک ہے دوسرا تر ہے۔ ایک گرم ہے، دوسرا سرد ہے لیکن یہ دونوں طرح کے اثرات مادہ اپنے گھر سے نہیں لایا۔ آگ کو حرارت دینے والا وہ خدا ہے جس

نے اپنے ابراہیم علیہ السلام کے لئے فرمادیا

یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلَامًا عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ

☆ کیونکہ حرارت میں نے دی ہے، اس لئے جب چاہوں گا، حرارت رکھوں گا، جب چاہوں گا سلب کرلوں گا۔ پانی کے اندر جو خواص رکھے ہیں، میں نے رکھے ہیں۔ پانی کا کام ہے سیال ہونا۔ لیکن میں جب چاہوں گا، کہہ دوں گا کہ اے نیل! ٹھہر جا میرے کلیم گزرنے والے ہیں۔ پانی کا سیلاب، پانی کی سیالی، پانی کا بہنا، یہ میری دی ہوئی صفت ہے۔ یہ نہیں کہ وہ مادے کا اپنا ذاتی خاصہ ہے بلکہ میری پیدا کی ہوئی ہے تو جو چیز میری پیدا کی ہوئی ہے، وہ پیدا کرنے سے پہلے بھی میری قدرت میں تھی اور پیدا کرنے کے بعد بھی میری قدرت میں ہے۔ میں چاہوں تو اس کو باقی رکھوں اور چاہوں تو فنا کر ڈالوں۔

☆ یہ ہے وہ بنیادی نکتہ جس پر سارے علم کا دارومدار ہے۔ اس لئے میں کہوں گا کہ سائنس کا علم غیر اسلامی نہیں ہے۔ آپ دنیا کے کسی علم کو لے لیں، وہ ریاضیات سے متعلق ہو یا ارضیات سے، فلکیات سے متعلق ہو یا وہ علم حقائق کائنات سے متعلق ہو۔ وہ علم اثرات وخواصِ اشیاء سے متعلق ہو یا کائنات کا کوئی بھی علم ہو، میں کہتا ہوں کہ ہر علم اسلامی ہے۔ مگر اسلامی جب ہوگا کہ جب ہر چیز کو جان کر اور ہر علم کو حاصل کر کے خدا کا علم حاصل کیا جائے۔ آپ سائنس پڑھیں یا ریاضی، آپ جغرافیہ پڑھیں یا تاریخ، ان تمام علوم کا جو مرکز ومحور ہو تو وہ خدا کی معرفت ہو اور خدا کی ذات پر یقین ہو۔ یہ ایک بنیادی بات ہے۔ اگر آپ نے اپنی اسلامی تعلیمات کے محور کو چھوڑ دیا تو آپ کے ذہن کو آوارہ کر دیا جائے گا۔

☆ اسلامی تعلیمات کا مقصد صرف یہی نہیں کہ آپ قرآن کے ترجمہ کے سوا کچھ نہ پڑھیں۔ آپ قرآن کا ترجمہ بھی پڑھیں اور جن چیزوں کا ذکر آپ نے قرآن میں پڑھا، ان کی حقیقتوں کو جاننے کے لئے آپ جدید علوم کی طرف بھی توجہ کریں۔ قرآن نے کہا

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ

☆ تو تم آسمان کی حقیقتوں کو جاننے کے لئے جیسی بھی جدوجہد کرو گے وہ بھی اسلامی اور قرآنی علم قرار پائے گا۔ آسمان سے رات کو آنے والے جو لطیف اثرات ہیں، جو زمین کے کرہ میں پیوست ہوتے ہیں اور پھر اس سے معدنیات کا ظہور ہوتا ہے۔ کہیں نباتات کا ظہور ہوتا ہے۔ کہیں سنکھیا پیدا ہو رہی ہے۔ کہیں تریاق پیدا ہو رہا ہے۔ کہیں لوہا پیدا ہو رہا ہے اور کہیں کوئلہ پیدا ہو رہا ہے۔ اسی زمین میں لوہے کی کانیں ہیں۔ کہیں سونے کی کانیں ہیں۔ کہیں چاندی کی کانیں ہیں۔ کہیں سے پٹرول نکل رہا ہے۔ یہ جتنی چیزیں ہیں، یہ سب "وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ" کے اندر مذکور ہیں۔ تو جب آپ قرآن کے لفظ ومعنی دونوں کو پڑھیں تو پھر جو کچھ آپ نے قرآن میں پڑھا، اس کی ماہیت کو پہچاننے کے لئے آپ علوم جدیدہ کو اختیار کریں۔ آپ کا ہر علم اسلامی قرار پائے گا۔ جب تک آپ کا مرکز قرآن ہوگا۔

عزیز طلبا! آپ کا ایک بہت بڑا مقام ہے۔ آپ کو چاہیے کہ خود اپنے ذہن کو علم کے نور سے روشن کریں اور اس روشنی سے قوم کے ذہن کو روشن کریں۔ قوم کا بہترین سرمایہ تم ہو۔ آج اگر ہمارے عزیز طلبا کے اندر کچھ کوتاہیاں ہیں تو یہ صرف میرے عزیز طلبا کا قصور نہیں اور نہ

والدین کا قصور ہے، یہ اس گہوارے کا قصور ہے جس گہوارے کے اندر ہمارے طلباء کو تربیت دی گئی ہے۔ کیونکہ گہوارے کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہماری قوم کی ماؤں اور بہنوں کی گود میں امام ابو حنیفہ جیسے لعل کھیلا کرتے تھے۔ ایک وہ دور تھا کہ ہماری قوم کی ماؤں اور بہنوں کی گود میں امام غزالی جیسے بچے پیدا ہوتے ہیں، غزالی، رازی، بوعلی سینا، بڑے بڑے فلسفی اور حکماء، بڑے بڑے علماء، صوفیاء، زہاد، عباد اور محدثین ومفسرین، یہ سب ہماری قوم کی ماؤں کی گودوں میں تربیت پانے والے ہوئے۔ تصوف کی طرف آیئے۔ حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ کیسی مقدس ہستی ہیں۔ اسی قوم کی ماؤں اور بیٹیوں نے ایسے بچوں کو جنم دیا اور اپنی مبارک آغوش میں پالا اور اپنی تربیت سے ان کے ذہنوں کو روشن کیا۔

☆ عزیزانِ گرامی! یاد رکھیے کہ ہماری تربیت کا جو گہوارہ ہے وہ بھی بڑا غلط ہے۔ گہوارے کے اثرات کے متعلق مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آیا۔ حضرت عمر فاروق کی خلافت کا زمانہ ہے۔ عیسائی سلطنت روم کو فتح کرنے کے بعد مجاہدین نے روم کی گوری چٹی عیسائی عورتوں سے نکاح کرنا چاہا۔ امیرِ لشکر کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ میں تم کو اجازت نہیں دوں گا۔ حالانکہ قرآن کی رو سے جائز ہے۔ لیکن بہت سی جائز چیزیں بعض اوقات مضر ہو جاتی ہیں۔ مثلاً انار کھانا کوئی حرام نہیں، جائز ہے لیکن ایک شخص ایسے مرض میں مبتلا ہے کہ انار کھائے تو اس کو بہت نقصان پہنچے گا۔ اس لئے ڈاکٹر منع کرے گا کہ انار مت کھانا۔ حالانکہ وہ جائز ہے۔ اسی طرح بیشک عیسائی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ مگر بعض حالات ایسے ہوتے ہیں، بعض ماحول ایسے ہوتے ہیں کہ جائز چیز اس میں مضر ہو جاتی ہے۔ تو امیر لشکر نے کہا کہ میں تم کو اجازت نہیں دوں گا۔ جب تک امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب سے مشورہ نہ لے لوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا گیا تو آپ نے جواب دیا۔ کیا پیارے الفاظ ہیں۔ فاروقِ اعظم آپ پر خدا کی کروڑوں رحمتیں نازل ہوں۔ فاروقِ اعظم نے فرمایا کہ خدا کی قسم! عمر خدا کے حلال کو حرام نہیں کر سکتا اور خدا کے حرام کو حلال نہیں کر سکتا جو اللہ نے حلال کیا، اللہ کے رسول نے حلال کیا حلال ہے لیکن اے میرے عرب کے مجاہدو اور بہادرو! میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم روم کی گوری چٹی عیسائی عورتوں سے نکاح نہ کرو، اس لئے کہ اگر تم نے ان سے نکاح کیا تو ہوگا یہ کہ بچے تمہارے ہوں گے اور ان کی گودوں میں پلیں گے۔ فاروقِ اعظم نے فرمایا کہ تم ایسا نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارے بچے جب روم کی عورتوں کی آغوش میں تربیت پائیں گے تو مجھے خطرہ ہے کہ کہیں عرب کی تہذیب روم میں گم نہ ہو جائے۔

☆ اس واقعہ سے یہ بتانا مقصود تھا کہ تربیت کے ماحول کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ ہمارے عزیز طلباء کے اندر بڑی اچھی اچھی صلاحیتیں ہیں اور اگر یہ صلاحیتیں نہ ہوتیں تو وہ طلبِ علم کے میدان میں کیسے آتے، ان کا طلبِ علم کے میدان میں آنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے اندر بڑی بڑی عظیم صلاحیتیں موجود ہیں۔ اب اس کے باوجود بھی اگر کچھ کوتاہیاں پائی جاتی ہیں تو ان سب کو طلبا کے سر نہ تھوپا جائے بلکہ ان کو یہ بتایا جائے کہ جس آغوش میں یہ پل کر آئے ہیں، اس آغوش میں کچھ خامیاں ہیں۔ ہماری قوم کے وہ ماں باپ جن کی گود میں پل کر یہ بچے طالبِ علمی کی صف میں آئیں ان کا کردار ایسا پیارا ہو، ان کی آغوش اتنی پاک ہو کہ اس آغوش میں پلے

ہوئے بچے آگے چل کر قوم کی کایا پلٹ دیں۔

☆ عزیز طلبا! اگر تمہارا ذہن گمراہ ہو گیا تو یقین کرو کہ ساری قوم گمراہ ہو جائے گی۔ اگر تمہارا دماغ روشن نہ ہوا تو قوم کا دماغ روشن نہیں ہو سکتا۔ اگر تمہارا کردار غلط ہوا تو قوم کا کردار صحیح نہیں ہو سکتا۔ قوم کے کردار کو تم نے بچانا ہے۔ قوم کے دماغ کو تم نے روشن کرنا ہے، ملک کا مستقبل تمہارے دامن سے بندھا ہوا ہے۔ تمہاری قوم کی فلاح، تمہاری قوم کی نجات، تمہاری قوم کی ذہنی نشو ونما اور تمہاری قوم کے تمام ذہنی ارتقاء کا دار و مدار تمہارے اپنے ذہنی ارتقاء پر ہے۔ قوم کے کردار کا مدار تمہارے اپنے کردار پر ہے۔ اس لئے تمہارا ذہن روشن ہونا چاہئے اور تمہارا کردار بلند ہونا چاہئے۔ تم اپنی اس روشن دماغی اور خوش کرداری کے ساتھ اپنی قوم کی وہ بہترین خدمت انجام دے سکتے ہو کہ جو خدمت معاشرے میں کوئی دوسرا گروہ انجام نہیں دے سکتا، تم اپنے ملک کی فلاح کے لئے، اپنی ملت کی فلاح کے لئے، اپنی قوم کی فلاح کے لئے وہ سب کچھ کر سکتے ہو جو تمہارے سوا کوئی اور گروہ نہیں کر سکتا۔

☆ یہ مختصر سا میرا خطاب تھا، میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ خدا میرے عزیز طلبا کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے ذہنوں کو روشن کریں اور اپنے کردار کو بہتر بنائیں۔

فلسفۂ قربانی

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

☆ پس نماز پڑھ واسطے اپنے پروردگار کے اور قربانی کر

☆ غالباً ۵۰ء میں مروجہ قربانی کے خلاف لاہور میں ایک پمفلٹ میری نظر سے گزرا تھا جس کے مصنف نے انکارِ حدیث کو اپنے دعویٰ کی اصلی بنیاد قرار دے کر اسلام کے ایک عظیم الشان شعار یعنی مروجہ قربانی کا شدید انکار اور اس کی اشد ترین توہین کی تھی۔ نہ صرف توہین بلکہ دین دار مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا، میں نے اسی وقت نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ علم و عقل کی روشنی میں اس کا مدلل جواب لکھ کر شائع کر دیا تھا جسے اہل علم کی انصاف پسند طبائع نے بہت پسند کیا اور اسے پڑھ کر طالبانِ حق کے قلوب مطمئن ہو گئے۔

☆ اب اس کے پانچ سال بعد اسی فتنہ نے دوبارہ سر اٹھایا۔ ملک کے مشہور انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز (مجریہ ۷ جولائی ۵۵ء) نے ان ہی فرسودہ اور پامال شدہ ہتھکنڈوں سے کام لے کر اس مروجہ قربانی کے خلاف زہر اگلا ہے جو مقدس اسلام کا عظیم ترین نشان اور بہترین شعار ہے اگرچہ اس فتنہ کی اصل بنیاد حجیت حدیث کے اثبات کے بغیر ناممکن ہے اور اس کے بغیر قربانی کے موضوع پر کچھ کہنا چنداں مفید نہیں ہو سکتا لیکن سر دست حجیت حدیث پر نہایت مختصر اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے اصل موضوع پر کچھ عرض کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ العزیز اس اختصار و اجمال کی تفصیل و تشریح علیحدہ اشاعت میں بہت جلد ہدیہ قارئین کی جائے گی و ما توفیقی الا باللّٰہ العزیز

☆ پمفلٹ مذکوراور پاکستان ٹائمز کے مضمون کے بنیادی خطوط میں کوئی فرق نہیں۔ ایک دوسرے کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ اجمال وتفصیل کا معمولی سا تفاوت نظر آتا ہے۔ اصل مقصد اور اس کے طریق اثبات میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ اسی لئے پاکستان ٹائمز کے زیرنظر مقالے کے جواب میں پمفلٹ مذکور کے جواب سے کسی خاص مختلف طرزِ بیان کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اسلوب بیان کے معمولی تفاوت کے ساتھ اسی جواب سابق کے اہم اجزا اور اصولی ابحاث شائع کردینا کافی سمجھتا ہوں۔ البتہ حسب ضرورت بعض مقامات پر چند مفید امور کا اضافہ کردیا جائے گا

☆ پاکستان ٹائمز کے مقالہ نویس نے تو بہت اختصار واجمال کے ساتھ کلام کیا ہے لیکن پمفلٹ کے مؤلف نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس پمفلٹ میں بتایا گیا ہے کہ ہر ہر شہر وقریہ میں قربانی منشاءِ قرآن نہیں۔ قربانی صرف مکہ میں ہونی چاہئے۔ وہ بھی اتنی ہی جتنی استعمال میں آسکے۔ زائد خلافِ قرآن ہے۔ خلافِ ایمان ہے اور خلافِ عقل ہے۔ جانور کے علاوہ نقد وجنس، صدقہ اور روزہ بھی وہی درجہ رکھتے ہیں۔ مسلمان جو روپیہ قربانی پر صرف کرتے ہیں اس کی وجہ سے روز بروز زیادہ سے زیادہ پلیدی، گندگی، عذاب اور سزا کے مستوجب ہوتے جاتے ہیں۔ قربانی کرنیوالے تمام مسلمان عقل سے بیزار اور بے ایمان ہیں۔ مسلمان قوم کا کروڑہا روپیہ جو ہر سال قربانی پر بے جا صرف ہوتا ہے اگر کشمیر فنڈ یا استحکام پاکستان یا امدادِ مہاجرین وغیرہ قومی ترقی وملکی ضرورتوں پر خرچ کیا جائے تو کیا اچھا ہو۔

☆ پمفلٹ مذکور میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قربانی کی مروجہ صورت بالکل بے سود بلکہ سخت نقصان کا موجب ہے۔ قربانی سے نسل ضائع ہوتی ہے۔ اس لئے قربانی کرنے والے مفسد ہیں۔ قربانی اسراف وتبذیر ہونے کے علاوہ قوم کی صحت کے لئے بھی نہایت مضر ہے۔ پمفلٹ زیرنظر میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ مروجہ قربانی قطعاً خلافِ عقل وحکمت ہے۔ مضمون نگار صاحب نے قرآن کریم کو اپنے مذکورہ بالا خیالات کا مؤید قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن حکیم نے صرف مکہ کو قربان گاہ قرار دیا ہے تا کہ ایام حج میں غذائی سہولتیں بہم پہنچ سکیں۔ قربانی صرف حاجیوں پر ہے وہ بھی ہر حاجی پر نہیں بلکہ جس حاجی کو مندرجہ ذیل تین وجوہات میں سے کوئی وجہ درپیش ہوجائے اسی پر قربانی لازم ہے جن کی تفصیل یہ ہے

(۱) حج کا ارادہ کرنے کے بعد کسی مرض یا دشمن کی وجہ سے رک جانا

(۲) ارکانِ حج کی تکمیل سے پہلے کسی مرض یا خاص تکلیف کی وجہ سے سر منڈانا

(۳) حج وعمرہ ملاکر کرنا

☆ ان وجوہات کے علاوہ کسی وجہ سے کسی پر قربانی لازم نہیں ہوتی پھر ان صورتوں میں بھی یہ لازم نہیں کہ قربانی ہی دے بلکہ حسب توفیق کچھ ہدیہ نقد وجنس کی قسم سے کعبہ فنڈ میں بھیج دے یا روزے رکھ لے۔ قربانی کا وجوب روزہ وصدقہ سے قطعاً زیادہ نہیں مؤلف صاحب نے سورۂ بقرہ، سورۂ مائدہ اور سورۂ حج کی آیتوں کا حوالہ دے کر اپنے اس بیان کی تائید کی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ صحاحِ ستہ کی متفقہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینے سے مکہ اپنی قربانی کے جانور بھیجتے تھے اور بقول ابن عباس آنحضرت ﷺ نے حدیبیہ

کے سال بہت سے اونٹ مکہ کو بھیجے اور بقول نافع ابن عمر بھی اپنے قربانی کے جانور کو کعبہ میں بھیجا کرتے تھے۔

☆ زیر نظر پمفلٹ کے مضمون کا یہ خلاصہ تھا جو ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ مضمون نویس صاحب نے اس بیان میں شعائر دین کی تضحیک و تمسخر اڑانے میں بھی کسی قسم کی کوتاہی نہیں فرمائی۔ بخوفِ طوالت میں نے ان جملوں کو نقل نہیں کیا۔

☆ مسئلہ قربانی پر اظہار خیال سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ مؤلف صاحب کی اصولی غلط فہمیوں کا ازالہ کردوں تا کہ مسئلہ کا ہر پہلو بے نقاب ہو جائے اور اصل مقصد تک پہنچنا آسان ہو۔ اس ضمن میں چند بنیادی چیزیں ہیں جن کے بغیر کسی شرعی مسئلہ کا حل ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ سب سے پہلے اس امر کا لحاظ ضروری ہے کہ قرآن کریم ایک ایسا جامع قانون ہے جو تمام دینی و دنیوی ضروریاتِ انسانیہ پر مشتمل مسائل کو حاوی ہے۔ ہر مسئلہ کی اصل قرآن حکیم میں موجود ہے لیکن مسائل کی تفصیلات کے لئے ہمیں اس قانون کی تشریح درکار ہے۔ ظاہر ہے کہ صاحب قانون ہی اپنے قانون کی تشریح کا حق رکھتا ہے۔ لہٰذا عقل سلیم کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس معبودِ حقیقی نے اپنے رسول پر قرآن نازل کیا ہے اس نے اس کی تشریح بھی بذریعہ وحی اپنے رسول پر اتاری ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اس کو حکمت سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" (آل عمران: ۱۶۴) کتاب قانون ہے اور حکمت اس کی تشریح جسے دوسرے لفظوں میں حدیث سمجھ لیجئے۔

☆ اسی طرح سورۂ حشر میں فرمایا "وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔" (حشر: ۷) جو کچھ رسول دے وہ لے لو اور جس سے وہ روک دے اس سے باز آ جاؤ۔

☆ سورۂ تحریم میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک راز کی بات کہی، انہوں نے اس کا افشاء کر دیا۔ حضور ﷺ نے ان کی کہی ہوئی ایک بات انہیں بتائی تو حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بولیں من انبأک ھذا؟ آپ کو کس نے بتا دیا کہ میں افشاء راز کیا ہے؟ تو آنحضرت سرورِ عالم ﷺ نے جواب دیا نبانی العلیم الخبیر مجھے علیم خبیر نے خبر دی۔ اگر قرآن کے علاوہ وحی الٰہی کا انکار صحیح مان لیا جائے تو قرآن سے آیت نکالئے جس میں اس بات کا ذکر ہو کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آنحضرت ﷺ کا راز فاش کر دیا لیکن قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت موجود نہیں جس میں اس خبر کا تذکرہ ہو۔ معلوم ہوا کہ نبانی العلیم الخبیر میں جس چیز کا ذکر ہے وہ قرآن میں نہیں بلکہ حدیث میں ہے جو درحقیقت وحی الٰہی ہے۔

☆ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔" (ال عمران: ۳۱) حبیب! کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع (پیروی) کرو تم اللہ کے محبوب ہو جاؤ گے۔

☆ ہر شخص جانتا ہے کہ رسول کی پیروی ناممکن ہے جب تک ان کے اقوال و افعال، اخلاق و سیرت کی تفصیلات ہمارے لئے علم میں نہ ہوں۔ ان ہی کے مجموعہ کو حدیث کہتے ہیں۔

☆ نیز قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا "وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔" (النساء: ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی

اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

☆ اطاعت قول و فعل کی ہوتی ہے اور رسول کا قول و فعل حدیث ہے۔ معلوم ہوا کہ حدیث پر عمل کرنا عین عمل بالقرآن ہے اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ قرآن مجید میں صاف اور غیر مبہم الفاظ میں فرمادیا "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى۔" (النجم : ۳، ۴) رسول اپنی خواہش سے نہیں بولتا ان کا بولنا وحی الٰہی میں منحصر ہے۔

☆ قرآن حکیم میں رسول اللہ ﷺ کو معلوم کتاب قرار دینے کے یہی معنی ہیں کہ بیان رسالت کے بغیر فہم قرآن ممکن نہیں۔ یہ امر کہ حدیث میں وضع وجعل پایا جاتا ہے اس لئے وہ معتبر نہیں۔ تو مجھے اس اعتراض کرنے والوں کی بے بصری پر انتہائی افسوس ہوتا ہے۔ ہر ادنٰی سمجھ والا انسان اس حقیقت کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ جس قانون کی تشریح دنیا میں موجود نہ ہو وہ قانون کس کام کا ہے۔ جب قرآن کریم سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول معلم کتاب ہے، رسول کی پیروی فرض ہے، رسول کا بولنا وحی الٰہی ہے، رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، رسول کا بیان قرآن کی تشریح ہے۔ تو اب جعل و وضع کی آڑ میں حدیث رسول کو لایعنی ذخیرہ کہہ کر رد کر دینا قرآن کریم کو نا قابل عمل قرار دینا نہیں تو اور کیا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ واضعین کاذبین نے روایات کاذبہ موضوعہ بنانے میں کمی نہیں کی لیکن یہ بھی صداقت رسول کی روشن دلیل بلکہ ہادیٔ عالم کا روشن ترین معجزہ ہے کہ بے پناہ کذب و وضع کی ظلمتوں کے باوجود بھی رسول معظم نورِ مجسم ﷺ کی چمکتی ہوئی ادائیں اہل بصیرت کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو سکیں اور پرکھنے والوں نے کھوٹے کھرے کو پرکھ کر موضوع کو غیر موضوع سے اور صحیح کو ضعیف سے ممتاز کر ہی لیا۔ کذب و افتراء و وضع و جعل کی تاریکیوں میں بھی اس نورِ مجسم ﷺ کی ادائیں چمکتی ہی رہیں۔ علم الاسناد اسماء الرجال اصول حدیث سے ادنٰی تعلق رکھنے والے انسان کو ایک آن کے لئے بھی اس بیان میں شک نہیں ہو سکتا۔ راویان حدیث کی چھان بین، شرائط صحت کی پابندی اور محدثین کرام کی احتیاط پر تفصیل سے گفتگو کی جائے تو بڑے بڑے دفتر پر ہو جائیں۔ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش کہیں کہاں؟ اس مقام پر بس اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اداؤں کو محفوظ رکھنا قانونِ قدرت کے مطابق تھا۔ اس لئے قدرت نے سیرۃ رسول ﷺ کے تحفظ کی خاطر وہ انتظام کیا کہ پانچ لاکھ انسانوں کو ادائے حبیب کا نقشہ اتارنے اور اس کو محفوظ کرنے کے لئے متعین کر دیا۔ یوں کہیے کہ سابقہ آسمانی کتابوں کو اس طرح محفوظ رکھنے کا سامان مہیا نہیں کیا گیا جس طرح سیرت رسول ﷺ کی حفاظت کے لئے اسباب پیدا کیے گئے۔ جس کی وجہ صرف یہی تھی کہ تمام کتب سابقہ کی حقیقتیں قرآن میں رکھ دی گئی تھیں اور قرآن پر عمل کرنا ناممکن تھا جب تک کہ معلم قرآن کی سیرت سامنے نہ ہو۔ اس لئے سیرت رسول ﷺ کا تحفظ ضروری تھا۔

☆ یہاں ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ قرآن اپنے قابل عمل ہونے میں حدیث کا محتاج ہو گیا اور قرآن کی یہ شان نہیں۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن محتاج نہیں بلکہ قرآن پر عمل کرنے کے لئے ہم حدیث کے محتاج ہیں کیونکہ قانون عمل کرنے والوں کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ عمل کرنے والے قانون کے محتاج ہوتے ہیں۔ دیکھئے خدا کی معرفت رسول کے بغیر ناممکن ہے تو اس کا یہ مطلب

نہیں کہ خدا تعالیٰ اپنی معرفت کرانے میں رسولوں کا محتاج ہے۔ نہیں بلکہ معرفت خداوندی حاصل کرنے کے لئے ہم رسولوں کے محتاج ہیں۔ اس سلسلہ میں مجھے یہ بات بھی بتانی ہے کہ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ جو حدیث قرآن کے موافق ہو وہ قبول کی جائے گی اور جو روایت نص قرآنی کے خلاف ہو وہ مردود قرار پائے گی۔ اس مسئلہ میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں کہ خلافِ قرآن کوئی روایت قابل قبول نہیں۔ لیکن موافق اور مخالف کا مفہوم کیا ہے؟ کون سی حدیث کو قرآن کے موافق کہیں گے اور کس کو مخالف قرآن قرار دیں گے؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب منکرین حدیث کے نظریہ کے موافق صرف یہ ہے کہ جو بات قرآن میں مذکور نہیں اگر کسی حدیث میں اس کا ذکر آجائے تو وہ حدیث قرآن کے مخالف ہے اور اگر ایسی صورت ہو کہ جس بات کا ذکر قرآن میں ہے بعینہٖ اسی کا ذکر بغیر کسی فرق کے حدیث میں بھی ہے تو وہ حدیث قرآن کے موافق ہوگی۔

☆ لیکن قائلین حدیث کے نزدیک مخالف وموافق کا یہ مفہوم قطعاً غلط ہے۔ ہمارے نزدیک حدیث قرآن کی تشریح وتفسیر ہے۔ ظاہر ہے کہ متن وشرح کے الفاظ وعبارات میں کوئی فرق نہ ہو تو دونوں میں کیا امتیاز ہوگا؟ اور ایسی صورت میں شرح وتفسیر سے کیا فائدہ مرتب ہوسکتا ہے؟ ہمارے نظریہ کے مطابق وہ حدیث قرآن کے مخالف قرار پائے گی جس میں قرآن مجید کی کسی نفی یا نہی صریح کے مقابلہ میں اثبات یا امر پایا جائے یا مضمون قرآن کی تردید ہوتی ہو۔ مثلاً قرآن میں ہے "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" اگر کسی روایت میں "لَا تُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" آجائے تو وہ روایت قرآن کے خلاف ہوگی اور اگر کسی روایت میں قرآن کی تشریح وتفسیر ہو تو اس کو قرآن کے مخالف کہنا انتہائی گمراہی اور بے دینی ہے۔ دیکھئے قرآن کریم نے "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" فرمادیا لیکن "اقامۃ الصلٰوۃ" کی تمام تفصیلات بیان نہیں فرمائیں کہ کس نماز کی کتنی رکعتیں ہوں، کون سی نماز آہستہ پڑھی جائے، کون سی بلند آواز سے ادا کی جائے وغیرہ وغیرہ۔ تو اب جن احادیث میں یہ تفصیلات مذکور ہیں وہ قرآن کے مخالف نہیں بلکہ اس کی تفسیر وتشریح ہیں۔ مضمون نگار کی سب سے پہلی اصولی غلط فہمی یہ ہے کہ انہوں نے مروجہ قربانی کے متعلق تمام احادیث کو قرآن کے مخالف سمجھا حالانکہ وہ قرآن کے کسی مضمون کی تردید نہیں کرتیں بلکہ ایک قرآنی حکم کی تشریح وتفسیر کررہی ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ۔" (کوثر : ۲) حبیب! اپنے رب کے لئے نماز پڑھو اور اسی کے لئے قربانی کرو۔

☆ جس طرح نماز کی تفصیلات قرآن کریم میں نہیں اسی طرح قربانی کی تفصیلات بھی قرآن حکیم میں نہیں ہیں۔ حدیث میں دونوں کی تشریح وتفسیر کی گئی ہے۔ اگر قربانی کی حدیثیں قرآن کے مخالف ہیں تو تفاصیل صلوٰۃ کی حدیثوں کو بھی خلافِ قرآن کہنا چاہیے پھر اگر کوئی دریدہ دہن کہہ اٹھے کہ میں نماز کے متعلق حدیثوں کو بھی قرآن کے خلاف سمجھتا ہوں تو اس سے کہا جائے گا کہ اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو احادیث صلوٰۃ سے الگ رہتے ہوئے نماز پڑھ کر دکھا؟ جس صورت سے تو اقامۃ الصلوٰۃ کرے گا اس صورت کو قرآن کی عبارۃ النص سے ثابت کرنا ہوگا لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ احادیث سے قطع نظر کرکے کوئی شخص نہ نماز پڑھ سکتا ہے نہ روزہ رکھ سکتا ہے نہ حج کرسکتا ہے نہ زکوٰۃ دے سکتا ہے، حتیٰ کہ ایمان جو تمام عبادات کا اصل ہے بغیر استعانت بالحدیث کے حاصل نہیں کرسکتا۔

بہرحال جس چیز کا ذکر صریح قرآن میں نہ ہو اور حدیث میں اس کی تفصیلات مذکور ہوں تو اس حدیث کو قرآن کے مخالف قرار دینا گمراہی کی بنیاد ہے۔ دیکھئے قرآن عظیم میں خنزیر کے گوشت کے علاوہ کسی چیز کو حرام نہیں کہا۔ حرمت خنزیر کا ذکر جہاں بھی آیا ہے وہاں "لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ" کا لفظ ہے تو مؤلف صاحب کو چاہئے کہ "لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ" کے علاوہ خنزیر کے تمام اجزاء کو حلال طیب تصور فرمائیں اور جو شخص اس کی چربی وغیرہ کی حرمت کا قول کرے اس کی بات کو خلافِ قرآن قرار دے کر اعلان کر دیں کہ چونکہ قرآن کریم میں صرف "لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ" فرمایا ہے اس لئے سوائے گوشت کے خنزیر کی ہر چیز حلال اور پاک ہے۔

☆ قرآن کریم نے کتے، بلی، چوہے وغیرہ حشرات الارض اور سباع بہائم وطیور کی حرمت کی تفصیلات کسی جگہ بیان نہیں کیں۔ احادیث میں ان چیزوں کا حرام ہونا تفصیل سے مروی ہے۔ اس مسئلہ میں بھی مضمون نویس صاحب کا فرض اولین ہے کہ ان تمام احادیث کو خلاف قرآن قرار دے کر کتے، بلی، چوہے وغیرہ تناول فرمانے لگیں اور ملک کے اصحاب بصیرت وارباب حکومت سے التجا کریں کہ یہ لوگ جو بکریاں، بھیڑیں خریدنے اور ان کا گوشت کھانے پر کروڑوں روپیہ صرف کر رہے ہیں سب اسراف وتبذیر گندگی ہے۔ یہ لوگ عذاب وسزا کے مستوجب ہیں کیوں نہیں مفت کا گوشت حاصل کرتے؟ کسلئے ان جانوروں کو بلاوجہ ضائع کر رہے ہیں؟

☆ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں مضمون نویس صاحب کتے، بلی، چوہے وغیرہ حرام جانوروں اور خنزیر کی چربی وغیر کو حرام ہی جانتے ہوں گے حالانکہ ان کی حرمت قرآن میں مذکور نہیں بلکہ حدیث میں مروی ہے۔ اگر میرا حسن ظن درست ہے تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں کہ وہ قربانی جس کا حکم قرآن حکیم میں موجود ہے صرف اس کی تفصیلات احادیث میں مذکور ہوئی ہیں اس کو تو خلافِ قرآن قرار دیں اور جن جانوروں کی حرمت کا قرآن کریم میں کسی جگہ کوئی ذکر نہیں بلکہ ان کی حرمت کے ثبوت کا دارومدار صرف احادیث پر ہے اس کی صحت وثبت پر ایمان لے آئیں۔

ایں چہ بوالعجبی ست

☆ الغرض مؤلف صاحب قربانی کے مسئلہ میں احادیث صحیحہ کثیرہ اور تمام امۃ مسلمہ کے تعامل کو نظر انداز کر کے ایک زبردست غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ اگر وہ میرے بیانِ سابق پر غور کریں تو مجھے امید ہے کہ اپنے خیالات سے رجوع کر لیں گے۔

☆ دوسری بنیادی غلطی جس پر مؤلف صاحب کا سارا زورِ بیان ختم ہو گیا ہے مروجہ قربانی کے خلاف عقل وحکمت ہونا ہے۔

☆ اس کے متعلق مضمون نگار صاحب نے جو کچھ حوالہ قلم کیا ہے وہ ان کی اپنی کج فہمی اور کوتاہ اندیشی کا مظاہرہ ہے۔ وہ کون سا مسلمان ہے جو قرآن واسلام کو خلافِ عقل سمجھتا ہے؟ ہمارا ایمان ہے کہ تمام تعلیماتِ اسلامیہ عقل سلیم کے مطابق ہیں لیکن درجات کا تفاوت ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ مسائل شرعیہ کے مطابق عقل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ نسل انسانی کے ہر گروہ اور ہر فرد کی عقل و سمجھ کے مطابق ہوں، بکثرت مسائل عقلیہ ایسے ہیں جو عقل سلیم کے معیار پر صحیح اترنے کے باوجود بھی عقلاء میں مختلف فیہ ہیں۔ جس کی وجہ مراتب عقل کے تفاوت کے سوا کچھ نہیں۔ تمام کائنات میں سب سے زیادہ کامل العقل انبیاء علیہم السلام ہیں ان کے بعد جس کو بارگاہِ

نبوت سے جس قدر زیادہ قرب ہے اسی قدر وہ زیادہ عقل کا حامل ہے۔ بارگاہِ نبوت سے صادر ہونے والے حکم کو اگر ہم ناقص عقل کے ترازوں میں تولیں گے تو ممکن ہے کہ اس کا وزن ہمیں صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکے۔ ایسی صورت میں بجائے اس کے کہ ہم اس حکم کو خلافِ حکمت قرار دیں اپنی عقل کے ناقص ہونے کا اقرار کرلیں تو ہمارے ایمان اور سلامتی عقل کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم نازل کر کے ہماری عقلوں کو بھی آزمایا ہے۔ جو لوگ تعلیمات نبوت کے مقابلہ میں اپنی ناقص عقل پر اعتماد کرتے ہیں وہ اس امتحان میں کامیاب نہیں ہوتے۔ مسئلہ معراج میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مشہور واقعہ اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر رہا ہے۔ جو شخص کسی کام کی پوشیدہ حکمت سے بے خبر ہوتا ہے وہ اس پر اعتراض کرتا ہے لیکن بندے کو خدا کے مقابلہ میں یہ جرأت کسی طرح زیب نہیں دیتی۔ اگرچہ اس کی بعض حکمتیں ضرور ہم سے پوشیدہ ہیں لیکن جب اس کے حکیم مطلق ہونے پر ہمارا ایمان ہے تو اب ہمیں اس بات کی کوشش نہیں کرنی چاہئے کہ ہم اس کی حکمت کو خواہ مخواہ دریافت کریں۔ ممکن ہے کہ اس کا دریافت کرنا حکیم مطلق کی منشاء کے خلاف ہو۔ اسی لئے "اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" فرما کر ایمان بالغیب لانے والوں کی تعریف فرمائی۔

☆ پاکستان ٹائمز کے مقالہ نویس نے بڑے طمطراق کے ساتھ لکھا ہے کہ قربانی کا سنت ابراہیمی ہونا ایسی بات ہے جس کی کوئی تصدیق نہیں پائی جاتی۔

☆ جواباً عرض ہے کہ جن لوگوں کے مذہب میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بھی جائز نہیں۔ ان کے نزدیک سنت ابراہیمی کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟ ملاحظہ فرمایئے! منکرین حدیث کے مقتداء اور پیشوا غلام محمد پرویز نے اپنی کتاب معارف القرآن جلد ۴ ص ۶۲۸ پر صاف لکھا ہے کہ

☆ "اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے کسی انسان کی نہیں۔ حتیٰ کہ رسول بھی اپنی اطاعت کسی سے نہیں کرا سکتا۔" (منقول از فتنہ پرویز)

☆ رہا یہ امر کہ اس کی تصدیق پائی جاتی ہے یا نہیں؟ تو اس کے متعلق سردست اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ تصدیق کرنیوالوں کیلئے تو اسکی تصدیق اللہ تعالیٰ کے سچے رسول حضرت محمد رسول اللہ ﷺ فداہ ابی و امی کے کلام فیض ترجمان میں واضح طور پر موجود ہے۔

☆ مسند امام احمد اور ابن ماجہ میں سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ "صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے عرض کیا کہ حضور! یہ قربانیاں کیا ہیں؟" تو سرکار ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔"

☆ لیکن معترضین اس کے جواب میں بھی یہی کہیں گے کہ یہ حدیث رسول ہے ہم اسے نہیں مانتے۔ ہمیں قرآن میں اس کی تصدیق دکھاؤ۔ اس کے متعلق گزارش ہے کہ اگر تصدیق کے یہی معنی ہیں کہ جس بیان کی تصدیق مطلوب ہو اس کا ایک ایک لفظ قرآن کریم میں پایا جائے تو میں دعوے سے کہوں گا کہ مخالفین اپنے دعوے کی کوئی تصدیق قرآن مجید سے پیش نہیں کر سکتے۔

☆ مثال کے طور پر اسی مسئلہ کو لے لیجئے۔ پاکستان ٹائمز کے مقالہ نویس نے لکھا ہے کہ "ایام حج میں صرف مکہ میں قربانی ہو سکتی ہے۔"

☆ مقالہ نویس سے میں دریافت کرتا ہوں کہ اگر آپ خود اپنے ہی ارشاد کے مطابق مکہ معظمہ جا کر ایام حج میں قربانی کرنا چاہیں تو

کون سے مہینے کی کن تاریخوں میں قربانی کریں گے؟ کیا قرآن کریم سے آپ ماہِ ذیل الحجہ کے نام اور اس کی مخصوص تاریخوں کی تصدیق پیش کر سکتے ہیں؟

☆ نہیں اور یقیناً نہیں۔ پھر آپ ہی بتایئے کہ آپ کا دعویٰ خود آپ ہی کے مقرر کردہ معیار کے مطابق کہاں تک سچا ثابت ہوا؟ اگر اس کے جواب میں آپ یہ کہیں کہ ذی الحجہ کی جن تاریخوں میں عام مسلمان حج کرتے ہیں اس کی وہی تاریخیں ایام حج قرار پائیں گی تو میں عرض کروں گا کہ اگر عامۃ المسلمین کا عمل آپ کے نزدیک کوئی دلیل شرعی ہو سکتا ہے تو مروجہ قربانی کی مخالفت آپ کیوں فرما رہے ہیں جو امت مسلمہ عہد رسالت سے لے کر آج تک ذی الحجہ کی مخصوص تاریخوں میں حج کے ارکانِ مخصوصہ مکہ میں ادا کرتی رہی؟ وہی قوم عرب وعجم، مشرق ومغرب، جنوب وشمال میں اپنے اپنے شہروں، قصبوں اور بستیوں میں قربانی کرتی چلی آ رہی ہے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امت مسلمہ کا ایک عمل آپ کے نزدیک دلیل شرعی اور قرآن کے مطابق ہے اور دوسرا صریح گمراہی اور خلافِ قرآن، حالانکہ آپ کے معیار کے مطابق دونوں کی تصدیق قرآن کریم میں موجود نہیں۔

☆ علیٰ ہٰذا القیاس مکہ معظمہ کو قربانی کی جگہ قرار دینا بھی ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی تصدیق آپ اپنے خود ساختہ معیار کے مطابق قرآن کریم سے پیش نہیں کر سکتے۔ "هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ" اور "ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ" سے آپ کا مدعا ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ "بیت عتیق" اور "کعبہ" کا ترجمہ "مکہ" نہیں کعبہ مطہرہ ایک خاص گھر اور مخصوص عمارت کا نام ہے اور مکہ ایک معظم شہر کو کہتے ہیں۔ تمام مسلمان جانتے ہیں کہ کعبہ شریف اور بیت العتیق میں آج تک کوئی قربانی نہیں ہوئی۔ لہٰذا اگر آپ کے اصول کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو لازم آئے گا کہ رسول اللہ ﷺ سے لے کر آج تک کسی مسلمان کی قربانی صحیح نہیں ہوئی بلکہ یہ سب قربانیاں معاذ اللہ خلافِ قرآن ہوئیں۔ اس لئے کہ قرآن کعبہ اور بیت عتیق کو قربان گاہ قرار دیتا ہے اور حضور ﷺ سے لے کر آج تک کسی نے کعبہ میں قربانی نہیں کی بلکہ وہاں کے تمام مسلمان منیٰ میں اپنی قربانیاں کرتے چلے آئے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ آپ کے دعوے کا وہ کون سا جزو ہے جس کی تصدیق آپ کے اصول کے مطابق قرآن مجید سے ہوتی ہو۔

☆ مقالہ نویس صاحب کے اندازِ تحریر کے پیش نظر مجھے ان سے قبول حق کی کوئی امید نہیں لیکن اپنے ناظرین کرام سے مؤدبانہ التماس کروں گا کہ وہ ازراہِ انصاف فیصلہ کریں کہ مقالہ نویس صاحب کا بیان قرآن کریم کی روشنی میں کس قدر لغو اور بے معنی ہے۔

☆ پاکستان ٹائمز کے مقالہ نویس نے جو چار باتیں لکھی ہیں ان میں سے پہلی بات کا جواب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ قربانی کے مذبوحہ جانوروں کو استعمال کرنا چاہیے۔ ان کو دفن کرنا خلافِ قرآن ہے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ قربانی کے جانوروں کے متعلق استعمال کا حکم تو قرآن کریم میں کہیں وارد نہیں ہوا۔ البتہ "اَطْعِمُوْا" فرمایا ہے جس کے معنی استعمال کرنے کے نہیں بلکہ کھلانے کے ہیں۔ استعمال کا مفہوم کھلانے کے مفہوم سے عام ہے۔ قربانی کے جانوروں کے کھانے کھلانے سے کون روکتا ہے جس کے لئے قرآن سے استدلال کی زحمت گوارا فرمائی گئی البتہ اتنی بات کا انکار کوئی اہل علم نہیں کر سکتا کہ کھانا اور کھلانا اسی وقت متصور ہو گا

جب اس سے کوئی امر مانع درپیش نہ ہوگا اور اگر کوئی امر مانع درپیش ہو جائے تو ان کو دفن کرنے کی ممانعت قرآن کریم میں کہیں وارد نہیں ہوئی بلکہ معترض نے جو "اَطْعِمُوْا" کا لفظ استعمال کیا ہے اس کے عموم میں تو دفن بھی آ سکتا ہے اس لئے کہ دفن کے بعد بھی ان جانوروں کے بوسیدہ اجزاء کو بہت سے کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے مقالہ نویس کی یہ بات بھی نا قابلِ اعتنا ہے۔

☆ تیسری بات مقالہ نویس نے یہ کہی کہ یہ قربانی خدا تک نہیں پہنچتی اور نہ اللہ تعالیٰ اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ کسی کا خون بہا جائے۔ خدا کو تو صرف پا کی مقبول ہے۔

☆ قرآن کریم میں کسی جگہ نہیں آیا کہ قربانی خدا تک نہیں پہنچتی۔ البتہ یہ ضرور فرمایا گیا ہے کہ قربانی کے جانوروں کا گوشت اور خون بارگاہِ خداوندی میں نہیں پہنچتا۔ افسوس ہمارے معترض صاحب کو اتنا بھی پتا نہیں کہ قربانی کسے کہتے ہیں؟ میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ قربانی کے جانور اور قربانی ایک چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قربانی کے جانوروں کا خون نہیں پہنچتا لیکن قربانی ضرور پہنچتی ہے۔ رہا یہ امر کہ قربانی کیا ہے؟ ہمارے معترض کو معلوم ہونا چاہئے کہ قربانی دراصل وہی تقویٰ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَلٰـکِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ" الخ کہ جانوروں کا گوشت اور خون تو میری بارگاہ میں نہیں پہنچتا لیکن تمہارا تقویٰ مجھے ضرور پہنچتا ہے لیکن یاد رکھئے تقویٰ زبانی جمع خرچ کا نام نہیں بلکہ آیت کریمہ میں تقویٰ سے یہی مراد ہے کہ محض گوشت کھانے کھلانے اور خون گرانے سے رضاءِ الٰہی حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ جانور ذبح کرنے گوشت کھانے کھلانے کا سلسلہ تو لوگوں میں ہمیشہ ہی جاری رہتا ہے جسمانی لذتوں دنیاوی عیش وطرب اور خواہشاتِ نفس کی خاطر شب وروز جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ ایسے گوشت اور خون کو رضاءِ الٰہی سے کیا تعلق؟ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی تو اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب کہ بندہ تمام لذات جسمانی اور خواہشاتِ نفسانی سے الگ ہو کر نہایت خوش دلی اور جوشِ محبت کے ساتھ قیمتی اور نفیس جانور حکم خداوندی کے ماتحت اس کے نام پر ذبح کرے اور اس فعل ذبح کے ساتھ دل میں یہ جذبہ بھی موجود ہو کہ جس طرح ہم نے یہ جانور تیرے نام پر ذبح کیا ہے اسی طرح ہم خود بھی تیری راہ میں قربان ہونے کے لئے تیار ہیں۔ یہی قربانی کی حقیقت ہے اور اسی کا نام آیت زیر بحث میں تقویٰ رکھا گیا ہے۔

☆ اس مختصر بیان سے معترض کی اس غلط فہمی کا بھی ازالہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ خون بہانے سے راضی نہیں ہوتا۔ ہم نے بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ اس خون بہانے سے راضی نہیں ہوتا جو تقویٰ کے بغیر ہو اور اگر تقویٰ کے ساتھ خون بہانا بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا موجب نہ ہو تو بقول معترض لازم آتا ہے کہ ایامِ حج میں خاص مکہ معظمہ میں بھی جانوروں کا ذبح کرنا رضائے الٰہی کے خلاف اور محض بے فائدہ ہو۔

☆ رہی چوتھی بات کہ ایامِ حج میں باہر سے جانور لا کر مکہ معظمہ میں ذبح کئے جائیں اور جس طرح حج مکہ کے سوا کہیں نہیں ہوسکتا اسی طرح قربانی بھی مکہ کے علاوہ اور کہیں نہیں ہوسکتی تو اس مسئلہ میں ان شاء اللہ العزیز آگے چل کر ہم تفصیلی گفتگو کریں گے۔ سردست اتنی بات عرض کر دینا کافی ہے کہ مکہ میں قربانی کا انکار کس نے کیا ہے جو آپ اس کو ثابت کرنے کے لئے بے سروپا گفتگو کر رہے ہیں۔ بحث تو اس امر میں ہے کہ مکہ معظمہ کے علاوہ کسی جگہ قربانی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ تو

☆ الحمد للّٰہ! آپ قرآن کریم کی ایک آیت ایسی پیش نہ کر سکے جس میں اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کے سوا دوسری جگہ قربانی کی ممانعت فرمائی ہو۔ حج کی اضافت بیت کی طرف قرآن مجید میں وارد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً۔" (ال عمران : ۹۵)

☆ لہٰذا بیت اللہ کے بغیر کسی جگہ حج نہیں ہو سکتا لیکن قربانی کی اضافت قرآن مجید میں کسی جگہ بیت اللہ یا مکہ و منیٰ کی طرف ثابت نہیں۔ اس لئے اس کو مکہ معظمہ کے ساتھ خاص کرنا قرآن مجید کی تحریف ہے۔ ہدی کے متعلق ہم بھی مانتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کی طرف منسوب ہے لیکن وہ ہدی ہے قربانی (اضحیہ) نہیں۔ ان دونوں کا فرق ان شاء اللہ دلائل کی روشنی میں آئندہ بیان کیا جائے گا۔

☆ علاوہ ازیں جن آیات سے معترضین نے قربانی کے جانوروں کا صرف مکہ میں ذبح کیا جانا سمجھا ہے ان آیات میں قربانی کے جانور (اضحیہ) مراد نہیں بلکہ وہاں تمتع، دم احصار اور دم جنایت مراد ہے جس کو مروجہ قربانی سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ آئندہ چل کر یہ تفصیل آپ کے ذہن نشین ہو جائے گی۔

☆ اب رہی مروجہ قربانی تو مضمون نویس صاحب کی نظر اس حکمت تک نہیں پہنچی۔ میں اپنے مخاطب معترض پر اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ قربانی جسے آپ خلافِ عقل کہہ رہے ہیں ملت ابراہیمی اور دین اسلام کا شعار عظیم ہے۔ اس اجمال کی تفصیل بڑی شرح و بسط کو چاہتی ہے مگر میں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اس کو بیان کرنے کی کوشش کروں گا ان شاء اللہ۔

☆ ہر مسلمان جانتا ہے کہ اصل دین توحید ہے۔ توحید کی ضد ہے شرک۔ ہمارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جس شدید ظلمت اور تاریکی کے دور میں پیدا ہوئے کسی سے مخفی نہیں۔ ملت ابراہیمی کی حقیقت کفر و شرک کی تاریکیوں میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک خدا کی بجائے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں خداؤں کی پوجا ہونے لگی تھی۔ پرستش اور بندگی کے جتنے طریقے اللہ تعالیٰ کے لئے ہو سکتے تھے وہ سب باطل خداؤں اور بتوں کے لئے مخصوص ہو چکے تھے۔

☆ عبادت کی تمام صورتیں جو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان تھیں بتوں کے لئے اختیار کی جاتی تھیں جن کا مختصر بین یہ ہے کہ مشرکین اپنے معبودانِ باطلہ کا نام لے کر ان کی بزرگی اور بڑائی بیان کرتے تھے۔ اپنے بتوں کے لئے سجدہ کرتے تھے۔ بتوں سے مدد مانگتے تھے۔ بتوں کو الٰہ جاننے کی وجہ سے ان کو جانداروں کی جان کا مالک سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے۔ بتوں کے نام پر دور دور سے جانور بھیجے جاتے تھے۔

☆ مختصراً یوں کہیے کہ مالی اور بدنی عبادتیں بتوں کے لئے مخصوص تھیں۔ مشرکین اپنے بتوں کی جو بدنی عبادت کرتے تھے اس میں تین چیزیں بہت نمایاں ہوتی تھیں۔ (۱) سجدہ (۲) دعائیں۔ (۳) اپنی زبان سے ان کی بزرگی بیان کرنا اور عبادت مالی میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں تھی وہ بتوں کے نام پر جانوروں کا ذبح کرنا تھا۔

☆ دین اسلام جس کی بنیاد خالص توحید پر تھی شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑے بغیر قائم نہیں ہو سکتا تھا جس کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ

عبادت مالی اور بدنی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص کردی جائے اور اس خصوصیت کا نشان ہر فرد مسلم کے پیش نظر ہو عام اس سے کہ وہ مسلمان مکہ میں ہو یا مدینہ میں، کسی شہر میں ہو یا کسی قریہ میں، توحید کا نشان اس کے سامنے ہونا چاہئے تاکہ مرد مسلم ہر قدم پر اسلام کے آثار وعلامات اور علم توحید کے سایہ میں اپنے دین وایمان کو لئے ہوئے اسلامی زندگی بسر کرسکے۔ اس حکمت بالغہ کے تحت ہر شہر وقریہ میں مساجد اور ان میں پنج گانہ اذان اور نماز با جماعت مقرر کی گئی جو عبادت بدنی کے تمام شعبوں پر حاوی اور متعدد شعائر دین کا مجموعہ ہے اور اسی حکمت کے مطابق عبادت مالی کا نمایاں پہلو (معبودوں کے نام پر جانور ذبح کرنا) بتوں سے ہٹا کر معبودِ برحق اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ کے لئے مخصوص کیا گیا اور ایک شعار دینی کی صورت میں اجتماعی عبادت کی شکل دے کر ہر ہر شہر وقریہ میں اس کو جاری کردیا گیا۔

☆ چونکہ عبادت مالی اور بدنی! عبادت ہونے میں دونوں شریک ہیں۔ اس لئے جس طرح عبادتِ بدنی میں انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتیں عام کی گئیں کہ سنن ونوافل اور وتر وغیرہ ہر شخص الگ الگ پڑھ لیتا ہے مگر عیدین، جمعہ اور جماعت سب مل کر ادا کرتے ہیں بالکل اسی طرح عبادت مالی کا حال ہے کہ ہر شخص جب بھی کوئی جانور اپنی ذاتی ضروریات یا مذہبی حاجت کی بناء پر ذبح کرے وہ اللہ ہی کے نام پر ذبح کرے۔ اگر ایام قربانی میں تمام امت مسلمہ اجتماعی صورت میں یہ عبادت بجا لائے جس طرح اذان نماز با جماعت، جمعہ، عیدین، شعائر اللہ میں داخل ہیں اسی طرح ہر قصبہ میں قربانی بھی شعائر دین میں سے ہے۔

☆ اب بتایئے مروجہ قربانی شرک کی تباہی اور توحید کے دوام وبقاء پر دال ہے یا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ شرک کے مٹنے اور توحید کے قائم ہونے کی وہ عظیم الشان یادگار ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے آج تک چلی آرہی ہے اور ان شاء اللہ اس وقت تک رہے گی جب تک کہ خدا کی زمین پر "لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ" پڑھنے والا ایک شخص بھی قائم رہے گا۔ آپ ایڑی چوٹی کا زور لگا لیجئے آپ کے مٹانے سے دین کا یہ شعار مٹ نہیں سکتا۔ "یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ۔" (صف : ۷)

☆ آپ کے نزدیک قربانی کا فلسفہ اجتماع حج کے موقع پر غذائی سہولت ہے۔ ٹھیک ہے اسیرانِ شکم کو شکم پروری کا فلسفہ نہ سوجھے تو کیا سوجھے۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

☆ عبادات اسلامیہ کا منتہا شکم پروری ہونا کیا کہنا ہے؟ پیٹ بھر لینا تو کتوں، بلوں کے لئے بھی مشکل نہیں۔ آپ نے انسانوں کا کمال اسی میں منحصر کردیا۔

ایں کا راز تو آید و مرداں چنیں کنند

☆ اسلام نے کھانے پینے کا مقصد عبادت قرار دیا ہے۔ آپ عبادت کا مقصد کھانا پینا قرار دے رہے ہیں؟

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

☆ کسی حکومت کے جھنڈے کو اتارنے کی کوشش کرنا اس حکومت کے نزدیک نا قابل برداشت جرم ہے۔ آپ حکومت خداوندی کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں کچھ سوچے حکومت کی پختگی، استحکام، بقاء ودوام کے لئے جو روپیہ خرچ کیا جائے ایک جاہل کی نظر میں وہ ضرور قابل اعتراض ہوگا لیکن اربابِ حکومت سے پوچھا جائے تو وہ کیا جواب دیں گے؟ دین متین کے برقرار رہنے۔ توحید کے بقاء و دوام کی خاطر قربانی پر جو روپیہ ہر سال خرچ ہوتا ہے وہ بے خبر لوگوں کی نظر میں قابل اعتراض ہونا ہی چاہئے لیکن استحکام سلطنت پر روپیہ خرچ کرنے والے کو مطعون کرنے کا مزہ اسی وقت آئے گا جب دفاعی لائن کمزور ہونے کی وجہ سے دشمن سر پر آ پہنچے گا اور قتل وغارت کا بازار گرم ہونے لگے گا۔ بالکل اسی طرح شعائر دین کو باقی رکھنے کے لئے روپیہ صرف کرنے پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں انہیں اسی وقت اس کا پتہ چلے گا جب مسلمانوں کی لاپروہی کے سبب شعائر دین ختم ہو جائیں گے اور توحید کی جگہ شرک لے گا۔ دین ختم ہو کر کفرو بے دینی کا دورہ ہوگا اور اسی وقت عذاب الٰہی گرفت سخت ہو جائے گی۔

☆ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قربانی پر جو روپیہ صرف ہوتا ہے اس کو خلافِ عقل وحکمت قرار دیا جارہا ہے لیکن قربانی سے لاکھوں بلکہ کروڑوں درجہ زیادہ سینماؤں، تھیٹروں، کلب گھروں، قحبہ خانوں اور اسراف وتبذیر کی بے شمار مدوں پر مسلمانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا جو روپیہ خرچ ہو رہا ہے اس کے متعلق آپ کے دل میں درد کی کوئی کسک پیدا نہیں ہوئی۔ قربانی پر تو آپ کا دل اس قدر دکھا کہ دکھی دل کی التجائی سنانے کے لئے آپ چیخ رہے ہیں۔ استحکام پاکستان اور کشمیر فنڈ کا خیال آپ کو تڑپا رہا ہے۔ قوم کے اخلاق، صحت، تہذیب، کلچر سب کچھ تباہی کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں جس کی وجہ سے پاکستان بھی ضعف پیچ رہا ہے۔ کبھی آپ کو خیال نہ آیا کہ قوم اور حکومت کو اس طرف توجہ دلائیں اور وہ روپیہ جو ان سیاہ کاریوں پر صرف ہو رہا ہے اس سے اسلحہ خریدا جائے اور کشمیر فنڈ کی امداد کی جائے۔ کیا کہنے ہیں آپ کے دکھی دل کے، چھری بکری پر چلتی ہے مگر دکھ درد آپ کو ہوتا ہے۔ حافظ شیرازی خوب کہہ گئے ہیں

نہاں کے ماند آں رازے کز و سازند محفلہا

☆ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے دل میں استحکام پاکستان کی خواہش ہے نہ کشمیر فنڈ کی امداد کا جذبہ۔ درحقیقت آپ اسلام اور شعائر اسلام کے دشمن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی معصیت پر روپیہ خرچ کرنے سے آپ کے دل میں درد نہیں ہوتا لیکن اطاعت وعبادت پر صرف ہونے والا مال آپ کے دل کو دکھا رہا ہے۔

☆ آج آپ نے قربانی پر ہاتھ صاف کیا ہے مجھے ڈر ہے کہ جس دلیل سے آپ قربانی کو خلافِ عقل وحکمت اور خلافِ ایمان کہہ رہے ہیں کل حج، زکوٰۃ، صوم وصلوٰۃ، جمعہ، عیدین، اذان ومساجد، بقیہ شعائر دین کو بھی اسی دلیل سے گندگی، رجس اور موجب عذاب و سزا کہہ دیں گے اور اپنے دکھی دل کی التجا لوگوں کو سنانے لگیں گے۔ تعمیر مساجد میں روپیہ صرف کرنا بھی خلافِ حکمت قرار پائے گا کیونکہ بغیر مسجد کے بھی نماز ہو سکتی ہے بلکہ نماز میں بلاوجہ پانچوں وقت، وقت صرف کرنا آپ کے نزدیک حماقت قرار پائے گا۔ حج میں تو ہر سال قربانی سے بھی زیادہ روپیہ صرف ہوتا ہے اس سے بھی آپ کے دل کو ضرور دکھ پہنچتا ہوگا۔ ہر سال حج کو جانا اور کروڑوں روپیہ

صرف کرنا آپ کے دکھی دل پر نشتر کا کام کرتا ہوگا۔ کاش! یہ روپیہ استحکام پاکستان کشمیر فنڈ اور اسلحہ خریدنے پر خرچ کیا جاتاء

☆ روزہ رکھنا بھی بظاہر کمزوری کا سبب ہے۔ یہ جنگ کے لئے تیاری کا زمانہ ہے اس وقت روزہ رکھ کر کمزور ہونا خلافِ عقل و حکمت ہونا چاہئے۔ زکوٰۃ دینا بھی بے معنی ہوگا کیونکہ حکومت نے عوام پر جو متعدد ٹیکس عائد کئے ہوئے ہیں ان کے بعد زکوٰۃ دینے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ غرض کہ

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

☆ آپ کے پمفلٹ کا مضمون آپ کے عزائم و مقاصد کو اہل بصیرت کے سامنے بے نقاب کر رہا ہے۔

☆ آپ فرماتے ہیں کہ اسلام عین قربانی ہے یعنی اسلام میں داخل ہونے کے بعد قربانی کا مفہوم خود بخود ادا ہو جاتا ہے پھر اس رسمی قربانی کی کیا ضرورت ہے۔ قربانی کے خلاف کیا اچھی دلیل ہے۔

☆ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام عین قربانی ہے پھر مسلمانوں کو اس رسمی قربانی کی کوئی حاجت نہیں۔

☆ اگر اس کے ساتھ اتنی بات اور کہہ دی جاتی کہ اسلام کے معنی ہیں گردن نہادن بطاعت یعنی اسلام عین سجدہ اور اطاعت ہے لہٰذا اس رسمی سجدہ اور اطاعت کی کوئی حاجت نہیں تو قصہ ہی ختم ہو جاتا۔

☆ قربانی کے نقائص بیان کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ معدہ پر یہ بارِ گراں ہر سال حکیموں ڈاکٹروں کی گرم بازاری کا سبب ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کی اس مزعومہ گرم بازاری کو صحیح تصور کر لیا جائے تو اس کا سبب قربانی کرنا نہیں بلکہ قربانی کے بعد مسنون طریقہ سے اس گوشت کی عدم تقسیم ہے۔ اگر ارشاد نبوی کے موافق عمل کیا جائے تو کسی گھر میں گوشت اتنی مقدار میں باقی نہیں رہ سکتا جس کی بنا پر آپ کو اس اعتراض کا موقع ملے۔ یوں تو ہر مذہبی کام کی ادائیگی میں بعض ناواقف لوگوں سے کوئی ایسی غلطی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس قسم کے مفاسد لازم آجاتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسے غلط کار کو مذہبی فریضہ سے روک دیا جائے بلکہ اس کی غلطی کی اصلاح کرنی چاہئے۔ آپ نے قرآن کریم کی آیت "لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا" (الحج) سے بھی قربانی کی تردید فرمائی ہے لیکن ہر ذی شعور انسان سمجھ سکتا ہے کہ "لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا" جس کا ترجمہ ہے اس کے گوشت اور خون! قربانی کیے بغیر ان کا گوشت و خون کیسے متحقق ہوگا؟ یہ الفاظ قربانی کا اعلان کر رہے ہیں۔ رہا یہ امر کہ اللہ تعالیٰ کو ان کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قربانی کرنا بے سود ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ قربانی کرتے وقت تمہارے دل میں تقویٰ اور پرہیزگاری کا ہونا ضروری ہے۔ یہی چیز تمام اعمال صالحہ کی بنیاد ہے۔ ایک قربانی کیا، ہمارا کوئی عمل بھی تقویٰ کے بغیر بارگاہِ الٰہی میں مقبول نہیں ہوتا۔ اب اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ اعمال صالحہ بے کار ہیں بس تقویٰ ہی تقویٰ ہونا چاہئے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نہ نماز ہو نہ روزہ، نہ حج ہو نہ زکوٰۃ ہو، کوئی نیکی اور عبادت نہ ہو مگر اس کے باوجود آدمی متقی اور پرہیزگار ہو جائے۔ بغیر دولت کے امیر، بے ملک کا نواب، بے عمل متقی آپ ہی کے یہاں ہوتے ہوں گے؟ ہم تو اس فلسفہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

☆ آپ نے یہ بھی خوب کہا کہ مکہ کے سوا قربانی کہیں جائز نہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ایام حج میں عہد رسالت سے لے کر اب تک منیٰ میں قربانی ہوتی چلی آئی ہے جو مکہ سے کئی میل دور ہے یعنی آپ کے نزدیک کسی حاجی کی قربانی ہی آج تک نہیں ہوئی۔

☆ اس مسئلہ میں مضمون نگار کی تیسری بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اضحیہ اور ھدی میں فرق نہیں کیا۔ جن ہی تین وجوہ کی بناء پر انہوں نے سورۂ بقرہ، سورۂ مائدہ اور سورۂ حج کی آیتوں سے ایام حج میں قربانی کا ذکر کیا ہے وہ اضحیہ نہیں بلکہ ھدی ہیں "ھــدایــا" اور "ضحایا" میں جو فرق ہے وہ کتب معتبرہ سے بیان کرتا ہوں۔ ناظرین کرام اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

☆ "ھدی" اصل میں اس جانور کو کہتے ہیں جو ذبح کرنے کے لئے کعبہ کی طرف بھیجا جائے پھر محاورات عرب میں اس لفظ کا اطلاق ہر اونٹ پر ہونے لگا عام اس سے کہ وہ کعبہ کی طرف بھیجا جائے یا نہ بھیجا جائے۔ مجمع بحار الانوار ص ۴۸۰ ج ۳ میں ہے "الھــدیة بالتشدید کالھدی بخفة وھو ما یھدی الی الکعبة من النعم لتنحر فا طلق علی جمیع الابل وان لم تکن ھدیا الخ"

☆ اور اضحیہ لغت میں اس جانور کا نام ہے جو ایام اضحیٰ میں ذبح کیا جائے۔ یہ تسـمیه از قبیل تسمیة الشیء باسم وقته ہے اور اصطلاح شرع میں اضحیہ ایسے حیوان مخصوص کے ذبح کو کہتے ہیں جو وقت مخصوص میں بہ نیت قربت ذبح کیا جائے۔ درمختار جلد اول ص ۲۷۷ (کتاب الاضحیہ) میں ہے "الاضـحیة اسـم لـما یذبح ایام الاضحی من تسمیة الشیء باسم وقت و شرعًا ذبح حیوان مخصوص بنیة القربة فی وقت مخصوص۔" ا ھ

☆ اس تشریح سے معلوم ہوا کہ ھدی کے مفہوم میں مکان مخصوص (الی الکعبة) معتبر ہے اور اضحیہ کے مفہوم میں مخصوص زمانہ (ایام اضحیٰ ۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ) کا اعتبار ہے۔ مروجہ قربانی اضحیہ ہے نہ کہ ھدی۔ مؤلف صاحب نے آیات سے قربانی بمعنی اضحیہ سمجھا۔ وہ بالکل غلط ہے۔ ان آیات میں دم احصار، دم تمتع یا دم جنایت کا ذکر ہے جس کو بعض حالتوں میں ہدی کہہ سکتے ہیں مگر اضحیہ نہیں کہہ سکتے۔

☆ وہ قربانی جس کو اضحیہ کہا جاتا ہے اس کا ذکر ان آیات میں نہیں جنہیں مؤلف صاحب نے اپنے دعوے کی تائید میں پیش کیا ہے۔ اضحیہ کا ذکر سورۃ الکوثر کی اس آیت میں ہے "فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ" (کوثر : ۲) حبیب! اپنے رب کے لئے نماز پڑھو اور اسی کے لئے قربانی کرو۔

☆ جن احادیث میں مروجہ قربانی کا ذکر تفصیل سے آیا ہے ان کو قرآن کے خلاف کہنا سخت بے دینی اور گمراہی ہے۔ وہ تمام احادیث "وَانۡـحَـرۡ" کی تشریح وتفسیر کا درجہ رکھتی ہیں۔ احادیث اضحیہ کو خلافِ قرآن کہنا اس وقت درست ہوتا جب کہ قرآن کریم میں اضحیہ کی ممانعت ہوتی۔ مؤلف صاحب نے احادیث اضحیہ کو خلافِ قرآن تو کہہ دیا مگر کوئی آیت اضحیہ کے خلاف پیش نہ کر سکے۔

☆ یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ "وَانۡحَرۡ" کے متعدد معنی کئے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں

(۱) دو سجدوں کے درمیان اس طرح بیٹھنا کہ سینہ ظاہر ہو جائے۔

(۲) نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنا

(۳) نماز میں رفع یدین کرنا (۴) قربانی کرنا

☆ جب تک قربانی کرنے کے معنی دوسرے معنی پر راجح ہونا ثابت نہ ہوں اس وقت تک آیت مبارکہ کو قربانی پر محمول کرنا درست نہیں۔

☆ اس کے جواب میں تفسیر کبیر سے امام فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کا خلاصہ نقل کرتا ہوں جو اس شبہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کے لئے کافی ہے۔

☆ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت فرماتے ہیں

☆ اکثرین اور علامۃ المفسرین کا قول یہ ہے کہ "وَانْحَرْ" سے قربانی مراد ہے اور یہ معنی باقی معانی سے اولیٰ ہے۔ اولویت کے پانچ وجوہ ہیں۔

☆ اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی نماز کا امر فرمایا ہے زکوٰۃ کا بھی ساتھ ہی امر فرمایا ہے۔ لہٰذا آیت کریمہ "فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ" میں لفظ "وَانْحَرْ" سے قربانی مراد لی جائے گی کیونکہ یہ عبادت مالی ہونے کی وجہ سے بمنزلہ زکوٰۃ کے ہے۔

☆ دوم یہ کہ مشرکین اپنے بتوں کے لئے صلوٰۃ اور قربانی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کاموں کو اپنے لئے خاص فرما دیا (اگر "وَانْحَرْ" کے معنی قربانی نہ ہوں تو قربانی کا اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہونا ثابت نہ ہوگا)

☆ سوم یہ کہ نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنا اور رفع یدین وغیرہ امور نماز کے آداب وابعاض سے ہیں۔ "وَانْحَرْ" فَصَلِّ کا معطوف ہے اور کسی شے کے بعض کا عطف اس کے جمیع پر امر بعید ہے۔ لہٰذا "وَانْحَرْ" سے قربانی مراد لینا ضروری ہوا تاکہ کلام الٰہی میں یہ قباحت لازم نہ آئے۔

☆ چہارم یہ کہ "فَصَلِّ" میں امر الٰہی کی تعظیم اور "وَانْحَرْ" میں شفقۃ علیٰ خلق اللّٰہ کی طرف اشارہ ہے اور جملہ حقوق عبودیت ان دو اصولوں سے خارج نہیں۔ اس لئے قربانی کے معنی مراد لینا اولیٰ ہے۔ "فَصَلِّ" میں امر الٰہی کی تعظیم ہونا ظاہر ہے قربانی میں شفقۃ علیٰ خلق اللّٰہ کے کئی پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ قربانی کے جانور ذبح ہونے کے بعد حدیث صحیح کے مطابق جنت میں جائیں گے۔ اس پہلو سے جانوروں پر شفقت ہوئی اور قربانی کرنے والے قربانی کی وجہ سے ثوابِ اخروی کے مستحق ہوں گے۔ ان کے حق میں شفقت ہے، پھر عام غربا اور مساکین دنیا میں قربانی کا گوشت کھائیں گے یہ بھی شفقت کا ایک پہلو ہے۔

☆ پنجم یہ کہ لفظ "نحر" کا استعمال باقی معانی کی بہ نسبت قربانی کے معنی میں زیادہ مشہور ہے۔ اس لئے کلام الٰہی کا حمل اس معنی پر واجب ہے۔

☆ جلالین میں ہے "وانحر نسکک" صاوی حاشیہ جلالین میں ہے "وانحر نسکک ای ھدایاک وضحایاک" روح المعانی میں ہے "وقیل المراد بھا صلوٰۃ العید وبالنحر التضحیۃ" اس کے بعد فرمایا "والاکثرون علی ان المراد

بالنحر نحر الاضاحی"

☆ یعنی اکثر مفسرین کا مذہب یہ ہے کہ نحر سے مروجہ قربانی مراد ہے۔

☆ اس بیان سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ مروجہ قربانی کا حکم قرآن کریم کی آیت "فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ" میں موجود ہے۔ البتہ اس کی تشریح احادیث میں وارد ہے۔ مضمون نویس صاحب دبے لفظوں میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جو حدیث قرآن حکیم کے مخالف نہ ہو وہ قبول کی جائے گی۔ ہم نے ثابت کر دیا کہ احادیث قربانی کسی آیت قرآنی کے مخالف نہیں بلکہ حکم ربانی "وَانْحَرْ" کی تشریح و تفسیر ہیں۔ اب ان احادیث میں سے چند حدیثیں ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

(۱) ترمذی کی روایت ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں دس سال رہے۔ درآں حالیکہ قربانی فرماتے تھے۔

(۲) امام احمد رحمۃ اللہ علیہ و ابن ماجہ، زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا، حضور! یہ قربانیاں کیا ہیں؟ سرکار نے ارشاد فرمایا، تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ (الحدیث)

(۳) امام بخاری و مسلم و اصحاب سنن اربعہ نے براء بن عازب سے روایت کی کہ قربانی کے دن حضور سید عالم ﷺ نے (مدینہ منورہ میں) ہمیں خطبہ سنایا اور فرمایا کہ قربانی کے دن ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں۔ واپس آ کر قربانی کریں۔ جس نے ایسا کیا وہ ہماری سنت و شریعت کو پہنچ گیا اور جس نے نمازِ عید سے پہلے قربانی کر لی تو وہ بکری اس کے اہل و عیال کے لئے گوشت حاصل کرنے کے لئے بعجلت تمام ذبح کر لی گئی ہے۔ قربانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(۴) ابن عمر رضی اللہ عنہما سے امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (مدینہ منورہ میں) عید گاہ میں اونٹ اور دوسرے جانوروں کی قربانی فرماتے تھے۔

☆ امام بخاری و مسلم حضرت جندب بن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں عید الضحیٰ کے دن سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نمازِ عید پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر دیکھا تو چند قربانیاں نماز سے پہلے ہو چکی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "جس نے نماز سے پہلے قربانی کر دی اسے چاہئے کہ اس کی بجائے دوسری کرے۔"

☆ ان کے علاوہ بے شمار احادیث صحیحہ مروجہ قربانی کے متعلق وارد ہیں جن کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ صحابہ کرام خصوصاً خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین مکہ معظمہ کے علاوہ مدینہ طیبہ اور دوسرے مقامات میں ہمیشہ قربانیاں کرتے رہے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر سال حضور ﷺ کی وصیت کے مطابق حضور ﷺ کی طرف سے بھی قربانی کیا کرتے تھے۔ عہد رسالت سے لے کر آج تک مسلمان اسی شعار دینی کو قائم رکھتے چلے آئے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی نے سنت سمجھ کر قربانی کی اور کسی نے واجب جان کر۔ مگر اصل قربانی کے مشروع ہونے میں آج تک امت مسلمہ کے کسی فرد نے اختلاف نہیں کیا یہی سبیل مومنین ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں

فرماتا ہے "وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ." (نساء : ۱۱۵) جس نے سبیل مومنین کے علاوہ کوئی اور راستہ تلاش کیا ہم اسے جہنم رسید کریں گے۔

☆ علامہ شامی نے طحاوی سے نقل کیا ہے کہ اصل اضحیہ کا انکار کفر ہے۔ مؤلف صاحب جو اضحیہ (قربانی) کو خلافِ عقل وحکمت، خلافِ ایمان، گندگی، رجس موجب سزا و عذاب قرار دے رہے ہیں انہیں سوچنا چاہئے کہ آپ کا یہ حکم کہاں تک پہنچتا ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ عہد رسالت سے لے کر اب تک امت مسلمہ کا ہر فرد اصل اضحیہ کا قائل رہا ہے اور ابتدائے اسلام سے اب تک تمام قربانی کرتے چلے آئے۔

☆ مؤلف صاحب کے نزدیک نعوذ باللہ وہ سب گمراہ، بے ایمان، مستحق عذاب وسزا ہیں۔ سبیل مومنین کے خلاف چل کر نجات کا متمنی ہونا دین کے ساتھ تمسخر نہیں تو اور کیا ہے؟

☆ رہیں وہ احادیث جن میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کے قربانی کے جانوروں کا کعبہ کی طرف بھیجنا مروی ہے تو میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ جانور ضحایا نہیں بلکہ ہدایا ہیں۔ کوئی مسلمان ان کا منکر نہیں۔ دم تمتع، دم جنایت، دم احصار تینوں قسم کے جانور منیٰ وغیرہ میں ذبح کئے جاتے ہیں اور ان ہی میں بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں فدیہ یا روزہ جانور ذبح کرنے کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔ ضحایا کو ہدایا اور ان میں سے ایک کے احکام کو دوسرے پر قیاس کرنا آپ جیسے حضرات ہی کا کام ہے۔

☆ قبل ازیں پوری تفصیل کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کر چکا ہوں۔ اب آخر میں پھر عرض کر دوں کہ قرآن ایک قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور حدیث اس کی تشریح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں اپنے رسول کو سکھائی اور قرآن مجید میں ہمیں حکم دیا کہ "مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا." (الحشر : ۷) رسول تمہیں جو کچھ دے دیں تم اسے لے لو اور جس چیز سے وہ تمہیں روک دیں اس سے رک جاؤ۔

☆ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا معلم صرف اپنے رسول کو بنایا ہے۔ ایسا نہیں کیا کہ ہر کس و ناکس کو اس کی الٹی سیدھی سمجھ کے مطابق قرآن سمجھنے کی اجازت دے دی ہو اس لئے کہ اس قسم کی آزادی قرآن کریم کے بازیچہ اطفال اور دین متین کو اضحوکہ بنا دینے کے مترادف ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بنی نوع انسان اپنی عقل و فہم میں مختلف الحال ہیں۔ ایسی صورت میں ہر شخص اپنی سمجھ کے موافق قرآن کا مطلب اخذ کرے گا اور جس طرح چاہے گا اپنے اغراض وخواہشات پر قرآن کریم کو منطبق کرنے کی کوشش کرے گا۔ نزولِ قرآن کی حکمت اور مصالح دین کے قطعاً منافی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے قرآن فہمی کے لئے تمام دنیا کو تعلیم رسول ﷺ کا پابند کر دیا تا کہ کوئی شخص مصالح خداوندی کے خلاف قرآن کریم کو استعمال نہ کر سکے۔ اس زمانہ میں جس قدر فتنے رونما ہو رہے ہیں ان سب کی علت یہی ہے کہ فتنہ پردازوں نے تعلیم رسالت اور بیانِ نبوت سے الگ ہو کر اپنی ناقص فہم سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پاکستان ٹائمز کے مقالہ نویس نے لفظ "مُلّا" بول کر جس چیز کی توہین وتحقیر کی ہے درحقیقت وہ یہی تعلیمات رسالت ہیں جن کو قرآن کریم "وَيُعَلِّمُهُمُ

اَلْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ" کی روشنی میں بار بار پیش کر رہا ہے اور اسی تعلیم نبوی ﷺ کی طرف علماء دین امت مسلمہ کو دعوت دے رہے ہیں۔ منکرین زمانہ لفظ "مُلّا" کی آڑ میں تعلیماتِ نبویہ کی جو توہین و تنقیص کر رہے ہیں اور نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ اپنے بغض وعداوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قرآن کریم کا جو مذاق اڑا رہے ہیں وہ دین پسند طبقہ سے مخفی نہیں۔ اس وقت اس خباثت کا وبال ظاہر ہو یا نہ ہو لیکن ان شاء اللہ آگے چل کر ان بے دینوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

"وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔" (الشعراء : ۲۲۷)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

کتاب التراویح

☆ امابعد! منکرین تقلید کی طرف سے مسئلہ تراویح پر جو مضامین اب تک شائع ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شرذمہ قلیلہ مٹھی بھر جماعت کے نزدیک بیس تراویح پڑھنے والے سب کے سب بدعتی، گمراہ، فاسق، فاجر اور العیاذ باللہ سنت رسول ﷺ کو مٹانے والے بدمذہب اور گنہگار ہیں کیونکہ جب بیس رکعت تراویح پڑھنا بدعت سیئہ قرار پایا تو جو بھی اس کو پڑھے گا یقیناً بدعتی قرار پائے گا۔ ایسی صورت میں جمہور امت مسلمہ تمام صحابہ کرام حتیٰ کہ خلفائے راشدین بھی معاذ اللہ بدعتی اور گنہگار ہوئے حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم" میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں تم جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ نیز فرمایا "اقتدوا بعدی ابا بکر وعمر" میرے بعد ابوبکر اور عمر کی اقتدا کرنا۔ ایک حدیث شریف میں ارشاد فرمایا "علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین" تم اپنے اوپر لازم پکڑو میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو۔ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں خاص طور پر ارشاد فرمایا "لو کان بعدی نبی لکان عمر" اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔ پھر صحیح حدیث میں وارد ہے "لن تجتمع امتی علی الضلالۃ" میری امت گمراہی پر ہرگز جمع نہ ہو گی۔

☆ ان احادیث کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ جو گروہ جمہور امت کی طرف گمراہی کی نسبت کرے یا صحابہ کی اقتدا کو برا سمجھے اور خلفائے راشدین کی سنت کو بدعت قرار دے وہ یقیناً غیر ناجی گروہ ہے اور حضور ﷺ کی امت کا بدخواہ، صحابہ اور خلفائے راشدین کا معاند ہے۔ آگے چل کر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ وہ انہی غیر مقلدین کا گروہ ہے جو اپنے سوا تمام امت مسلمہ کو گمراہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک اگر کوئی حق پر ہے تو وہی جو اس کا ہم عقیدہ اور ہم نوا ہے۔

☆ تراویح کے متعلق صحیح مسلک معلوم کرنے کے لئے چند امور کی وضاحت کی جاتی ہے۔ ناظرین کرام اچھی طرح سمجھ لیں۔

(۱) رسول اللہ ﷺ نے صرف تین رات تراویح کی نماز با جماعت پڑھی۔ اس کے بعد بخوفِ فرضیت ترک فرمادی۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے تمام زمانے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دور تک یہی حال رہا یعنی اہتمام جماعت کے ساتھ تراویح نہیں پڑھی گئی۔

☆ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے دوسرے سال ۱۴ھ میں امر تراویح کا استقرار ہوا یعنی اجتماع علی الامام اور اہتمام جماعت کے ساتھ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز تراویح کا امر فرمایا۔

(۲) تراویح ترویحہ کی جمع ہے۔ ترویحہ کے معنی آرام کرنے کے ہیں اور نماز تراویح کو تراویح اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ابتدائے امر میں ہر چار رکعت کے بعد لوگ استراحت کرتے تھے۔ صحیح بخاری جلد ثانی ص ۵۹۹ اور زرقانی شرح موطا امام مالک جلد اول ص ۲۱۳ مطبوعہ مصر پر ہے "عن الليث انه قال سميت صلوٰة الجماعة في ليالي رمضان بالتراويح لاهم اول ما اجتمعوا عليها كانوا يستريحون بين كل تسليمتين قدر ما يصلي الرجل كذا وكذا ركعة رواه محمد بن نصر." حضرت لیث سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رمضان کی راتوں میں صلوٰۃ با جماعت کا نام تراویح اس لئے رکھا گیا کہ جب لوگوں نے ابتداء جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنا شروع کی تو وہ ہر چار رکعت کے بعد اتنی دیر استراحت کرتے تھے کہ آدمی اتنی دیر میں چار رکعتیں پڑھ سکے۔ بحر الرائق جلد ۲ ص ۶۶ پر ہے "والتراويح جمع ترويحة وهي في الاصل مصدر بمعنى الاستراحة سميت به لا ربع ركعات المخصوصة لاستلزام استراحة بعدها كما هو السنة فيها." (تراویح ترویحہ کی جمع ہے اور وہ اصل میں مصدر ہے بمعنی استراحت چار مخصوص رکعتوں کا نام ترویحہ اس لئے رکھا گیا کہ سنت کے مطابق ان چار رکعتوں کے بعد استراحت لازم ہے۔

☆ غیر مقلدین بھی تراویح کو سنت کہتے ہیں مگر بیس رکعت کی بجائے آٹھ رکعت کے قائل ہیں۔ حالانکہ آٹھ رکعت کو تراویح کہنا صحیح نہیں۔ اس لئے کہ عبارات منقولہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ترویحہ چار رکعت کو کہتے ہیں اور تراویح ترویحہ کی جمع ہے۔ لہٰذا آٹھ رکعت کو ترویحتین کہنا درست ہے۔ تراویح کہنا نہیں۔ البتہ بیس رکعت کو تراویح کہنا صحیح ہے کیونکہ وہ پانچ ترویحہ کا مجموعہ ہے۔ معلوم ہوا کہ لفظ تراویح اس دعویٰ کی روشن دلیل ہے کہ آٹھ رکعت تراویح نہیں (بلکہ وہ نماز تہجد ہے) اور تراویح بیس رکعت ہی کا نام ہے۔ جیسا کہ جمہور امت مسلمہ اہل سنت و جماعت اور ائمہ اربعہ کا مذہب ہے۔

(۳) تہجد اور تراویح کی نمازیں الگ الگ ہیں۔ نماز تہجد ابتدائے اسلام ہجرت سے پہلے فرض ہوئی پھر سال بھر کے بعد نفل ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک صیام رمضان کی فرضیت اور صلوٰۃ تراویح کی مشروعیت کا کوئی وجود نہ تھا۔ ابوداؤد شریف جلد اول ص ۱۹۰ باب فی الصلوٰۃ اللیل مطبوعہ نول کشور میں ایک طویل حدیث کے ضمن میں وارد ہوا کہ حکیم بن افلح سعد بن ہشام کو ساتھ لے کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا "حدثيني عن قيام الليل قالت الست تقراء يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قال قلت بلٰى قالت فان اول هٰذه السورة نزلت فقام اصحٰب رسول اللّٰه ﷺ حتّٰى انتفخت اقدامهم وحبس خاتمتها

فی السمـاء اثنٰی عشر شھرا ثم نزل اٰخرھا فصار قیام اللیل تطوعا بعد فریضۃ۔" الحدیث (حضرت حکیم بن افلح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے عرض کیا کہ حضور علیہ السلام کے قیام لیل کے بارے میں مجھے بتایئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کیا تم یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ نہیں پڑھتے؟ میں نے عرض کیا، کیوں نہیں، پڑھتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا جب اس سورت کا اول حصہ نازل ہوا تو حضور علیہ السلام اور حضور علیہ السلام کے صحابہ نے قیام لیل کیا۔ یہاں تک کہ ان کے قدم مبارک متورم ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے خاتمے کو بارہ مہینے تک آسمان میں روک لیا۔ پھر اس کا آخری حصہ نازل ہوا اور قیام لیل فرض سے بدل کر نفل ہو گیا۔)

☆ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ تہجد کی نماز ہجرت سے پہلے ابتدائے اسلام میں شروع ہو چکی تھی اور صحابہ کرام رمضان اور غیر رمضان میں اس کو ادا کرتے تھے لیکن تراویح کا کوئی وجود اس وقت تک نہ تھا۔ پھر ۲ھ میں جب رمضان شریف کے روزے فرض ہوئے تو حضور علیہ السلام نے شعبان کے آخری دن کے خطبے میں ارشاد فرمایا "جعل اللّٰہ صیامہ فریضۃ وقیامہ تطوعا" اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے کو فرض اور اس کے قیام کو نفل قرار دیا ہے۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ شریف ص ۱۷۳

☆ اس حدیث سے حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ تراویح اور تہجد الگ الگ نمازیں ہیں اگر قیام رمضان سے نماز تہجد مراد ہوتی تو وہ رمضان شریف سے پہلے ہی شروع تھی۔ رمضان سے اس کو کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ پھر اسے حدیث میں خاص طور پر ذکر فرمانا اور قیام رمضان قرار دینا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ قیام رمضان سے صلوٰۃ تہجد مراد نہیں بلکہ وہی خاص نماز تراویح مراد ہے جو رمضان کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں شروع نہیں ہوئی۔

☆ ابن ماجہ ص ۹۵ پر ہے کہ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن اپنے والد سے روایت کرتے ہیں حضور نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا "کتب اللّٰہ علیکم صیامہ وسننت لکم قیامہ" (حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض فرمائے ہیں اور میں نے تمہارے لئے اس کا قیام مسنون کیا) اب اگر اس کو نمازِ تہجد تسلیم کیا جائے تو نمازِ تہجد اس سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے حکم سے شروع ہو چکی تھی۔ حضور علیہ السلام کا اس وقت اس کو مسنون فرمانا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوا کہ قیام رمضان جس کو حضور علیہ السلام نے مسنون فرمایا وہ صلوٰۃ تہجد نہ تھی بلکہ تراویح تھی۔

(۴) نماز تہجد کے معنی سونے اور بیدار ہونے کے ہیں اور یہ لفظ لغات اضداد سے ہے اسی لئے شرعاً نمازِ تہجد اسی نماز کو کہا جائے گا جو نمازِ عشاء پڑھ کر سونے کے بعد بیدار ہونے پر پڑھی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے نمازِ تہجد ہمیشہ آخر شب میں پڑھی ہے جیسا کہ بخاری و مسلم میں وارد ہے "عن مسروق قال سالت عائشۃ رضی اللّٰہ عنھا قلت ای حین کان یقوم من اللیل قالت کان یقوم اذا سمع الصارخ۔" (حضرت مسروق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام صلوٰۃ لیل یعنی نماز تہجد کے لئے کس وقت اٹھتے تھے؟ حضرت عائشہ صدیقہ ارشاد فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام مرغ کی آواز سن کر اٹھتے تھے) بخاری

شریف جلد اول ص ۱۵۲ کتاب التهجد باب من نام عند السحر مسلم شریف جلد اول ص ۲۵۵ باب صلوٰۃ اللیل۔ یہ حدیث اس دعویٰ پر نص صریح ہے کہ حضور ﷺ نمازِ تہجد ہمیشہ آخر شب میں پڑھا کرتے تھے۔

☆ دوسری حدیث حضرت اسود سے روایت ہے بخاری شریف میں ہے "قال سالت عائشة رضی اللّٰہ عنها کیف کان صلوٰۃ النبی ﷺ باللیل قالت کان ینام اولهٗ ویقوم اٰخرهٗ فیصلی ثم یرجع الٰی فراشه فاذا اذن المؤذن وثب فان کان به حاجة اغتسل والا توضا وخرج." بخاری ص ۱۵۴ ج ا۔ عینی ج ۷ ص ۲۰۱ یعنی حضرت اسود فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رات میں حضور ﷺ کی نماز کس طرح ہوتی تھی؟ انہوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ اول رات میں سو جاتے تھے اور آخر رات میں اٹھ کر نماز پڑھتے تھے۔ پھر اپنے بستر مبارک پر تشریف لے جاتے پھر جب مؤذن اذان دیتا تیزی سے اٹھتے پھر اگر ضرورت ہوتی تو غسل فرماتے ورنہ وضو فرما کر مسجد کی طرف تشریف لے جاتے۔

☆ عینی طبع جدید ج ۷ ص ۲۰۳ پر ہے "واما حدیث حجاج بن عمرو فرواه الطبرانی فی الکبیر والاوسط من روایة کثیر ابن العباس عنه قال ایحسب احدکم اذا قام من اللیل یصلی حتّٰی یصبح ان قد تهجد انما التهجد الصلوٰۃ بعد رقدة ثم الصلوٰۃ بعد رقدة ثم الصلوٰۃ بعد رقدة تلک کانت صلوٰۃ رسول اللّٰہ ﷺ

☆ یعنی حجاج بن عمرو سے بروایت کثیر بن العباس طبرانی نے کبیر اور اوسط میں روایت کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا تم لوگ یہ گمان کرتے ہو کہ تم جب بھی رات میں صبح تک نماز پڑھ لیا کرو تو تہجد کی نماز ادا ہو جایا کرے گی۔ جز ایں نیست کہ تہجد وہ نماز ہے جو سونے کے بعد ہو پھر نماز سونے کے بعد تین مرتبہ اسی طرح ارشاد فرمایا اور پھر کہا کہ حضور ﷺ کی نماز اسی طرح تھی یعنی حضور ﷺ خواب سے بیدار ہو کر نمازِ تہجد پڑھا کرتے تھے۔

☆ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب تک تین مرتبہ صلوٰۃ بعد رقدۃ کا تحقق نہ ہو اس وقت تک تہجد متصور نہ ہوگا تو میں عرض کروں گا کہ حدیث کا اضح مفہوم وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے یعنی نیند کے بغیر اگر کوئی شخص تمام رات صبح تک بھی نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز تہجد نہ ہوگی۔ تہجد کا تحقق سونے کے بعد ہی نماز پڑھنے پر منحصر ہے اور الصلوٰۃ بعد رقدۃ کی تکرار محض تاکید کے لئے ہے کیونکہ بخاری شریف کی حدیث منقولہ بالا و دیگر احادیث صحیحہ کثیرہ سے یہ بات واضح ہے کہ حضور ﷺ ایک بار نماز تہجد پڑھ کر سو جاتے تھے پھر اس وقت اٹھتے تھے جب مؤذن اذان دیتا تھا اور بعض روایات میں جو حضور ﷺ کا متعدد مرتبہ خواب سے بیدار ہو کر نماز پڑھنا وارد ہے وہ بعض احوال پر محمول ہے حالانکہ نماز تہجد پر حضور ﷺ نے جمیع احوال میں مواظبت فرمائی ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ اس حدیث کے الفاظ "انما التهجد بعد رقدة" اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ تہجد کے لئے سو کر اٹھنا ضروری ہے۔ بغیر سوئے صلوٰۃ اللیل تہجد نہیں ہو سکتی۔

☆ لیکن نماز تراویح حضور ﷺ نے اول شب میں پڑھی۔ ملاحظہ ہو

عن ابی ذر قال صمنا مع رسول اللہ ﷺ فلم یقم بنا شیئا من الشھر حتّٰی بقی سبع فقام بنا حتّٰی ذھب ثلث اللیل فلما کانت السادسۃ لم یقم بنا فلما کانت الخامسۃ قام بنا حتّٰی ذھبا شطر اللیل فقلت یا رسول اللہ ﷺ لو نفلتنا قیام ھذہ اللیلۃ فقال ان الرجل اذا صلّٰی مع الامام حتّٰی ینصرف حسب لہٗ قیام لیلۃ فلما کانت الرابعۃ لم یقم بنا فلما کانت الثالثۃ جمع اھلہ ونسائہ والناس فقام بنا حتّٰی خشینا یفوتنا الفلاح قلت ما الفلاح قال السحور ثم لم یقم بنا بقیۃ الشھر۔(رواہ ابو داؤد والترمذی والنسائی و ابن ماجہ مشکوٰۃ شریف ص ۱۱۴) باب قیام رمضان

☆ حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ روزے رکھے تو حضور ﷺ نے ہمارے ساتھ قیام نہ فرمایا یہاں تک کہ (انتیس دن والے رمضان کے) سات دن رہ گئے پھر حضور ﷺ نے ہمارے ساتھ تیئیسویں شب کو قیام فرمایا یہاں تک کہ ایک تہائی رات گزر گئی پھر جب مہینے کے اخیر سے شمار کرتے ہوئے چھٹی رات یعنی چوبیسویں شب ہوئی تو ہمارے ساتھ قیام نہ فرمایا پھر جب اسی حساب سے پانچویں یعنی پچیسویں شب آئی تو حضور ﷺ نے ہمارے ساتھ قیام فرمایا۔ حتیٰ کہ نصف شب گزر گئی پھر میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ کاش اس رات کے قیام کو آپ ہمارے لئے زیادہ فرماتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص امام کے فارغ ہونے تک اس کے ساتھ نماز پڑھتا ہے تو اس کے لئے تمام رات کا قیام لکھا جاتا ہے پھر جب اسی حساب سے چوتھی رات یعنی چھبیسویں شب آئی تو حضور ﷺ نے ہمارے ساتھ قیام نہ فرمایا۔ اس کے بعد بحساب مذکور تیسری یعنی ستائیسویں شب آئی تو حضور ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات اور اہل وعیال اور صحابہ کرام کو جمع فرمایا اور ہمارے ساتھ قیام فرمایا یہاں تک کہ ہم ڈرے کہ ہم سے فلاح فوت نہ ہو جائے۔ میں نے کہا کہ فلاح کیا ہے؟ کہا فلاح سحری ہے۔ پھر بقیہ مہینے حضور ﷺ نے ہمارے ساتھ قیام نہ فرمایا۔ اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا۔

☆ اس حدیث شریف سے واضح ہے کہ رمضان شریف کی ان تینوں راتوں میں حضور ﷺ نے اول شب میں نماز تراویح شروع فرمائی۔ پہلی رات میں تہائی حصہ گزر جانے کے بعد فراغت ہوئی۔ دوسری شب میں نصف شب گزر جانے پر اور تیسری رات اول سے آخر تک نماز پڑھنے میں گزری۔ بہر حال یہ حقیقت اس حدیث سے بخوبی واضح ہوگئی کہ نمازِ تراویح تینوں راتوں میں حضور ﷺ نے اول وقت میں پڑھی اور نمازِ تہجد کا ہمیشہ آخر وقت میں پڑھنا اس سے پہلے احادیث صحیحہ سے ثابت کر چکے ہیں۔ لہٰذا آفتابِ نیم روز کی طرح روشن ہوگیا کہ نمازِ تہجد اور نمازش تراویح الگ الگ نمازیں ہیں اور ان دونوں کو ایک سمجھنا غلط فہمی پر مبنی ہے۔

☆ سنن اربعہ کی حدیث مذکور سے جہاں یہ بات ثابت ہوئی کہ حضور ﷺ نے تینوں رات اول وقت میں نماز تراویح پڑھی وہاں یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ تراویح کی تیسری شب میں حضور ﷺ سحر تک نہیں سوئے بلکہ وہ تمام رات تراویح پڑھنے میں گزر گئی حالانکہ نمازِ تہجد حضور ﷺ نے ساری رات کبھی نہیں پڑھی۔ نہ حضور ﷺ نمازِ تہجد کے لئے تمام شب کبھی بیدار رہے بلکہ عادتِ کریمہ یہ تھی کہ رات کے بعض حصے میں حضور ﷺ خواب استراحت فرماتے اور بعض حصے میں بیدار رہ کر صلوٰۃ تہجد ادا فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص حضور ﷺ کو رات کو سوتا ہوا دیکھنا چاہتا تو سوتا ہوا دیکھ سکتا تھا اور اگر اسی رات میں نماز پڑھتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا تو نماز پڑھتا ہوا بھی دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ بخاری شریف ج اول ص ۱۵۳ باب قیام النبی ﷺ باللیل و نومہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

"وکان لا تشاء ان تراہ من اللیل مصلیا الا رایتہ ولا نائما الا رایتہ" حضور ﷺ کی یہ شان تھی کہ اگر تو رات کے وقت حضور کو نماز پڑھتا ہوا دیکھنا چاہتا تو دیکھ سکتا تھا اور اگر تو استراحت میں دیکھنا چاہتا تو دیکھ سکتا تھا اور خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے "ولا اعلم نبی اللہ ﷺ قرا القرآن کلہ فی لیلۃ الی الصبح ولا صام شھرا کاملا غیر رمضان" رواہ مسلم باب الوتر فصل اول ص ۱۱۱ مطبوعہ مجیدی کانپور

☆ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نہیں جانتی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک رات بھی ساری قرآن پاک پڑھا ہو اور نہ یہ جانتی ہوں کہ حضور ﷺ نے کسی رات صبح تک نماز پڑھی ہو (اور یہاں نماز سے مراد نمازِ تہجد ہے کیونکہ ہم پہلی حدیث سے صلوٰۃ تراویح تمام رات پڑھنا ثابت کر چکے ہیں اور نہ یہ کہ رمضان کے علاوہ حضور ﷺ نے سوائے رمضان تمام مہینہ روزہ رکھا ہو) جب تراویح کی نماز حضور ﷺ نے تمام رات پڑھی اور نماز کے لئے حضور ﷺ تمام رات بھی بیدار نہیں ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں نمازیں جداگانہ ہیں۔

☆ احادیث صحیحہ کثیرہ سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے نمازِ تہجد جوف لیل سے پہلے کبھی نہیں پڑھی۔ حضور ﷺ کی نماز تہجد ہمیشہ جوف لیل اور آخر شب ہی میں ثابت ہے۔ موطا امام مالک ص ۵۶ مطبوعہ مجتبائی دہلی باب ما جاء فی الدعا میں حضرت طاؤس حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں "ان رسول اللّٰہ ﷺ کان اذا قام الی الصلوٰۃ من جوف اللیل یقول اللّٰھم لک الحمد۔" الحدیث (حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ شب کے درمیانی حصے میں صلوٰۃ (تہجد) کے لئے اٹھتے تھے تو "اللّٰھم لک الحمد" فرماتے تھے۔ الحدیث

☆ اس حدیث میں صلوٰۃ سے صلوٰۃ تہجد مراد ہونے پر دلیل ہے کہ یہی حدیث امام بخاری نے ان لفظوں میں روایت کی ہے "اذا قام من اللیل یتھجد" اور یہی حدیث ابن خزیمہ نے بایں الفاظ روایت کی ہے "اذا قام لتھجد" زرقانی شرح موطا امام مالک ج اول ص ۳۸۶ اور فتح الباری ج ۳ ص ۲ باب التہجد باللیل۔

☆ علامہ طبری بھی تہجد کا وقت سونے کے بعد جاگنے پر ہی قرار دیتے ہیں اور اسے وہ سلف صالحین سے نقل کرتے ہیں۔ جیسا کہ فتح الباری ج ۳ ص ۲ پر ہے "وقال الطبری التھجد السھر بعد نومۃ ثم ساقہٗ عن جماعۃ من السلف"

☆ نمازِ تہجد کا وقت سو کر اٹھنے کے بعد ہی ہے اس سے پہلے نہیں جیسا کہ امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر ج خامس مطبوعہ مصر ص ۴۳۳ پر فرماتے ہیں "ثم راینا ان فی الشرع یقال لمن قام من النوم الی الصلوٰۃ انہٗ متھجد" یعنی اصطلاح شرع میں اسی شخص کو تہجد گزار کہا جائے گا جو نیند سے اٹھ کر نماز پڑھے۔ اسی طرح فتوحاتِ الٰہیہ ج ثانی ص ۶۴۲ پر ہے "ثم لما راینا فی عرف الشرع انہٗ یقال لمن انتبہ باللیل من نومہٖ وقام الی الصلوٰۃ انہٗ متھجدا وجب ان یقال سمی ذالک متھجدا من حیث انہ القی الھجود" (پھر جب ہم نے عرف شرع میں دیکھا کہ جو شخص رات کو اپنی نیند سے بیدار ہو کر نماز کے لئے کھڑا ہو وہی تہجد گزار

ہے تو یہ کہنا واجب ہو گیا کہ نمازِ تہجد پڑھنے والے کو اسی وجہ سے متہجد کہتے ہیں کہ اس نے نیند کو اپنے آپ سے دور کر دیا۔

☆ مشکوٰۃ شریف باب التحریض علیٰ قیام اللیل فصل اول ص ۱۰۹ مطبوعہ مجیدی کانپور میں ہے "عن عائشۃ قالت کان تعنی رسول اللّٰہ ﷺ ینام اول اللیل و یحی اٰخرہٗ۔" متفق علیہ (بخاری اور مسلم کی متفق حدیث میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اول رات میں سو جاتے تھے اور آخر رات کو زندہ فرماتے یعنی اس میں نماز پڑھتے تھے۔

☆ بعض لوگوں کا یہ سمجھنا کہ "صلوٰۃ لیل اور صلوٰۃ تہجد میں کچھ فرق نہیں۔ دونوں کا وقت اول شب سے آخر شب تک ہے مگر آخر شب کو اول شب پر فضیلت ہے۔ نمازِ تہجد کا افضل وقت آخر شب ہی ہے لیکن اول شب میں نماز تہجد پڑھ لی جائے تو درست ہے" کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ کبھی رسول اللہ ﷺ نے رات کے ابتدائی حصے میں تہجد کی نماز پڑھی ہو۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ صلوٰۃ لیل تہجد بھی ہے اور غیر تہجد بھی۔ تہجد غیر تہجد سے بہتر ہے۔ لہٰذا جن حدیثوں میں آخر شب کی نماز کو افضل قرار دیا گیا ہے ان کا یہ مطلب نہیں کہ رات کے ابتدائی حصے میں تہجد پڑھنا جائز ہے۔ افضلیت آخر شب کے تہجد میں ہے بلکہ ان احادیث کا واضح مفہوم یہی ہے کہ صلوٰۃ لیل اگر چہ رات کے ابتدائی حصے میں جائز ہے لیکن صلوٰۃ لیل میں افضل ترین صلوٰۃ تہجد ہی ہے اور اس کا وقت سو کر اٹھنے کے بعد ہی ہے۔

☆ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جو اول شب میں تراویح پڑھنے والوں سے فرمایا تھا کہ "و التی تنامون عنھا افضل من التی تقومون" اس کا مطلب یہی ہے کہ تم لوگ رات کے پہلے حصے میں نماز تراویح پڑھ کر آخر شب میں سو جاتے ہو اور اس وجہ سے تہجد کی فضیلت سے محروم رہتے ہو۔ اگر یہی صلوٰۃ تراویح تم آخر شب میں ادا کرو تو تراویح کے ساتھ نماز تہجد بھی ادا ہو جائے گی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ صلوٰۃ تہجد قبل النوم اول شب میں ادا نہیں ہوتی۔

☆ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس امر کو واضح فرما رہے ہیں کہ تہجد اصطلاح شرع میں تطوع بعد از نوم کو کہتے ہیں۔ نیز علامہ شامی نے فرمایا "نعم صلوٰۃ اللیل و قیام اللیل اعم من التھجد" یعنی صلوٰۃ لیل اور تہجد کو مساوی سمجھنا غلط ہے بلکہ صلوٰۃ لیل تہجد سے اعم ہے۔ فیض الباری جز وثانی ص ۴۰۷ پر ہے "و قال العلماء ان اسم التھجد لا یصدق الا بعد الھجود فلا یطلق علیٰ صلوٰۃ اللیل قبل الھجود" یعنی علماء کا قول ہے کہ تہجد کا لفظ سونے کے بعد ہی صادق آ سکتا ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ قبل از نوم پر لفظ تہجد کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

☆ خلاصہ یہ کہ نماز تہجد وہی ہے جو عشاء کے بعد خواب سے بیدار ہو کر پڑھی جائے لیکن اگر کسی کو مجبوری کے باعث نماز تہجد پڑھنے کا موقع نہیں ملا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تہجد کی نعمت اور اس کے ثواب سے محروم رہ جائے بلکہ آخر شب میں اس کی نفل نماز صلوٰۃ تہجد کے قائم مقام ہو گی۔ معلوم ہوا کہ کسی نماز کا نام صلوٰۃ تہجد نہ ہونا اس امر کو مستلزم نہیں کہ وہ صلوٰۃ تہجد کے قائم مقام بھی نہ ہو سکے۔ جس طرح صلوٰۃ ضحیٰ اور صلوٰۃ کسوف باہم مختلف ہیں لیکن اگر کوئی شخص ضحیٰ کے وقت صلوٰۃ کسوف پڑھ لے تو وہ صلوٰۃ ضحیٰ کے قائم مقام قرار

پائے گی لیکن اس کو صلوٰۃ ضحیٰ نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح حضور ﷺ کی وہ رکعات تراویح جو حضور ﷺ نے آخر شب میں ادا فرمائیں اگرچہ ان کا نام صلوٰۃ تہجد نہیں لیکن چونکہ وہ تہجد کے وقت میں پڑھی گئی تھیں اس لئے تہجد کے قائم مقام ضرور ہوں گی۔

☆ رہا یہ شبہ کہ نمازِ تہجد حضور ﷺ پر فرض تھی اور نماز تراویح نفل تو اگر پچھلی رات کی تراویح کو تہجد کے قائم مقام کیا جائے تو لازم آئے گا کہ نفل فرض کے قائم مقام ہو جائے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ نمازِ تہجد کی فرضیت حضور ﷺ کے حق میں یقینی اور متفق علیہ نہیں اور اگر اس سے قطع نظر کر لیا جائے تو میں عرض کروں گا کہ جب حضور ﷺ پر نمازِ تہجد فرض تھی تو کیا یہ ممکن نہیں کہ حضور ﷺ نے آخری رکعت تراویح میں تہجد کی نیت فرمائی ہو۔ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ متنفل کی اقتداء مفترض کے ساتھ لازم آئے گی وہ بالاتفاق جائز ہے۔ دوسرے یہ کہ جس طرح نمازِ تہجد کی فرضیت حضور ﷺ کا خاصہ تھا اسی طرح حضور ﷺ کی تراویح کا حضور ﷺ کے تہجد کے قائم مقام ہونا بھی حضور ﷺ کا خاصہ ہو سکتا ہے۔ شرعاً وعقلاً اس میں کوئی استحالہ نہیں۔ لہٰذا ہر تقدیر پر وجود احتمال کی وجہ سے یہ شبہ وارد ہوا وہ بے بنیاد ہے۔

☆ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ باب التحریض علی قیام اللیل فصل اول کی حدیث "ینزل ربنا تبارک وتعالٰی کل لیلة الی السماء الدنیا حین یبقٰی ثلث اللیل الاٰخر" کے تحت فرماتے ہیں "قال فی النهایة تخصیص الثلث الاٰخر لانه وقت التهجد" مرقاۃ ج ۳ ص ۱۴۵۔ نہایہ میں کہا کہ رات کے آخری تہائی حصہ کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہ تہجد کا وقت ہے۔

☆ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ صلوٰۃ تہجد کے لئے ضروری نہیں کہ وہ نوافل کے وقت پڑھی جائے بلکہ نمازِ عشاء کے بعد سو کر اٹھنے پر جو نماز پڑھ لی جائے اس سے تہجد حاصل ہو جاتا ہے۔ علامہ شامی ردالمختار ج اول ص ۵۰۶ پر فرماتے ہیں "تنبیه: ظاهر امر ان التهجد لا یحصل الا بالتطوع فلو نام بعد صلوٰة العشاء ثم قام فصلّٰی فرایت لا یسمّٰی تهجدا وتردد فیه بعض الشافعیة والظاهر ان تقییده بالتطوع بناء علی الغالب وانه یحصل بای صلوٰة کانت"

☆ گزشتہ بیان کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ تہجد بغیر نفل کے ادا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر کوئی شخص نمازِ عشاء کے بعد سو گیا پھر اٹھ کر فوت شدہ فرض یا واجب نمازیں پڑھیں تو اس نماز کا نام تہجد نہ ہوگا اور بعض شافعیہ نے اس میں تردد کیا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ تہجد کو نفل سے مقید کرنا بناء علی الغالب ہے اور حقیقت یہ ہے کہ (تہجد) وقت تہجد میں ہر قسم کی نماز پڑھنے سے ادا ہو سکتا ہے (انتہی) مثلاً اگر تہجد کے وقت میں تراویح پڑھی گئی تو نمازِ تہجد بھی ادا ہو جائے گی اور یہی مطلب تھا حضرت عمر کا کہ اگر آخر شب میں صلوٰۃ تراویح پڑھی جاتی تو تراویح کے ساتھ تہجد بھی ادا ہو جاتا۔

☆ نمازِ تہجد کا وقت احادیث منقولہ اور عبارات علماء وفقہا کی روشنی میں بعد العشاء خواب سے بیدار ہونے کے بعد ہی ہے۔

☆ اس مقام پر یہ شبہ وارد کرنا کہ حضور ﷺ نے رمضان شریف میں جو تین رات تراویح پڑھی ان راتوں میں نمازِ تہجد ادا نہیں فرمائی اور آخری رات حضور ﷺ سوئے بھی نہیں تو وقت تہجد کا تحقق بھی نہیں ہوا، کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ تراویح مذکورہ تین

راتوں میں پہلی اور دوسری رات حضور ﷺ کا آخر شب میں معتد بہ نیند فرما کر نمازِ تہجد پڑھنا قطعاً امر مستبعد اور محال نہیں اگر چہ منقول نہ ہو کیونکہ عدم نقل عدم وجود کو مستلزم نہیں۔ البتہ تیسری رات کے متعلق شبہ کیا جا سکتا ہے مگر غور کرنے سے یہ شبہ بھی بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ تحقق تہجد کے لئے قابل ذکر اور معتد بہ نیند کرنا ضروری نہیں۔ صرف اس قدر سو جانا بھی کافی ہے جسے لغۃً اور شرعاً نیند کہا جاتا ہے اگر چہ وہ قلیل ہی کیوں نہ ہو۔ جس طرح احکام وضو میں جس نیند کو شرعاً فی بعض الاحوال معتبر مانا گیا ہے اس کا بھی یہی حال ہے اور ایسی قلیل ترین نیند کا اس رات متحقق ہو جانا ہرگز امر بعید نہیں۔ عام طور پر نماز پڑھتے ہوئے بھی اتنی نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ پھر یہ امر یہ امر بھی محتاجِ بیان نہیں کہ ایسی نیند عام طور پر معتد بہ اور قابل ذکر نہیں ہوا کرتی۔ لہٰذا اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اس رات تمام شب حضور ﷺ نمازِ تراویح کے لئے بیدار رہے تو یہ قول اس اقل قلیل نیند کے منافی نہ ہوگا۔

☆ البتہ یہ ضرور ہے کہ حضور ﷺ نے اس رات نمازِ تہجد مستقلاً علیحدہ نہیں پڑھی مگر اس بنا پر حضور سید عالم ﷺ کے حق میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ معاذ اللہ حضور ﷺ نے اس رات تہجد ترک فرما دیا تھا کیونکہ جمہور امت مسلمہ کے نزدیک حضور ﷺ پر نمازِ تہجد فرض تھی۔ حضور ﷺ کے حق میں العیاذ باللہ ترکِ فرض کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ضرور کہا جائے گا کہ تہجد کے وقت میں جو نماز نفل بھی پڑھ لی جائے اس سے تہجد ادا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس رات تراویح پڑھنے سے حضور ﷺ کی نمازِ تہجد بھی ادا ہو گئی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نمازِ عشاء کے فوراً بعد اول شب میں یا بغیر سوئے نمازِ تہجد ادا ہو جاتی ہے، ان کا دعویٰ اس حدیث سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ حضور ﷺ نے ایسا نہیں کیا کہ اول ہی شب میں نمازِ تراویح پڑھ کر سحر تک سو گئے ہوں بلکہ تمام رات تراویح ادا فرمائی اور اس میں حضور ﷺ کی وہی نماز نمازِ تہجد کے قائم مقام قرار پائے گی جو آپ نے آخر شب میں پڑھی تھی۔ اس لئے کہ اول شب میں حضور ﷺ کا تہجد پڑھنا کسی حدیث سے آج تک ثابت نہیں ہو سکا۔ حدیث کفتاہ عن التہجد ہمارے اس دعویٰ کو زیادہ واضح کر دیتی ہے اس لئے اگر قبل النوم تہجد متحقق ہوتا تو ان دو رکعتوں کو عین تہجد قرار دیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا جس سے واضح ہو گیا کہ قبل النوم تہجد متحقق نہیں ہو سکتا۔

☆ ہماری اس تحقیق سے حسب ذیل امور دلائل کی روشنی میں واضح ہو گئے۔

(۱) نمازِ تراویح کو تراویح کہنا اس دعوے کی روشن دلیل ہے کہ آٹھ رکعت تراویح کا قول باطل اور بیس رکعت صحیح اور درست ہے۔

(۲) نمازِ تراویح کا وقت بعد نمازِ عشاء اول سے آخر تک ہے۔ یعنی نمازِ عشاء کے بعد رات میں جس وقت بھی نمازِ تراویح پڑھی جائے، جائز ہے۔

(۳) رسول اللہ ﷺ نے نمازِ تراویح رات کے تینوں حصوں میں سے ہر حصہ میں پڑھی اور تمام رات بھی تراویح پڑھنے میں گزار دی۔

(۴) نمازِ تہجد حضور ﷺ نے سونے سے پہلے اول شب میں کبھی نہیں پڑھی۔

(۵) نمازِ تہجد کا وقت نمازِ عشاء کے بعد سو کر اٹھنے سے پہلے نہیں ہوتا۔

(۶) قیام اللیل اور صلوٰۃ لیل عام ہے اور صلوٰۃ تہجد خاص۔

(۷) جس طرح صلوٰۃ لیل اور تہجد ایک نہیں اسی طرح صلوٰۃ تہجد اور صلوٰۃ تراویح بھی ایک نہیں۔ اس لئے کہ تہجد کا وقت نمازِ عشاء کے بعد نیند سے اٹھنے کے بعد ہے اور صلوٰۃ تراویح کا وقت اول شب سے اخیر شب تک ہے۔

(۸) صلوٰۃ لیل اور صلوٰۃ تہجد رمضان اور غیر رمضان تمام اوقات میں مشروع ہے اور صلوٰۃ تراویح صرف ماہِ رمضان المبارک کے ساتھ مخصوص ہے۔ غیر رمضان میں شرعاً تراویح مشروع نہیں۔

(۹) رسول اللہ ﷺ نے نمازِ تراویح جماعت کے ساتھ صرف تین دن پڑھی ہے اور بس۔

(۱۰) صلوٰۃ تہجد ابتدائے اسلام میں ہجرت سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی اور صلوٰۃ تراویح مدینہ منورہ میں ۲ھ میں صیام رمضان کی فرضیت کے ساتھ مشروع ہوئی۔

(۱۱) صلوٰۃ تہجد ابتدائے اسلام میں فرض تھی اس کے بعد نفل ہو گئی اور صلوٰۃ تراویح کسی وقت بھی فرض ہو کر مشروع نہیں ہوئی۔

(۱۲) اگر کسی شخص نے نمازِ عشاء پڑھی اور پھر وہ تمام رات بیدار رہ کر نوافل پڑھتا رہا تو وہ تہجد گزار نہیں اس لئے کہ تہجد کا وقت سونے سے پہلے نہیں ہوتا۔

(۱۳) اگر کسی نے تہجد کے وقت میں تراویح پڑھ لی تو اگرچہ اس تراویح کا نام صلوٰۃ نہیں رہا لیکن صلوٰۃ تہجد کے قائم مقام ضرور ہے۔

(۱۴) صلوٰۃ تہجد نفل کے علاوہ غیر نفل سے بھی ادا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نمازِ تراویح میں جماعت مشروط نہیں بلکہ افضل واولیٰ ہے

☆ دیکھئے مبسوط سرخسی ج ۲ ص ۱۴۴ (افضل الثانی انها تؤدی بجماعة ام فرادیٰ) کے تحت فرماتے ہیں "وقال عیسی بن ابان وبكار بن قتيبة والمزني من اصحاب الشافعي واحمد بن عمر ان رحمهم الله تعالىٰ الجماعة احب وافضل هو المشهور عن عامة العلماء رحمهم الله تعالىٰ وهو الاصح والاوثق." عیسیٰ بن ابان اور بکار بن قتیبہ اور مزنی نے کہا جو اصحاب شافعی سے ہیں اور احمد بن عمران کا بھی یہی قول ہے کہ تراویح میں جماعت احب اور افضل ہے اور عامہ علماء سے بھی یہی مشہور ہے اور یہی اصح اور اوثق ہے۔

☆ اس عبارت سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ صحت تراویح کے لئے جماعت شرط نہیں بلکہ تراویح جماعت کے ساتھ ہو تو افضل اور اولیٰ ہے۔ دوسرے یہ کہ نمازِ تراویح نمازِ تہجد کی غیر ہے کیونکہ نمازِ تہجد میں جماعت احب اور اولیٰ نہیں۔

☆ اس کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث پر کلام کرتا ہوں جو صحیحین میں مروی ہے اور جس حدیث کو غیر مقلدین بیس رکعت تراویح کے خلاف آٹھ رکعت تراویح کے ثبوت میں بڑے شد و مد سے پیش کیا کرتے ہیں۔ وهو هذا

☆ "ما كان رسول الله ﷺ يزيد في رمضان ولا في غيره على احدىٰ عشر ركعة." غیر مقلدین کا بیان یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نماز کبھی نہیں پڑھی۔ ان گیارہ رکعت میں تین وتر ہوتے تھے

اورغیر رمضان میں بھی بغیر جماعت کے وہی آٹھ رکعتیں تہجد ہوتی تھیں۔ ہمارے بیان سابق سے غیر مقلدین کے اس بیان کی حقیقت واضح ہوگئی اور وہ یہ کہ ہم نے دلائل سے ثابت کر دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے تراویح ہمیشہ اول لیل میں پڑھی۔ اگرچہ فراغت کبھی نصف شب میں ہوئی اور کبھی تمام شب میں لیکن نمازِ تراویح کا آغاز رسول اللہ ﷺ نے ہر دفعہ اول رات میں فرمایا اور صلوٰۃ تہجد حضور ﷺ نے عمر شریف میں کبھی ایک مرتبہ بھی اول شب میں ادا نہیں فرمائی بلکہ ہمیشہ آخر شب میں حضور ﷺ تہجد پڑھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ حدیث نمازِ تراویح کے متعلق نہیں بلکہ صلوٰۃ تہجد کے متعلق ہے۔ اس لئے کہ نمازِ تراویح صرف رمضان میں ہوتی ہے اور حدیث میں رمضان اور غیر رمضان کی نماز کا ذکر ہے۔ رمضان اور غیر رمضان میں رات کی تراویح نہیں بلکہ نماز تہجد ہے۔

☆ ثابت ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی صلوٰۃ تہجد کو بیان فرما رہی ہیں نہ کہ حضور ﷺ کی صلوٰۃ تراویح کو۔ ہمارے اس دعوٰی کی دلیل اس حدیث کا آخری حصہ ہے جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ سے عرض کرتی ہیں کہ "اتنام قبل ان توتر؟" حضور ﷺ کیا آپ وتر پڑھنے سے پہلے سوجاتے ہیں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "یا عائشة تنام عینی ولا ینام قلبی" اے عائشہ ہماری آنکھ سوتی ہے دل نہیں سوتا۔ یہ امر مخالفین کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ ان گیارہ رکعتوں میں تین وتر اور آٹھ نفل ہوتے ہیں اور یہ آٹھ اور تین پوری گیارہ رکعتیں حضور ﷺ ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ جب وتر سے پہلے حضور ﷺ کا خواب استراحت فرمانا اس حدیث سے ثابت ہوا تو وہ آٹھ نفل جو وتر کے ساتھ ہی پڑھتے تھے ان سے پہلے بھی حضور ﷺ کا نیند فرمانا ثابت ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی یہ گیارہ رکعت والی نماز تراویح نہیں بلکہ تہجد اور وتر کی نماز ہے۔ اس لئے کہ نیند سے بیدار ہوکر جو نماز پڑھی جائے وہی نماز تہجد ہے۔ حدیث کے اس آخری حصے سے یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ غیر مقلدین جس نماز کو صلوٰۃ تراویح کہتے ہیں وہ صلوٰۃ تہجد ہے چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فتاوٰی عزیزی ج اول ص ۱۱۹ مطبوعہ مجتبائی میں اسی گیارہ رکعت والی حدیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ "روایت محمول بر نماز تہجد است کہ در رمضان وغیر رمضان یکساں بود۔ غالباً بعد یازدہ رکعت مع الوتر می رسد دلیل برایں حمل آں است کہ راوی ایں حدیث ابوسلمہ است در تتمہ ایں روایت می گوید "قالت عائشة رضی اللہ عنها فقلت یا رسول اللہ ﷺ اتنام قبل ان توتر قال یا عائشة ان عینی تنامان و لا ینام قلبی۔" کذا رواہ البخاری و مسلم ظاہر است کہ نوم قبل از وتر در نماز تہجد متصور می شود نہ غیر آں" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی گیارہ رکعت والی روایت نمازِ تہجد پر محمول ہے۔ اسلئے کہ نمازِ تہجد رمضان اور غیر رمضان میں یکساں تھی جس کی عدد وتر کے ساتھ غالباً گیارہ تک پہنچتا تھا۔

☆ اس روایت کے تہجد پر محمول ہونے کی دلیل یہ ہے کہ راوی حدیث ابوسلمہ اس روایت کے تتمہ میں کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ وتر پڑھنے سے پہلے سوجاتے ہیں؟ فرمایا، اے عائشہ! ہماری آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے اس طرح روایت کیا ہے اور ظاہر ہے کہ وتر سے پہلے سونا صلوٰۃ تہجد ہی میں متصور ہوسکتا ہے نہ اس کے غیر میں۔ علامہ ابن حجر عسقلانی بھی گیارہ رکعت والی نماز کو صلوٰۃ تہجد اور وتر

قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فتح الباری ج ۳ ص ۱۶ پر ہے "وظھرلی ان الحکمۃ فی عدم الزیادۃ علٰی احدٰی عشرۃ ان التھجد والوتر مختص بصلٰوۃ اللیل۔" الخ

☆ الحمد للّٰہ! ہم نے روشن دلیلوں سے یہ ثابت کردیا کہ گیارہ رکعت والی حدیث سے صلٰوۃ تہجد مراد ہے اور تراویح دو مختلف نمازیں ہیں۔ اب ہم ثابت کرتے ہیں کہ نماز تراویح بیس رکعت ہے۔

(۱) وعن ابن عباس ان النبی ﷺ کان یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ سوی الوتر و رواہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہٖ والطبرانی فی الکبیر وعند البیھقی وعبد بن حمید والبغوی وزاد البیھقی فی غیر جماعۃ بعد قولہٖ فی رمضان وضعفہٗ شرح النقایۃ ج اول ص ۱۰۴ او سنن بیہقی ج ۲ ص ۴۹۶

(۲) وعن السائب بن یزید قال کنا نقوم فی زمن عمر بعشرین رکعۃ والوتر رواہ البیھقی فی المعرفۃ باسناد صحیح (شرح النقایہ ص ۱۰۴ ج ۱)

(۳) عن یزید بن رومان قال کان الناس یقومون فی زمن عمر بن الخطاب فی رمضان بثلاث وعشرین رکعۃ (موطا امام مالک شرح النقایہ ج اول ص ۱۰۴ ج ۲ ص ۴۹۶ وسنن بیہقی)

(۴) عن ابی بن کعب ان عمر بن الخطاب امرہٗ ان یصلی باللیل فی رمضان قال ان الناس یصومون النھار ولا یحسنون ان یقرء و افلو قرات علیھم باللیل فقال یا امیر المؤمنین ھذا شیء لم یکن فقال قد علمت ولٰکنہ حسن فصلّٰی بھم عشرین رکعۃ۔ (رواہ ابن منیع کنز العمال ج ۴ ص ۲۸۴ حدیث ۵۷۸۷)

(۵) عن السائب بن یزید قال کانوا یقومون علٰی زمن عمر فی شھر رمضان بعشرین رکعۃ رواہ البیھقی فی السنن باسناد صحیح (فتح الباری ج ۴ ص ۲۰۴ کتاب صلٰوۃ التراویح عینی جز و اطبع جدید ص ۱۲۷ جامع الرضوی المعروف بصحیح البھاری ج ۳ ص ۵۹۸)

(۶) وعن ابی عبد الرحمٰن السلمی ان علیا دعا القراء فی رمضان فامر رجلا یصلی الناس عشرین رکعۃ وکان علی یوتر بھم (رواہ البیھقی فی سننہ، منھاج السنۃ لابن تیمیہ جز ورابع ص ۲۲۴ مطبوعہ مصر)

(۷) وعن شبرمۃ بن شکل وکان من اصحاب علی انہٗ کان یؤمھم فی رمضان فیصلی خمس ترویحات عشرین رکعۃ رواہ البیھقی

(۸) رویٰ عبد الرزاق فی المصنف عن داؤد بن قیس وغیرہٖ عن محمد بن یوسف عن السائب بن یزید ان عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنھما جمع الناس فی رمضان علٰی ابی بن کعب وعلٰی تمیم الداری علٰی احدٰی وعشرین رکعۃ۔ (عینی جز و اطبع جدید ص ۱۲۷ طبع جدید)

(۹) روی الحارث بن عبد الرحمٰن عن السائب بن یزید قال کان القیام علٰی عهد عمر بثلٰث وعشرین رکعة.

(۱۰) وروی محمد بن نصر من روایة یزید بن خصیفة عن السائب بن یزید انهم کانوا یقومون فی رمضان بعشرین رکعة فی زمان عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه (عینی جزء ۱۱ طبع جدید ص ۱۲۷) فی قیام اللیل لمحمد بن نصر.

(۱۱) عن یحی بن سعید ان عمر بن الخطاب امر رجلا یصلی بهم عشرین رکعة رواه ابن ابی شیبة فی مصنفه واسناده مرسل قوی (مصنف ابن ابی شیبہ اوجز المسالک ج ۱ ص ۳۹۷)

(۱۲) واخرج محمد بن نصر عن محمد بن کعب القرظی کان الناس یصلون فی زمان عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه فی رمضان عشرین رکعة (اوجز المسالک ص ۳۹۸ الحدیث)

(۱۳) عن السائب بن یزید الصحابی قال کانوا یقومون علٰی عهد عمر رضی اللّٰه تعالٰی عنه بعشرین رکعة وعلٰی عهد عثمان رضی اللّٰه مثلهٗ رواه البیهقی باسناد صحیح (عینی ج ۷ طبع جدید ص ۱۷۸ شرح النقایہ ج اول ص ۱۰۴)

(۱۴) وعن ابی الحسناء (۱) ان علی بن ابی طالب امر رجلا یصلی بالناس خمس ترویحات عشرین رکعة (رواه البیهقی وکنزل العمال ج ۴ ص ۲۸۴ حدیث ۵۷۹۵ وبیہقی ج ۲ ص ۴۹۷)

(۱۵) واخرج ابن ابی شیبة عن ابی الحسن ان علیا امر رجلا یصلی بهم فی رمضان عشرین رکعة. (اوجز المسالک ج ۱ ص ۳۹۸)

(۱۶) روی محمد بن نصر بسندهٖ عن الاعمش عن زید بن وهب قال کان عبد اللّٰه بن مسعود یصلی لنا فی شهر رمضان قال الاعمش کان یصلی عشرین رکعة ویوتر بثلٰث قاله العینی. (اوجز المسالک ج ۱ ص ۳۹۸ عینی جز ۱۱ ص ۱۲۷ مطبوعہ جدید)

(۱۷) واخرج (ابن ابی شیبة) عن حسن بن عبد العزیز ان ابیا رضی اللّٰه تعالٰی عنه کان یصلی بهم فی رمضان بالمدینة عشرین رکعة. (اوجز المسالک ج ۱ ص ۳۹۸)

(۱۸) عن نافع عن ابن عمر کان ابن ابی ملیکة یصلی بنا فی رمضان عشرین رکعة رواه ابن ابی شیبة فی مصنفه واسناده صحیح (اوجز المسالک ج ۱ ص ۳۹۸)

(۱۹) روی محمد بن نصر من طریق علاء قال ادرکتهم فی رمضان یصلون عشرین رکعة وثلاث رکعات الوتر (فتح الباری ج ۴ ص ۲۰۴)

(۲۰) عن ابی الخصیب قال كان یؤمنا سوید بن غفلة فی رمضان فیصلی خمس ترویحات عشرین رکعة (رواه البیهقی واسناده حسن بیہقی ازاوجز المسالک ص ۳۹۷)

(۲۱) عن سعید بن عبید ان علی ابن ربیعة كان یصلی بهم فی رمضان خمس ترویحات و یوتر بثلاث اخرجه ابن ابی شیبة و اسناده صحیح. (اوجز المسالک ص ۳۹۸)

(۲۲) وروی محمد بن نصر عن شتیر بن شكل انهٗ كان یصلی فی رمضان عشرین رکعة و الوتر. (اوجز المسالک ج ا ص ۳۹۸)

(۲۳) اخرج ابن ابی شیبة بسنده عن ابی البختری انهٗ كان یصلی خمس ترویحات فی رمضان و یصلی بثلٰث كذا فی اثار السنن (اوجز المسالک ج ا ص ۳۹۸)

(۲۴) وعن الحارث انهٗ كان یؤم الناس فی رمضان بعشرین رکعة (اوجز المسالک ج ا ص ۳۹۸)

ان احادیث کا ترجمہ حسب ذیل ہے

۱۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وتر کے علاوہ رمضان میں بیس رکعت پڑھتے تھے۔

۲۔ سائب بن یزید صحابی سے مروی ہے کہ ہم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بیس رکعت اور وتر پڑھتے تھے۔

۳۔ یزید بن رومان سے روایت ہے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تیئیس رکعت پڑھتے تھے یعنی بیس تراویح اور تین وتر۔

۴۔ سید القراء حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں امر فرمایا کہ وہ لوگوں کو رمضان شریف کے مہینے میں رات کی نماز پڑھایا کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اے ابی بن کعب لوگ دن میں روزہ رکھتے ہیں اور قرأت بخوبی ادا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا کیا اچھا ہوتا کہ آپ ان پر (امام صلوٰۃ ہونے کی حالت میں) قرأت فرمادیا کرتے۔ حضرت ابی بن کعب نے عرض کیا اے امیر المومنین یہ ایسی چیز ہے جو پہلے نہ تھی (یعنی اہتمام خاص کے ساتھ تراویح کی جماعت اس سے پہلے نہ ہوتی تھی) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن یہ کام اچھا ہے۔ پس حضرت ابی بن کعب نے لوگوں کو بیس رکعت نماز تراویح پڑھائی۔

۵۔ حضرت سائب بن یزید سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ماہِ رمضان المبارک میں بیس رکعت پڑھتے تھے۔

۶۔ حضرت عبدالرحمٰن سلمی سے روایت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے رمضان شریف کے مہینے میں قرآن کے قاریوں کو بلایا اور ان میں سے ایک کو بیس رکعت پڑھانے کا حکم دیا اور حضرت علی خود وتر پڑھاتے تھے۔

۷۔ حضرت شبرمہ بن شکل سے روایت ہے جو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اصحاب سے تھے کہ وہ رمضان شریف میں

لوگوں کی امامت کرتے تھے اور پانچ تراویحے (بیس رکعت نماز) پڑھا کرتے تھے۔

۸۔ عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں داؤد بن قیس وغیرہ سے، محمد بن یوسف سے، سائب بن یزید سے روایت کی کہ عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لوگوں کو رمضان میں ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر اکیس رکعت ادا کرنے پر جمع کیا۔

۹۔ حارث بن عبدالرحمٰن نے سائب بن یزید سے روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں لوگوں کا قیام تیئیس رکعت پر تھا۔

۱۰۔ محمد بن نصر نے یزید بن خصیفہ کی روایت سے حضرت سائب بن یزید سے روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں لوگ رمضان شریف میں بیس رکعت پڑھا کرتے تھے۔

۱۱۔ یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعت تراویح پڑھایا کرے۔

۱۲۔ محمد بن نصر نے محمد بن کعب قرظی سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں لوگ بیس رکعت پڑھتے تھے۔

۱۳۔ حضرت سائب بن یزید سے روایت ہے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بیس رکعت پڑھتے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی اسی طرح پڑھتے تھے۔

۱۴۔ ابوالحسنا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو "پانچ ترویحے" بیس رکعت پڑھائے۔

۱۵۔ ابن ابی شیبہ نے ابوالحسن سے روایت کی کہ حضرت علی نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو رمضان میں بیس رکعت پڑھائے۔

۱۶۔ محمد بن نصر نے اپنی سند سے بواسطہ اعمش زید بن وہب سے روایت کی کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ رمضان کے مہینہ میں ہمیں نماز پڑھاتے تھے۔ اعمش نے کہا کہ بیس رکعت پڑھاتے تھے اور تین وتر پڑھتے تھے۔

۱۷۔ ابن ابی شیبہ نے حسن بن عبدالعزیز سے روایت کی کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں رمضان شریف میں لوگوں کو بیس رکعت پڑھاتے تھے۔

۱۸۔ حضرت نافع حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ابن ابی ملکیہ صحابی رمضان شریف میں ہمیں بیس رکعت پڑھاتے تھے۔

۱۹۔ محمد بن نصر حضرت عطا کی حدیث روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ان کو اس حال میں پایا کہ وہ رمضان شریف میں بیس رکعت تراویح اور تین وتر پڑھتے تھے۔

۴۰۔ ابو الخصیب سے روایت ہے کہ سوید بن غفلہ رمضان شریف میں ہماری امامت فرماتے تھے تو پانچ ترویحے "بیس رکعت" پڑھاتے تھے۔

۴۱۔ سعید بن عبید سے روایت ہے کہ علی ابن عبیعہ رمضان شریف میں لوگوں کو پانچ ترویحے اور تین وتر پڑھاتے تھے۔

۴۲۔ محمد بن نصر شیتر بن شکل سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رمضان شریف میں بیس رکعتیں اور وتر پڑھاتے تھے۔

۴۳۔ ابن ابی شیبہ نے اپنی سند سے ابو البختری سے روایت کیا کہ وہ رمضان شریف میں پانچ ترویحے پڑھاتے تھے اور تین وتر۔

۴۴۔ حارث سے روایت ہے کہ وہ رمضان شریف میں بیس رکعت کے ساتھ لوگوں کی امامت کرتے تھے۔

احادیث پر غیر مقلدین کے اعتراضات

۱۔ بیس رکعت تراویح کے ثبوت میں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے حضرت ابن عباس کی جو حدیث مرفوع پیش کی گئی ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ اس کا راوی ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان جو امام ابو بکر ابن شیبہ کا دادا ہے باتفاق ائمہ حدیث ضعیف ہے۔

۲۔ یہ حدیث، حدیث عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مخالف ہے۔ جس میں رمضان وغیر رمضان میں گیارہ رکعت تراویح پڑھنے کا ثبوت ہے۔

۳۔ موطا امام مالک سے یزید بن رومان کی جو حدیث نقل کی جاتی ہے کہ حضرت عمر کے زمانے میں لوگ تیئیس رکعتیں پڑھتے تھے اس کی سند صحیح نہیں بلکہ منقطع ہے اس لئے کہ یزید بن رومان نے حضرت عمر کا زمانہ نہیں پایا۔ نیز یہ کہ اس حدیث میں اس بات کا ذکر نہیں کہ لوگ خود بخود تیئیس رکعتیں پڑھتے تھے یا حضرت عمر نے ان کو حکم دیا تھا۔

۴۔ حضرت عمر خود تیئیس رکعت والی جماعت میں شامل نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کے اس فعل پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے تھے "التی تنامون عنها افضل من التی تقومونها" یعنی رات کے جس حصے میں تم سو جاتے ہو وہ اس سے بہتر ہے۔ جس میں تم نماز پڑھتے ہو۔

۵۔ بیس رکعت والی حدیثیں حضرت جابر کی اس حدیث کے بھی خلاف ہیں۔ جس میں ابن حبان اور ابن خزیمہ نے آٹھ رکعت تراویح کو روایت کیا ہے۔ بیس رکعت والی حدیثیں موطا امام مالک کی اس حدیث کے بھی خلاف ہیں۔ جس میں مذکور ہے کہ حضرت عمر نے ابی بن کعب اور تمیم داری جیسے لوگوں کو گیارہ رکعت تراویح پڑھانے کا حکم دیا۔

۶۔ علمائے احناف اور دیگر علمائے مقلدین نے بھی بیس رکعت والی حدیثوں کو ضعیف اور گیارہ رکعت والی کو صحیح تسلیم کیا ہے۔

۷۔ امام مالک کے متعلق عینی میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنے لئے گیارہ رکعات پسند کیں۔

اعتراضاتِ مذکورۃ الصدر کے جوابات حسب ذیل ہیں

۱۔ یہ صحیح ہے کہ ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں حضرت ابن عباس سے بیس رکعت تراویح کے متعلق جو مرفوع حدیث روایت کی ہے اس کا راوی ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان ضعیف ہے مگر ایسا ضعیف نہیں کہ اس کی روایات کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔

☆ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوری رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ عزیزی ج اص ۱۱۹ پر فرماتے ہیں حالانکہ ابوشیبہ جد ابو بکر آں قدر ضعف ندارد کہ روایت او مطروح مطلق ساختہ شود یعنی جد ابو بکر ابوشیبہ اس قدر ضعف نہیں رکھتا کہ اس کی روایت کو مطلقاً نظر انداز کر دیا جائے۔ ہاں اگر کوئی حدیث ضعیف کسی حدیث صحیح کے معارض ہو تو البتہ ساقط ہوگی لیکن حدیث ضعیف مذکور کسی حدیث صحیح کے ساتھ معارض نہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اسی فتاویٰ عزیزی ج اص ۱۱۹ پر فرماتے ہیں آرے اگر معارض او حدیث صحیح می شد البتہ ساقط می گشت "وقد سبق ان یتوھم معارضا لہ اعنی حدیث ابی سلمۃ عن عائشۃ المتقدم ذکرہ لیس معارضا لہ بالحقیقۃ فبقی سالما۔"

☆ یعنی اگر اس کے معارض کوئی حدیث صحیح ہوتی تو وہ ضرور ساقط ہوتی۔ حالانکہ سابقاً گزر چکا ہے کہ ابوسلمہ سے حضرت عائشہ کی جس متقدم الذکر حدیث کے معارض ہونے کا وہم کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً اس کے معارض نہیں لہٰذا حدیث (ابن عباس) معارضت سے سالم رہی۔

☆ علاوہ ازیں حدیث مرفوع ضعیف اگر فعل صحابہ سے مؤید ہو تو وہ اپنے مؤید ہونے کی حیثیت سے ضرور قابل احتجاج ہوتی ہے۔ یہی شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث ابن عباس کے تحت فرماتے ہیں "کیف وقد تاید بفعل الصحابۃ کما رواہ البیھقی فی سننہ باسناد صحیح۔" اھ یعنی یہ حدیث مرفوع کیونکر ساقط ہو سکتی ہے حالانکہ اس کی تائید فعل صحابہ سے ہو چکی ہے۔ جبکہ بیہقی نے اپنے سنن میں سند صحیح کے ساتھ صحابہ کرام کا بیس رکعتیں پڑھنا روایت کیا ہے۔

☆ بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ وہ فعل صحابہ روایات کثیرہ سے ثابت ہو اور سوائے ایک گروہ قلیل کے جمہور امت علمائے مجتہدین نیز ائمہ اربعہ سب کا مذہب اس کے موافق ہو۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے ۱۴ احادیث اور عبارات علماء وفقہا اس حدیث کی تائید اور تقویت میں پیش کر چکے ہیں۔

۲۔ بیس رکعت تراویح کی احادیث کو گیارہ رکعت والی حدیث کے معارض سمجھنا قلت تدبر پر مبنی ہے۔ جس کی وجوہ حسب ذیل ہیں

☆ راوی حدیث ابوسلمہ نے حضرت صدیقہ سے رسول اللہ ﷺ کی جس صلوٰۃ لیل کے متعلق سوال کیا تھا اس سے مراد ان کی صلوٰۃ تہجد تھی اور مقصد یہ تھا کہ اے ام المومنین آپ یہ بتائیں کہ رمضان شریف میں حضور ﷺ کی نماز تہجد کا کیا حال تھا یعنی غیر رمضان کی صلوٰۃ تہجد سے کچھ زیادہ ہوتی تھی یا مساوی حضرت عائشہ نے جواب دیا حضور ﷺ کی نماز تہجد رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ رہا یہ امر کہ اس حدیث میں وہ کون سا قرینہ ہے۔ جس کی وجہ سے ہم اس نماز کو صلوٰۃ تہجد پر محمول کریں تو اس کا جواب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالحی لکھنوی مرحوم کی عبارت منقولہ سے ہم دے چکے ہیں کہ اس حدیث کے آخر

میں وارد ہے کہ حضرت عائشہ نے حضور علیہ السلام سے پوچھا اتنام قبل ان توتر کیا آپ وتر پڑھنے سے پہلے سوجاتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ اس نماز سے پہلے سوجاتے تھے اور ظاہر ہے کہ صلوٰۃ لیل میں نماز سے پہلے سوجانا صلوٰۃ تہجد ہی کے ساتھ خاص ہے۔ ثابت ہوا کہ یہ سوال و جواب مطلق صلوٰۃ لیل سے متعلق نہیں بلکہ خاص صلوٰۃ تہجد سے متعلق ہے۔ اس صورت میں گیارہ رکعت اور بیس رکعت والی احادیث کے مابین کوئی تعارض نہیں رہتا کیونکہ وہ بیس رکعتیں نماز تراویح میں ہیں جو ماہ رمضان کے ساتھ خاص ہیں اور حضرت عائشہ کی حدیث میں نمازِ تہجد کا ذکر ہے جو رمضان اور غیر رمضان دونوں میں یکساں طور پر مشروع ہے۔

☆ حضرت عائشہ صدیقہ نے حضور علیہ السلام کی صلوٰۃ لیل کی زیادتی کو جو گیارہ رکعت پر منحصر کیا ہے وہ ان کے اپنے علم کے مطابق ہے اور یہ اس امر کے منافی نہیں کہ حضرت عائشہ کے علاوہ کسی دوسرے کے نزدیک اس کا عدد گیارہ سے زیادہ ثابت ہو جائے۔

☆ اگر بیس رکعت کی حدیثوں کو گیارہ رکعت والی حدیث کے معارض قرار دیا جائے تو جس طرح بیس اور گیارہ میں تعارض ہے اسی طرح گیارہ اور تیرہ میں بھی تعارض ہوگا اور سولہ اور سترہ کے ساتھ بھی گیارہ کا عدد معارض قرار پائے گا حالانکہ خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بخاری شریف ج اول کتاب الصلوٰۃ باب یقرأ فی رکعتی الفجر میں روایت ہے "عن عائشة رضی اللّٰه عنها قالت کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یصلی باللیل ثلٰث عشرة رکعة ثم یصلی اذا سمع النداء بالصبح رکعتین خفیفتین۔

☆ یعنی حضرت عائشہ فرماتی ہیں رسول اللہ علیہ السلام رات کو تیرہ رکعت پڑھتے تھے۔ غیر مقلدین تیرہ رکعت والی حدیث کے جواب میں کہا کرتے ہیں کہ ان تیرہ میں دو فجر کی سنتیں شامل ہیں لیکن بخاری شریف کی اس حدیث نے ان کے اس جواب کا قلع قمع کر دیا یعنی غیر مقلدین کہا کرتے ہیں حضور علیہ السلام قیام کے وقت پہلے دو خفیف رکعتیں پڑھا کرتے تھے حضرت عائشہ نے کبھی ان کا ذکر نہ کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دو رکعتوں کا بھی خفیف ہونا انہیں معاذ اللہ کالعدم نہیں کر دیتا۔ دیکھئے اسی حدیث بخاری میں فجر کی دو رکعتوں کا بھی خفیف ہونا مذکور ہے لیکن وہ کالعدم نہیں اور آج تک امت مسلمہ ان دو رکعتوں کو پڑھتی ہے۔ غیر مقلدین بھی ضرور پڑھتے ہوں گے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قیام لیل کی خفیف دو رکعتیں کالعدم قرار پائیں اور گیارہ پر حصر کر دیا جائے۔ اگر حضور علیہ السلام کی وہ پہلی دو رکعتیں کالعدم نہیں تو گیارہ پر صلوٰۃ لیل کا حصر یقیناً تیرہ اور سولہ کے معارض رہے گا۔

☆ اس حدیث میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ حضور علیہ السلام کی یہ تیرہ رکعتیں فجر کی سنتوں کے علاوہ ہوتی تھیں۔ نیز امام احمد نے اپنی زیادات علی المسند میں حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ حضور علیہ السلام رات میں فرض نماز کے سوا سولہ رکعتیں پڑھتے تھے جیسا کہ عینی ج ۷ ص ۲۰۳ پر ہے "واما حدیث علی بن ابی طالب فرواہ احمد فی زیادته علی المسند من روایة ابی اسحٰق عن عاصم بن ضمرة عن علی قال کان رسول اللّٰه علیہ السلام یصلی من اللیل ست عشرة رکعة سوی المکتوبة واسنادہ حسن" اس کے علاوہ ابن مبارک نے کتاب الزہد والرقائق میں ایک مرسل حدیث میں روایت کیا ہے "کان یصلی من اللیل

سبع عشرۃ رکعۃ" کہ حضور رات میں سترہ رکعتیں پڑھتے تھے۔

☆ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ حضرت عائشہ کی گیارہ رکعت والی حدیث بیس رکعت والی حدیثوں سے معارض ہے یا تیرہ، سولہ اور سترہ رکعت والی حدیثوں سے بھی اس کو معارض قرار دیا جائے گا۔ وہی تطبیق جو غیر مقلدین گیارہ اور تیرہ وغیرہ والی حدیثوں میں کرتے ہیں۔ بفضلہٖ تعالیٰ علمائے اہل سنت نے اس سے بہتر تطبیق گیارہ اور بیس رکعت والی احادیث کے درمیان کی ہے جس کا تھوڑا سا بیان قارئین کرام پڑھ چکے ہیں اور اس کی بقیہ تفصیل حسب ذیل ہے

☆ حضرت عائشہ کی گیارہ رکعت والی حدیث حضور علیہ السلام کے غالب احوال پر محمول ہے اور بیس رکعت والی حدیث تراویح رمضان کے ساتھ خاص ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام رمضان اور غیر رمضان میں اکثر وبیشتر گیارہ رکعتیں ہی پڑھا کرتے تھے البتہ بعض اوقات رمضان میں حضور علیہ السلام نے بیس رکعت تراویح بھی پڑھی ہیں۔ مولانا عبدالحی لکھنوی التعلیق الممجد علی موطا امام محمد میں ص ۱۳۸ حاشیہ نمبر ۱۱ پر فرماتے ہیں

اذ لا شك فی صحۃ حدیث عائشۃ وضعف حدیث ابن عباس لٰکن الاخذ بالراجح وترك المرجوح انما یتعین اذا تعارضا تعارضا لا یمکن الجمع وھھنا الجمع ممکن بان یحمل حدیث عائشۃ علٰی انہ اخبار عن حالہ الغالب کما صرح بہ الباجی فی شرح المؤطا وغیرہ ویحمل حدیث ابن عباس علٰی انہ کان ذٰلك احیانا

☆ یعنی اس میں شک نہیں کہ حضرت عائشہ کی حدیث صحیح ہے اور حضرت ابن عباس کی حدیث ضعیف ہے لیکن ضعیف کو چھوڑ کر صحیح کو لینا صرف اسی وقت متعین ہو سکتا ہے جب دونوں میں ایسا تعارض ہوا کہ تطبیق نہ ہو سکے اور یہاں تطبیق ممکن ہے بایں طور کہ حضرت عائشہ کی حدیث کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ وہ حضور علیہ السلام کے غالب حال سے خبر دے رہی ہیں جیسا کہ اس کی تصریح باجی نے شرح موطا میں اور ان کے علاوہ دوسرے علماء محدثین نے بھی کی ہے اور حضرت ابن عباس کی حدیث کو اوقات پر محمول کیا جائے۔

☆ اور یہ ظاہر ہے اس لئے کہ بیس رکعتیں صرف رمضان میں پڑھی گئی ہیں اور گیارہ رکعتیں رمضان اور غیر رمضان تمام سال کی راتوں میں پڑھی گئی ہیں۔

☆ تقریباً اسی مفہوم کی عبارت زرقانی شرح موطا امام مالک ص ۲۴۲ ج اول پر بھی مرقوم ہے جمع الوسائل میں ملا علی قاری کا بھی یہی قول ہے علاوہ ازیں حضور علیہ السلام کی صلوٰۃ لیل کے متعلق حضرت عائشہ کی روایات میں ایک اور اختلاف ہے جس کو علامہ ابن حجر نے فتح الباری ج ۳ ص ۱۶ پر بیان کیا ہے

ویؤیدہ ما وقع عند احمد وابی داؤد من روایۃ عبد اللّٰہ ابن ابی قیس عن عائشۃ بلفظ کان یوتر باربع وثلٰث وثمان و ثلٰث و عشر و ثلٰث ولم یکن یوتر باکثر من ثلٰث عشرۃ ولا انقص من سبع وھٰذا اصح ما وقفت علیہ من ذٰلك وبہ یجمع بین ما اختلف عن عائشۃ من ذٰلك واللّٰہ اعلم قال القرطبی اشکلت روایات عائشۃ علٰی کثیر من اھل العلم حتّٰی نسب بعضھم حدیثھا الی الاضطراب وھٰذا انما یتم لو کان الراوی عنھا واحدا او اخبرت عن وقت واحد والصواب ان کل شیء ذکرتہ من ذٰلك علٰی اوقات متعدد و احوال مختلفۃ بحسب النشاط وبیان الجواز واللّٰہ اعلم۔

☆ یعنی اس کی تائید امام احمد اور ابو داؤد کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو بروایت عبد اللہ بن ابی قیس حضرت عائشہ سے ان

لفظوں سے مروی ہے کہ حضور ﷺ وتر فرماتے۔ چار اور تین کے ساتھ اور چھ اور تین کے ساتھ اور آٹھ اور تین کے ساتھ اور دس اور تین کے ساتھ اور حضور ﷺ کا وتر کبھی دس اور تین سے زیادہ نہ ہوتا تھا اور سات سے کم نہ ہوتا تھا اور جس پر میں واقف ہوا ہوں یہ ان سب سے زیادہ صحیح ہے اور اس کے ساتھ ان روایات کے درمیان تطبیق ہو سکتی ہے جو اس بارے میں حضرت عائشہ سے مختلف طور پر وارد ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم. امام قرطبی نے فرمایا کہ حضرت عائشہ کی روایتیں اکثر اہل علم پر نہایت مشکل ہو گئیں یہاں تک کہ بعض نے ان کی حدیث کو اضطراب کی طرف منسوب کر دیا اور یہ (حضرت عائشہ کی روایت کو اضطراب کی طرف منسوب کرنا) اس وقت تمام ہو سکتا تھا جب کہ حضرت عائشہ سے ان سب کا راوی ایک ہی ہوتا یا وہ ایک ہی وقت کے متعلق خبر دیتیں اور صحیح یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس باب میں جو کچھ بھی ذکر کیا ہے وہ سب بحسب النشاط اور بیان جواز اوقات متعددا اور احوال مختلفہ پر محمول ہے۔ واللہ اعلم۔ یہی مضمون عینی ج ۷ ص ۲۰۵ پر مسطور ہے۔

☆ ان عبارات کی روشنی میں یہ امر آفتاب سے زیادہ روشن ہو گیا کہ گیارہ رکعت والی حدیث دوام اور استمرار پر محمول نہیں بلکہ اوقات متعددہ اور احوال غالبہ پر مبنی ہے۔ وللہ الحمد.

☆ ''غیر مقلدین آٹھ رکعت تراویح کے ثبوت میں محمد بن نصر مروزی کی کتاب قیام اللیل کے حوالہ سے ایک یہ حدیث بھی پیش کیا کرتے ہیں کہ حضرت ابی ابن کعب نے رمضان میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آج رات کو ایک بات ہو گئی۔ آپ نے فرمایا، کون سی بات ہو گئی اے ابی؟ حضرت ابی نے عرض کیا، میرے گھرانے کی عورتوں نے کہا کہ ہم لوگ قرآن نہیں پڑھتے ہیں پس ہم لوگ تمہارے پیچھے نماز پڑھیں گے اور تمہاری اقتداء کریں گے تو میں نے ان کو آٹھ رکعتیں اور وتر پڑھائے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر سکوت فرمایا۔

☆ غیر مقلدین کی ذہنیت بھی عجیب ہے۔ انہیں جہاں آٹھ رکعتیں نظر آئیں تو فوراً تراویح پر محمول کر دیا۔

☆ رمضان شریف میں نمازِ تراویح کی جماعت کا شروع ہونا اور مردوں عورتوں کے لئے نماز تراویح پڑھنے کا جواز فریقین کے نزدیک مسلم ہے لہٰذا رمضان شریف میں تراویح نماز پڑھا دینا کوئی ایسی بات نہیں جس میں کسی قسم کی ندرت پائی جائے۔ حالانکہ ابی بن کعب کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک ایسا واقعہ بیان کر رہے ہیں جس میں ان کے نزدیک انتہائی ندرت پائی جاتی ہے اور وہ اسے اپنے نزدیک بہت ہی نادر الوقوع سمجھتے ہیں کیونکہ وہ حضور ﷺ سے عرض کرتے ہیں ''یا رسول اللہ کان اللیلۃ شیءٌ یا رسول اللہ ﷺ آج رات ایک بات ہو گئی ہے۔ حضور نے فرمایا، ابی وہ کون سی بات ہو گئی ہے؟ حضرت ابی نے گزشتہ رات آٹھ رکعت نماز پڑھانے کا واقعہ بیان کیا۔ حضرت ابی کا حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کرنا یا رسول اللہ ﷺ آج رات ایک بات ہو گئی، صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایسی نئی بات ہے جو اسی رات میں ہوئی اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ ثابت ہوا کہ یہ نماز تراویح نہیں بلکہ نمازِ تہجد کی جماعت ہے جو بعض ائمہ کے نزدیک تداعی کے ساتھ بلا کراہت جائز ہے اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بغیر

تداعی کے بلا کراہت جائز قرار دیتے ہیں اور تداعی کے ساتھ مکروہ سمجھتے ہیں اس لئے کہ جمہور صحابہ اور سلف صالحین سے نماز تہجد کی جماعت تداعی اور اہتمام خاص کے ساتھ منقول نہیں۔

☆ علاوہ ازیں اس حدیث کی سند میں عیسیٰ ابن جاریہ ہے جس کے متعلق ابن معین نے کہا "عندہ مناکیر" اور نسائی نے کہا منکر الحدیث "وجاء عنه متروک" صرف ابو زرعہ نے "لا بأس به" کہا ہے جو ابن معین اور نسائی کی جرح شدید کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ (میزان الاعتدال)

☆ غیر مقلدین حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے بھی آٹھ رکعت تراویح ثابت کرتے ہیں "عن جابر رضی اللّٰہ تعالٰی عنه قال صلّٰی بنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فی رمضان ثمان رکعات ثم اوتر." حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں رمضان میں آٹھ رکعتیں پڑھائیں پھر وتر۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بالفرض اس حدیث کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے صرف اتنا ثابت ہوگا کہ حضرت جابر نے آٹھ رکعت بیان فرمائیں لیکن آٹھ کے عدد پر حصر کا قول نہیں کیا جو آٹھ سے زیادہ عدد کے منافی اور معارض ہو اور عدم حصر کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت جابر بعد میں آئے ہوں اور حضور ﷺ ان کے آنے سے قبل زائد رکعات پڑھ چکے ہوں۔ نیز اس امر کا بھی احتمال ہے کہ حضور ﷺ نے پہلے یا بعد میں آٹھ کے علاوہ زائد رکعات پڑھی ہوں جن کی نفی حضرت جابر کے قول سے ثابت نہیں ہوتی۔

☆ علاوہ ازیں حضرت جابر صرف ایک رات کا واقعہ اور وہ بھی اپنے علم کے مطابق بیان کر رہے ہوں اس میں بقیہ دو راتوں میں بیس عدد رکعات تراویح کی نفی اس حدیث میں کہاں ثابت ہوئی۔ اس کے بعد عرض ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ کسی محدث نے اس کو صحیح نہیں کہا۔ اس کی سند میں بھی عیسیٰ بن جاریہ ہے۔ جس کے متعلق ہم میزان الاعتدال سے نقل کر چکے ہیں کہ وہ منکر الحدیث تھا۔

☆ رہا یہ شبہ کہ علامہ ذہبی نے اس کی سند کو وسط کہا ہے ہرگز اس کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وسط کے معنی دنیا کی کسی لغت یا اصطلاح میں صحیح نہیں۔ وسط کے معنی ہیں درمیانی، اور اس میں کئی احتمال ہیں۔ صحت، حسن، ضعف سب کا درمیانی مراد ہو سکتا ہے لیکن عیسیٰ بن جاریہ کے حق میں خود علامہ ذہبی کا اسے منکر الحدیث ہونے کو نقل کرنا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ لفظ وسط سے ان کی مراد درمیانہ درجہ کی ضعیف ہے۔

☆ اس مقام پر یہ کہنا کہ علامہ ابن حجر نے التزام کیا ہے کہ فتح الباری میں کوئی ایسی حدیث نہیں لائی جائے گی جو صحیح یا حسن کے درجہ سے کم ہو اور چونکہ حدیث جابر فتح الباری میں موجود ہے اس لئے وہ صحیح نہیں تو حسن ضرور ہو گی انتہائی ابلہ فریبی اور سخن پروری ہے۔

☆ اتنی بات تو قابل قبول ہو سکتی تھی کہ فتح الباری کی اکثر و بیشتر روایات یا وہ احادیث جن کے راویوں پر ائمہ جرح و تعدیل کی جرح کتب متجر حہ میں مصرح نہیں صحیح یا حسن ہیں لیکن محض اپنی ضد پوری کرنے کے لئے آنکھیں بند کر کے علی الاطلاق اس کی ہر روایت پر مہر تصدیق ثبت کر دینا اور ائمہ حدیث کی جرح شدید کے باوجود اس کی حدیث کو صحیح یا حسن قرار دینا کسی اہل علم کے نزدیک صحیح نہیں ہو سکتا۔

☆ ابن حجر تو بخاری کے شارح ہیں۔ خود امام بخاری ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے التزام کیا ہے کہ صحیح بخاری میں سوائے صحیح حدیث کے کوئی غیر صحیح روایت داخل نہ کروں گا لیکن اس کے باوجود اس میں بھی بعض ایسی روایات موجود ہیں جو صحیح نہیں۔ اگر چہ ان کا وجود نادر ہے یہی وجہ ہے کہ شارحین کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تاویل کرنی پڑی ہے۔ دیکھئے مقدمہ فتح الباری ج اول ص ۱۴ پر حافظ ابن حجر نے علاوہ نووی کا کلام نقل کیا ہے "وعلٰی ھٰذا فیحمل قولہٗ ما ادخلت فی الجامع الا ما صح ای مما سقت اسنادہٗ و اللّٰہ تعالٰی اعلم. ا ھ کلامہٗ

☆ یعنی اس تقدیر پر امام بخاری کا یہ قول کہ میں نے اپنی جامع صحیح بخاری میں صرف وہی حدیثیں داخل کی ہیں جو صحیح ہیں اس امر پر محمول ہوگا کہ جن کی سند میں نے بیان کی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ علامہ نووی کا کلام ختم ہوا۔ اس کے بعد متصلاً علامہ ابن حجر فرماتے ہیں "وقد تبین مما فصلنا بہٖ اقسام تعالیقہٖ انہٗ لا یفتقر الٰی ھٰذا نحمل و ان جمیع ما فیہ صحیح باعتبار انہٗ کلہٗ مقبول لیس فیہ ما یرد مطلقًا الا النادر" مقدمہ فتح الباری ج اول ص ۱۴ یعنی تعلیقات بخاری کی جو تقسیم ہم نے بیان کی ہے اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے قول مذکور کو مما سقت اسنادہ پر محمول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ بخاری کی تمام حدیثیں اس اعتبار سے صحیح ہیں کہ وہ سب مقبول ہیں۔ ان میں کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جسے مطلقاً رد کردیا جائے سوائے نادر (حدیثوں) کے۔

☆ حیرت ہے کہ جو لوگ توثیق رواۃ پر صحت حدیث کو موقوف سمجھتے ہیں ان کے نزدیک حدیث جابر محض فتح الباری میں درج ہو جانے کی وجہ سے کیونکر صحیح ہوگئی حالانکہ اس کے راوی پر اہل نقد ونظر ائمہ حدیث کی جرح شدید موجود ہے جیسا کہ ہم تفصیل سے نقل کر چکے ہیں جس طرح ڈوبتا ہوا آدمی تنکے کا سہارا تلاش کرتا ہے بالکل اسی طرح غیر مقلدین حدیث جابر کے فتح الباری میں آ جانے کو دلیل صحت قرار دے رہے ہیں۔ بہر حال یہ قول صحت حدیث کے دلائل میں ایک شاندار اضافہ ہے۔

☆ اس کے بعد یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ غیر مقلدین بعض علماء احناف وشوافع کے اقوال بھی پیش کیا کرتے ہیں کہ علامہ عینی اور علامہ زیلعی اور اور علامہ ابن حجر رحمہم اللہ تعالیٰ نے عمدۃ القاری فتح الباری نصب الرایہ وغیرہ میں حدیث جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رمضان شریف کی تین راتوں کی نماز کا آٹھ رکعت ہونا ثابت کیا ہے۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی امر مجمل کی تفسیر اور شیء مبہم کے بیان میں فقہا محدثین کا کوئی روایت لانا اس امر کو مستلزم نہیں کہ ان کے نزدیک اس روایت کا مضمون صحیح اور واجب القبول بھی ہے۔ حضرات محدثین کا دستور ہے کہ وہ ایک امر مجمل کے بیان میں متعدد روایات وارد کردیتے ہیں۔ اسی طرح فقہا کرام ایک مسئلہ کے متعلق بعض اقوال لے آتے ہیں مگر ان روایات واقوال کا مضمون کسی علت کے باعث واجب القبول نہیں ہوتا۔

☆ اگر چہ اہل علم کے لئے یہ بات محتاجِ بیان نہیں مگر اتمام حجت کے لئے اس کی دلیل میں غیر مقلدین کے پیشوا اور مقتدا علامہ

شوکانی کا قول پیش کرتا ہوں جو نیل الاوطار میں اسی حدیث کے تحت مرقوم ہے "واما العدد الثابت عنه صلی اللّٰه علیه وسلم فی صلاته فی رمضان فاخرج البخاری وغیرہٗ عن عائشة انها قالت ما کان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم یزید فی رمضان ولا فی غیرہٖ علی احدٰی عشرة رکعة فاخرج ابن حبان فی صحیحه من حدیث جابر انهٗ صلی اللّٰه علیه واٰلهٖ وسلم صلّٰی بهم ثمان رکعات ثم اوتر." نیل الاوطار ج ۳ ص ۵۷

☆ علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی صلوٰۃ رمضان کے متعلق جو عدد حضور ﷺ سے ثابت ہے وہ حضرت عائشہ کی اس حدیث میں ہے جسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت جابر کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو آٹھ رکعتیں پڑھائیں اور پھر وتر پڑھے۔ اس کے بعد علامہ شوکانی نے بیہقی کی بیس رکعت والی حدیث نقل کی پھر فرمایا "والحاصل ان الذی دلت علیه احادیث الباب وما یشابهها وهو مشروعیة القیام فی رمضان والصلوٰة فیه جماعة وفرادٰی فقصر الصلوٰة المسمات بالتراویح علٰی عدد معین وتخصیصها بقراۃ مخصوصة لم یرد به سنة. انتہٰی نیل الاوطار ج ۲ ص ۵۸

☆ یعنی کلام کا حاصل یہ ہے کہ جس چیز پر احادیث باب اور ان کے مشابہ احادیث نے دلالت کی وہ قیام رمضان اور فی رمضان کی مشروعیت ہے۔ جماعت سے ہو یا تنہا۔ لہٰذا جس نماز کا نام تراویح ہے اسے عدد معین پر ٹھہرا دینا اور اسے قرأت مخصوصہ کے ساتھ خاص کر دینا ایسی بات ہے جس کے ساتھ سنت وارد نہیں ہوئی۔ دیکھئے جس موقع پر عینی فتح الباری، نصب الرایہ وغیرہ میں حضرت عائشہ کی گیارہ رکعت والی اور حضرت جابر کی (وتر کے علاوہ) آٹھ رکعت والی حدیث وارد ہوئی ہے بالکل اسی موقع پر نیل الاوطار میں یہ دونوں حدیثیں وارد ہیں لیکن اس کے باوجود علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ نمازِ تراویح کو عدد معین پر ٹھہرا دینا ایسی بات ہے جس کے ساتھ سنت وارد نہیں ہوئی یعنی تراویح میں عدد معین کا قول کرنا خلافِ سنت ہے۔ لہٰذا جس طرح حضور ﷺ کی تراویح کے عدد ثابت کے بیان میں ان دونوں حدیثوں کا شوکانی کے کلام میں وارد ہونا عدد معین (آٹھ رکعت) کا مثبت نہیں بالکل اسی طرح علامہ عینی حافظ ابن حجر اور علامہ زیلعی کے کلام میں بھی حدیث عائشہ وحدیث جابر کا وارد ہونا آٹھ رکعت تراویح کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ علامہ شوکانی نے "لم یرد به سنة" کہہ کر غیر مقلدین کے استدلال کا خاتمہ کر دیا کیونکہ آٹھ رکعت تراویح کے ثبوت میں غیر مقلدین کی تمام پونجی یہی دو حدیثیں تھیں لیکن شوکانی صاحب نے واضح کر دیا کہ ان دونوں حدیثوں سے آٹھ رکعت کا عدد معین ثابت نہیں ہوتا۔ والحمد للّٰه علٰی احسانه.

☆ اہل بصیرت سے یہ امر مخفی نہیں کہ حضرات ائمہ مجتہدین خصوصاً ائمہ اربعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین علم وفضل، تقویٰ وطہارت اور انابت الی اللہ کے اس بلند مقام پر فائز ہیں جس کا تصور اس زمانے میں کسی بڑے سے بڑے اہل علم اور متقی کے متعلق بھی نہیں کیا جا سکتا

اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان ائمہ کرام کا صحیح مسلک وہی تھا جس پر ان کے جانشین اور ان کے بعد ان کے جمہور مقلدین و متبعین عمل پیرا ہیں۔

☆ ایسے جلیل القدر خیار امت ائمہ اعلام کا مبارک گروہ در حقیقت مسلمانوں کا وہ طائفہ مقدسہ ہے جسے بفحوائے آیہ کریمہ "فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ." تمام امت مسلمہ کی قیادت و سیادت کا شرف حاصل ہے اور ان ائمہ ہدیٰ کے متبعین و مقلدین کی جماعت مسلمانانِ عالم کا وہ سوادِ اعظم ہے جس کا مذہب و مسلک آیت کریمہ "وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْرًا." کی روشنی میں مدارِ نجات اور معیارِ صداقت ہے اور ان کے راستے سے انحراف موجب ضلالت و غوائت اور جہنم رسید ہونے کا باعث ہے۔

☆ لیکن شرذمہ قلیلہ و طائفہ حقیرہ کے معدودے چند افراد ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کے ان مقدس اور محبوب بندوں کو از راہِ عناد ہدف تیر ملامت بناتے رہے ہیں چنانچہ اب بھی غیر مقلدین کا گروہ قلیل حضرات مجتہدین ائمہ اربعہ خصوصاً امام الائمہ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و عنہم اجمعین اور ان کے مقلدین و متبعین کے حق میں زبان طعن دراز کر رہا ہے۔ کبھی انہیں اہل رائے کہا جاتا ہے کبھی ان کے مسائل مذہبیہ کو احادیث صحیحہ کے خلاف قرار دے کر انہیں مطعون کیا جاتا ہے اور بسا اوقات یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ان کے استدلال کی بنیاد احادیث ضعیفہ اور اقوال مرجوحہ ہیں۔

☆ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان معترضین نے آج تک ان ائمہ ہدیٰ کے اصول کو نہیں سمجھا۔ کاش یہ لوگ تعصب سے دور رہ کر ان کے قواعد مذہب اور اصول استدلال کو سمجھ لیتے تو شاید اس دریدہ دہنی کی جرأت نہ کرتے۔ اس مختصر رسالے میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم ان تمام امور پر تفصیلی بحث کریں۔ البتہ صرف ایک امر کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور وہ یہ کہ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی ایسی حدیث سے استدلال نہیں کیا جو ان کی نظر میں ضعیف ہو اور اس کی تقویت دیگر احادیث یا اقوال صحابہ یا ان کے اعمال یا اہل علم کے تعامل یا کسی دوسری دلیل شرعی سے نہ ہو گئی ہو اور محدثین کرام اس پر متفق ہیں کہ حدیث ضعیف طریق مذکورہ میں سے کسی طریقہ سے مؤید و معتمد ہو جائے تو وہ قابل احتجاج ہے۔

كما لا يخفٰى على من لهٗ ادنٰى معرفة فى فن الحديث

☆ باب تراویح میں رسول اللہ ﷺ کا رمضان شریف میں بیس رکعت تراویح پڑھنا اگرچہ بسند ضعیف ثابت ہے لیکن چونکہ اس کا مضمون تعامل صحابہ اور اقوال علماء اور جمہور امت کے توافق سے مؤید ہو چکا ہے اس لئے اس سے دلیل لانا اصول محدثین کے موافق صحیح اور درست ہے بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ بیس رکعت تراویح کی حدیث مرفوع مذکور کے ثابت الاصل اور مستدل بہ ہونے کا قول کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ان تمام صحابہ سلف صالحین ائمہ مجتہدین اور جمہور علماء امت مسلمہ کو سنت نبوی کے مخالفین میں شمار کرنا پڑے گا جن کا عمل اس حدیث کے مطابق ہونا غیر مقلدین کے نزدیک بھی مسلم ہے۔

☆ علم حدیث کے ماہرین سے یہ امر مخفی نہیں کہ کسی حدیث کا فی الواقع ثابت الاصل اور صحیح ہونا صحت اسناد پر موقوف نہیں۔ ممکن ہے کہ صحت اسناد کے باوجود کوئی حدیث واقع میں صحیح نہ ہو۔ (کما قال ابن الصلاح)

☆ جب صحت اسناد پر صحت حدیث موقوف نہیں تو ضعف اسناد پر ضعف حدیث کا مدار کیونکر ہو سکتا ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ موضوعات کبیر ص ۱۵ میں اسی موضوع پر اثنائے کلام میں فرماتے ہیں "فلا مطمع للقطع فی مقام الاسناد لتجویز العقل ان یکون الصحیح فی نفس الامر ضعیفا او موضوعًا والموضوع صحیحا مرفوعا الا الحدیث المتواتر فانہٗ فی افادۃ العلم الیقینی یکون مقطوعا ولذا قال الزرکشی بین قولنا لم یصح وقولنا موضوع بون بین فان الوضع اثبات الکذب وقولنا لم یصح انما ھو اخبار عن عدم الثبوت ولا یلزم منہ اثبات العدم۔"

☆ مقام اسناد میں یقین کے لئے امید کا کوئی موقع نہیں یعنی محض سند کے پیش نظر کسی حدیث کو یقینی طور پر صحیح کہہ دینا ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عقلاً جائز ہے کہ کوئی صحیح حدیث ضعیف یا موضوع ہو اور اسی طرح حدیث موضوع حقیقۃً صحیح مرفوع ہو۔ سوائے حدیث متواتر کے کہ وہ علم یقینی کا فائدہ دینے میں قطعی ہے۔ اسی لئے علامہ زرکشی نے فرمایا کہ ہمارے قول "لم یصح" اور موضوع میں بڑا فرق ہے۔ اسلئے کہ وضع، اثبات کذب ہے اور "لم یصح" صرف عدم ثبوت کی خبر دیتا ہے اور اس سے اثبات عدم لازم نہیں آتا۔

☆ اسی طرح ابن قیم جوزیہ نے ایک حدیث کے متعلق کہا "وان صحح بعض الناس سندہٗ فالحس تشھد بوضعہٖ" یعنی اگرچہ بعض لوگوں نے اس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے لیکن قوتِ حاسہ اس کے موضوع ہونے کی شہادت دیتی ہے۔ معلوم ہوا کہ محض سند پر ثبوت و وضع کا مدار نہیں۔

☆ اہل علم کے نزدیک تو یہ امر بھی قابل انکار نہیں ہو سکتا کہ بصیرت کا ملہ رکھنے والے علمائے راسخین کسی حدیث کے موضوع اور غیر موضوع ہونے کی معرفت حاصل کرنے کے لئے سند کے محتاج نہیں ہوتے۔

☆ دیکھئے ملا علی قاری موضوعات کبیر ص ۸۹ پر فرماتے ہیں "وقد سئل ابن القیم الجوزیۃ ھل یمکن معرفۃ الحدیث الموضوع بضابطۃ من غیر ان ینظر فی سندہٖ فقال ھذا سوال عظیم القدر وانما یعرف ذٰلک من یطلع فی معرفۃ سنن الصحیحۃ وخلطت بلحمہٖ ودمہٖ وصار لہٗ فیھا ملکۃ واختصاص شدید بمعرفۃ السنن والاٰثار ومعرفۃ سیرۃ رسول اللّٰہ علیہ الصلوٰۃ والسلام وھدیہٖ فیما یأمر بہٖ وینھٰی عنہ ویخبر عنجہ ویدعوا الیہ ویحبہ ویکرھہٗ ویشرعہٗ للامۃ بحیث کانہٗ مخالط لہٗ علیہ الصلوٰۃ والسلام بین اصحابہ الکرام فمثل ھذا یعرف من احوالہٖ وھدیہٖ وکلامہٖ واقوالہٖ وافعالہٖ وما یجوز ان یخبر بہٖ وما لا یجوز مالا یعرفہٗ غیرہٗ وھٰذا شان کل متبوع مع تابعہٖ۔ اھ

☆ ابن قیم جوزیہ سے دریافت کیا گیا کیا یہ ممکن ہے کہ حدیث موضوع کو کسی ضابطہ کے ساتھ معلوم کر لیا جائے اس کے بغیر کہ اس کی

سند میں نظر کی جائے تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ ایک عظیم الشان سوال ہے۔ سند دیکھے بغیر کسی حدیث کے موضوع ہونے کو وہی شخص جان سکتا ہے جو معرفت سنن صحیحہ کے بلند مقام پر فائز ہو اور سنن صحیحہ کی معرفت اس کے گوشت اور خون کے ساتھ مخلوط ہو گئی ہو اور اسے ان کی معرفت میں عظیم ملکہ پیدا ہو گیا ہو اور معرفت سنن و آثار و معرفت سیرت و خصلت رسول اللہ ﷺ میں اختصاص شدید حاصل ہو چکا ہو اور حضور ﷺ کے امر و نہی، اخبار و دعوت، حب کراہت اور امت مرحومہ کے لئے احکام شروعہ سے متعلق تمام امور میں حضور ﷺ کی سیرت و خصلت مبارکہ سے پوری طرح واقف ہو اور اس کو یہ حیثیت حاصل ہو جائے کہ گویا وہ صحابہ کرام کی معیت میں نبی کریم ﷺ کی ذاتِ مقدسہ کے ساتھ اختلاط کامل رکھتا ہے تو اس جیسا آدمی حضور ﷺ کے احوال اور کلام مبارک اور تمام اقوال و احوال مبارکہ کو صحیح معنی میں پہچان سکتا ہے اور اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ کون سی چیزوں کے متعلق حضور ﷺ کا خبر دینا جائز ہے اور کون سی چیزوں سے خبر دینا حضور ﷺ کے حق میں جائز نہیں۔ یہ امور اس قبیل سے ہیں جسے مذکورہ بالا اوصاف سے متصف ہونے والے علماء راسخین و کاملین کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں جان سکتا اور ہر متبوع کی اپنے تابع کے ساتھ یہی شان ہوتی ہے۔

☆ ایسی صورت میں اگر امام اعظم جیسا اہل بصیرت انسان دلائل و قرائن کی روشنی میں حق کو باطل سے ممتاز کر کے حق کو قبول کر لے اور باطل سے کنارہ کر لے تو کیا وہ کسی ذی شعور کے نزدیک مستحق طعن ہو سکتا ہے۔

☆ بنا بریں اگر بفرض محال یہ تسلیم ہی کر لیا جائے کہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعض مسائل فقہیہ صحیح حدیثوں کے خلاف ضعیف حدیثوں پر مبنی ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ احادیث جو محدثین کے نزدیک صحیح الاسناد ہیں۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہِ بصیرت میں نصوص قرآنیہ اقوال صحابہ کرام، تعامل اہل علم و دیگر دلائل شرعیہ کی موجودگی میں فی الواقع غیر صحیح اور نا قابل احتجاج ہوں۔ علیٰ ہٰذا القیاس جن احادیث کو محدثین نے اپنے مقرر کردہ معیار کے مطابق ضعیف اور نا قابل احتجاج قرار دیا ہے امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اصول و معیار کے موافق وہ احادیث فی الواقع صحیح اور قابل احتجاج ہوں مگر اس بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہمارے نزدیک علم الاسناد بے معنی ہے۔ اسناد کا مقصد کذب و افتراء اور وضع احادیث کے طوفان کو روکنا اور اس باب میں دجل و فریب کی راہوں کو بند کرنا ہے نہ یہ کہ اسناد کے سامنے تمام دلائل قرآنیہ اور قرائن و شواہد قطعیہ کو پس پشت ڈال کر فہم و فراست کو بھی بالائے طاق رکھ دیا جائے۔

☆ حجت و عدم حجیت حدیث میں سند کے علاوہ تمام دلائل شرعیہ سے بے نیاز ہو جانا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ روایت کو درایت کے ساتھ ملحوظ نہ رکھنا انتہائی نادانی اور سخت حماقت کی دلیل ہے۔

☆ سمجھ میں نہیں آتا کہ بکثرت احادیث بعض محدثین کے نزدیک صحیح ہیں اور بعض کے نزدیک غیر صحیح۔ اسی طرح بے شمار رواۃ حدیث بعض ارباب نقد و نظر کی رائے میں مجروح اور غیر ثقہ ہیں اور بعض کے نزدیک معدل و ثقہ لیکن اس اختلاف رائے کی وجہ سے کسی ایک کو بھی موردِ الزام قرار نہیں دیا جاتا۔ خدا جانے امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معترضین کا کیا بگاڑا ہے کہ یہ لوگ ان کے حق میں طعن و تشنیع سے باز نہیں آتے۔

☆ علم حدیث سے ذوق رکھنے والے حضرت خوب جانتے ہیں کہ امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد وغیرہ محدثین کرام کے مابین صحت حدیث کے شرائط میں اختلاف شدید ہے۔ ایک حدیث ابوداؤد کے نزدیک صحیح ہے مگر امام بخاری اس کی صحت کے قائل نہیں۔ اس صورت میں اگر امام بخاری حدیث سے استدلال نہ کریں تو انہیں حدیث صحیح کا مخالف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دیکھئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح بخاری کو حمد الٰہی سے شروع نہیں کیا حالانکہ ابن ماجہ کی صحیح حدیث میں وارد ہے "کل امر ذی بال لم یبداء فیہ بالحمد فھو اقطع" (جو مہتم بالشان کام حمد الٰہی سے شروع نہ کیا جائے وہ نا تمام ہے) "رواہ ابن حبان و ابو عوانۃ فی صحیحھما وقال ابن الصلاح ھذا حدیث حسن بل صحیح" عینی ج ۱ ص ۱۵۔ لیکن صحت حدیث کے باوجود امام بخاری نے اس پر عمل نہیں کیا جس کا ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ یہ حدیث امام بخاری کی شرط پر نہیں اس لئے انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا عینی میں ہے "الاول ان الحدیث لیس علی شرطہ" (عینی ج ۱ ص ۱۲) پہلا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث امام بخاری کی شرط پر نہیں۔ اگرچہ علامہ عینی نے اس پر اور اس کے علاوہ تمام جوابات پر اعتراضات کیے ہیں لیکن ظاہر پرستوں نے یہ امر بہرحال تسلیم کر ہی لیا کہ جو حدیث کسی محدث کی شرط پر نہ ہو وہ اس پر عمل نہیں کیا کرتا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں آج تک اس اصول کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی تعصب اور عناد کی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

☆ تعجب ہے کہ غیر مقلدین امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر احادیث صحیحہ کے ترک کا الزام لگاتے ہیں حالانکہ امام بخاری اور امام مسلم جیسے جلیل القدر محدثین نے بکثرت ایسی احادیث کو چھوڑ دیا جو ان کے مقرر کردہ شرائط کے مطابق بالکل صحیح ہیں۔ حتیٰ کہ دیگر محدثین مثلاً دار قطنی وغیرہ نے بعض اوقات شیخین پر الزام بھی عائد کیا کہ فلاں حدیث ان کے مجوزہ معیار کے موافق صحیح ہے پھر انہوں نے اسے کیوں ترک کیا جس کے جواب میں آج تک یہی کہا جاتا ہے کہ اگرچہ وہ حدیثیں شیخین کی شرط پر صحیح ہیں لیکن یہ دونوں بزرگ (بخاری و مسلم) فن حدیث میں وہ نگاہِ دوربین رکھتے ہیں جس سے ان احادیث میں انہیں کوئی ایسی بات نظر آئی جس کی وجہ سے اپنی صحیحین میں ان احادیث کو درج نہیں کیا تو کیا یہ ممکن نہیں کہ شیخین سے زیادہ اہل بصیرت مثلاً امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی نگاہِ اجتہاد اور نورِ فراست کی روشنی میں صحیحین کی بعض احادیث میں کوئی امر معلوم کر لیا ہو جس کی بنیاد پر ان سے استدلال کرنا پسند نہ فرمایا پھر ان پر طعن کرنا اپنی عاقبت خراب کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

☆ غیر مقلدین امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں کچھ بھی کہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محدثین متاخرین مثلاً امام بخاری امام مسلم وغیرہما رضی اللہ عنہم اجمعین امام موصوف کے خوشہ چیں اور ان کے واسطہ در واسطہ شاگردوں سے مستفیض ہیں۔ نیز یہ کہ ان محدثین کی اسانید کیسی ہی عالی کیوں نہ ہوں لیکن فقاہت و درایت میں امام اعظم رضی اللہ عنہ کی اسانید کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور یہ کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ خود تابعی اور کبار تابعین کے دور میں ہونے کی وجہ سے عہد رسالت سے بہت قریب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سند حضور رسالت مآب ﷺ کی تک پہنچنے میں چار واسطوں سے متجاوز نہیں ہوتی اور

اکثر و بیشتر صرف دو واسطوں (ایک تابعی اور ایک صحابی) سے آپ کی سند رسول اللہ ﷺ تک پہنچ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تابعین کا دور مشہود لہ بالخیر ہے اس لئے ان کی اکثریت ثقہ ہے اور صحابی کے ثقہ ہونے میں تو آج تک کسی نے کلام ہی نہیں کیا۔ "الصحابة كلهم عدول في الرواية" اس لئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اسانید و روایات کو ضعیف اور نا قابل احتجاج کہنا گویا آفتاب کا منہ چڑانا ہے۔ ثلاثیات بخاری کے مقابلے میں ثنائیات بلکہ واحدانیات ابوحنیفہ کو نظر انداز کر دینا دنیا میں کتمان حق کی بدترین مثال ہے۔

☆ اب ہم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی چند اسانید پیش کرتے ہیں جن سے ناظرین کرام کو ہمارے بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

اسانید امام اعظم ابو حنیفه رضی الله تعالیٰ عنه

(۱) روی ابو حنيفة عن حماد عن ابراهيم النخعي عن علقمة عن عبد اللّٰه بن مسعود قال كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يعلمنا معشر الصحابة الاستخارة. (شرح مسند امام اعظم ص ۹)

(۲) روی ابو حنيفة عن عماد عن ابراهيم عن الاسود عن عائشة عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم انهٔ قال ان اللّٰه تعالٰى يكتب للانسان الدرجة العليا في الجنة. (الحدیث شرح مسند ص ۸)

(۳) روی ابو حنيفة عن حماد عن ابراهيم عن الاسود بن يزيد ان عمر بن الخطاب دخل على النبي صلى اللّٰه تعالٰى عليه وسلم. (الحدیث شرح مسند ص ۵)

(۴) روی ابو حنيفة عن عطاء ابن يسار عن ابن عمر عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم انه نهٰى عن بيع الولاء. (ص ۱۰۴ شرح مسند)

(۵) روی ابو حنيفة عن عطاء ابن يسار عن ابی سعيد الخدری قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ان اللّٰه وملٰئكته يصلون على الذين يصلون الصفوف ولا يقطعوها. (ص ۱۰۴ شرح مسند)

(۶) روی ابو حنيفة عن الزهری عن انس ان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم احتجم وهو صائم. (ص ۱۰۴)

(۷) روی ابو حنيفة عطاء عن ابی هريرة قال كان لرسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قلنسوة بيضاء شامية. (ص ۷۷ شرح مسند)

(۸) روی ابو حنيفة عن عطية بن سعد الكوفي عن ابی سعيد الخدری قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لا يشكر اللّٰه من لا يشكر الناس. (ص ۱۴۴ شرح مسند)

(۹) روی ابو حنيفة عن عبد اللّٰه بن دينار عن ابن عمر قال سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الوتر اول الليل. مسخطة الشيطان. الحدیث (ص ۱۱۵ شرح مسند)

(۱۰) روی ابو حنيفة عن انس ابن مالک قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم طلب العلم فريضة علٰى

کل مسلم۔ (الحدیث ص ۴۸۵ شرح مسند)

(۱۱) روی ابو حنیفة عن انس قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الدال علی الخیر کفاعله۔ (ص ۴۸۵ شرح مسند)

اسانید مذکورہ میں صحابہ کرام کے علاوہ دیگر رواۃ کی توثیق کتب معتبرہ سے پیش کرتا ہوں کیونکہ صحابہ کرام کے عادل اور ثقہ ہونے میں تمام امت مسلمہ متفق ہے۔

(۱) عطا ابن یسار ...... ثقة فاضل۔ تقریب التهذیب ص ۳۶۲

(۲) محمد بن مسلم بن عبید اللّٰه بن عبد اللّٰه بن شهاب بن عبد اللّٰه بن الحارث بن زهره بن کلاب القرشی الزهری و کنیته ابو بکر الفقیه الحافظ متفق علی جلالته و اتقانه وثبته وهو من رؤس الطبقة الرابعة۔ (تقریب التہذیب ص ۴۷۰)

(۳) حماد دبن ابی سلیمان کے تحت مرقوم ہے قال معمر ما رایت افقهٔ من هؤلاء الزهری و حماد وقتادة وقال بقیة قلت لشعبة حماد بن ابی سلیمان قال کان صدوق اللسان۔ (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۶)

(۴) ابراهیم بن سوید النخعی قال العجلی ثقة و ذکره ابن حبان فی الثقات۔ (تہذیب التہذیب ج اول ص ۱۲۷)

(۵) علقمه قال اسحٰق بن منصور عن ابن معین ثقة وقال ابن المدینی اعلم الناس بعبد اللّٰه علقمة والاسود و عبیدة والحارث۔ (تہذیب التہذیب ج ہفتم ص ۲۷۷)

(۶) عطیه و کان ثقة ان شاء اللّٰه تعالٰی ولهٗ احادیث صالحة۔ (تہذیب التہذیب ج ہفتم ص ۲۲۶)

(۷) عبد اللّٰه بن دینار قال صالح بن احمد عن ابیه ثقة مستقیم الحدیث وقال ابن معین و ابو زرعة وابو حاتم ومحمد بن سعدو النسائی ثقة۔ (تہذیب التہذیب ج پنجم ص ۲۰۲)

(۸) اسود بن یزید قال ابو طالب عن احمد ثقة من اهل الخیر وقال اسحٰق عن یحیٰی ثقة وقال ابن سعد کان ثقة ولهٗ احادیث صالحة۔ (تہذیب التہذیب ج اول ص ۳۴۲)

☆ اس مقام پر دو باتیں خاص طور پر ملحوظ رہیں ایک یہ کہ معاصرہ کا عنعنہ مطلقاً سماع پر محمول ہوتا ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملاقات اپنے مشائخ سے بلا شبہ ثابت ہے لہٰذا آپ کی اسانید میں عنعنہ یقیناً سماع پر محمول ہے۔

☆ دوسری یہ کہ بقول علامہ ابن حجر عسقلانی امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو پایا ہے اور ابن سعد نے بسند معتبر روایت کیا کہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت انس بن مالک صحابی رسول اللہ ﷺ کو دیکھا۔ اس وقت وہاں کے شہروں میں حضرت انس کے علاوہ بھی متعدد صحابہ کرام بقید حیات تھے اور ابن حجر مکی نے شرح مشکوٰۃ میں فرمایا کہ امام اعظم ابو حنیفہ رضی

اللہ تعالیٰ عنہ نے آٹھ صحابہ کرام کو پایا جن میں حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی، حضرت سہل بن سعید، حضرت ابو الطفیل بھی شامل ہیں۔ حضرت انس کے زمانہ میں امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر کم از کم نو دس سال تھی۔ مذکورہ بالا دونوں باتوں کے ذیل میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ شرح مسند امام اعظم لملا علی القاری ص ۲۸۴ اور ص ۲۸۵ سے منقول ہے۔

☆ اسکے بعد یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اسانید کے اس نقشہ سے حسب ذیل امور واضح ہیں۔

۱۔ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ خود بلا واسطہ بھی صحابی سے روایت کرتے ہیں اگر چہ وہ روایات ہم تک شاذ و نادر ہی پہنچی ہوں۔

۲۔ امام اعظم اور صحابی کے درمیان تین واسطے ہیں اور اکثر و بیشتر صرف ایک یا دو۔

۳۔ امام صاحب کی سند زیادہ سے زیادہ چار واسطوں سے رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہے اور اگر امام صاحب خود صحابی سے روایت کریں تو ظاہر ہے کہ امام صاحب اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک ہی واسطہ ہوتا ہے۔

۴۔ امام صاحب کے مشائخ رواۃ حدیث نہایت افضل وثقہ بہترین فقیہ اور اعلیٰ درجہ کی روایت سے متصف ہیں۔

۵۔ امام اعظم رضی اللہ عنہ کے عام رواۃِ حدیث خصوصاً حضرت حماد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت و فقاہت اس واقعہ سے بہت زیادہ روشن ہو جاتی ہے جسے حضرت ابی عیینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا اور صاحب فتح القدیر امام بن ہمام و دیگر محققین کرام نے اسے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے فتح القدیر مطبوعہ مصر ج اول ص ۲۷۰

وذٰلک انہٗ اجتمع مع الاوزاعی بمکۃ فی دار الحناطین کما حکی ابن عیینۃ قال الاوزاعی مابالکم لا ترفعون عند الرکوع والرفع منہ فقال لاجل انہٗ لم یصح عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیہ شیء فقال الاوزاعی کیف لم یصح وقد حدثنی الزھری عن سالم عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یرفع یدیہ اذا افتتح الصلوٰۃ وعند الرکوع وعند الرفع منہ فقال ابو حنیفۃ حدثنا حماد عن ابراھیم عن علقمۃ والاسود عن عبد اللہ بن مسعود ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان لا یرفع یدیہ الا عند افتتاح الصلوٰۃ ثم لا یعود لشیء من ذٰلک فقال الاوزاعی احدثک عن الزھری عن سالم عن ابیہ وتقول حدثنی حماد عن ابراھیم فقال ابو حنیفۃ کان حماد افقہ من الزھری وکان ابراھیم افقہ من سالم وعلقمۃ لیس بدون عن ابن عمر فی الفقہ وان کان لابن عمر صحبۃ ولہٗ فضل صحبۃ فالاسود لہٗ فضل کثیر وعبد اللّٰہ فعبد اللّٰہ فرجح بفقہ الرواۃ کما رجح الاوزاعی بعلوا الاسناد وھو المذھب المنصور عندنا انتھی۔

خلاصہ و ترجمہ: وہ واقعہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ امام اوزاعی کے ساتھ مکہ معظمہ میں خوشبو فروشوں کی حویلی میں جمع ہوئے۔ جیسا کہ ابن عیینہ نے بیان کیا ہے۔ امام اوزاعی کہنے لگے آپ لوگوں کا کیا حال ہے کہ رکوع کرتے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے آپ رفع یدین نہیں کرتے۔ امام ابو حنیفہ نے جواب دیا ہم رفع یدین اس لئے نہیں کرتے کہ اس بارہ میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی شے صحیح روایت نہیں ہوئی۔ امام اوزاعی نے فرمایا کیسے صحیح نہیں ہوئی، حالانکہ مجھ سے زہری نے حدیث بیان کی اور زہری نے سالم سے اور سالم نے اپنے والد ماجد حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نماز شروع فرماتے وقت رفع یدین فرماتے تھے اور اسی

طرح رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت۔ اس کے جواب میں امام اعظم ابوحنیفہ نے فرمایا کہ ہم سے حماد نے حدیث بیان فرمائی۔ حماد نے ابراہیم نخعی سے اور ابراہیم نخعی نے علقمہ اور اسود سے اور ان دونوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ صرف نماز شروع فرماتے وقت رفع یدین فرماتے تھے۔ پھر اس کے بعد اس سے کسی شے کے لئے رفع یدین کا اعادہ نہ فرماتے تھے۔ امام اوزاعی نے فرمایا میں آپ سے وہ حدیث بیان کر رہا ہوں جو بطریق زہری عن سالم عن عبداللہ بن عمر مروی ہے اور آپ میرے سامنے وہ حدیث پیش کر رہے ہیں جو بطریق حماد عن ابراہیم روایت ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا، حماد زہری سے زیادہ فقیہ تھے اور ابراہیم نخعی کو سالم سے کہیں زیادہ فقاہت حاصل تھی اور علقمہ فقہ میں ابن عمر سے کم نہیں اگرچہ عبداللہ بن عمر کو صحابیت کا شرف حاصل ہے ان کی صحابیت فضیلت مسلم، مگر اسود کے لئے بھی فضل کثیر ثابت ہے اور عبداللہ بن مسعود کا کیا کہنا وہ تو عبداللہ بن مسعود ہیں جو عبادلہ متعارفین سے افضل ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے یہ جواب دے کر فقہ رواۃ کے ساتھ اپنی حدیث کو راجح کر دیا جیسا کہ امام اوزاعی نے علو اسناد کیساتھ اپنی حدیث کو راجح کیا تھا اور ہمارے نزدیک فقہ رواۃ کے ساتھ حدیث کا راجح ہونا ہی مذہب منصور ہے۔

☆ یہی واقعہ کفایہ شرح ہدایہ میں بھی مرقوم ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں "فسکت الاوزاعی" یعنی جب امام صاحب نے اپنی حدیث کی ترجیح فقہ رواۃ کے ساتھ ثابت کی تو امام اوزاعی خاموش ہو گئے۔ ملاحظہ فرمائیے کفایہ ج اول ص ۱۷۴ مطبوعہ مصر۔

☆ رہا یہ امر کہ بعض محققین نے امام ابوحنیفہ اور ان کے بعض رواۃ پر جرح کی ہے تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ جس جرح کی بنیاد محض تعصب ہو اس کا وزن اہل انصاف کے نزدیک پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا۔ متعصبین کے ہاتھوں سے تو کوئی بڑے سے بڑا جلیل القدر امام اور محدث آج تک محفوظ نہیں رہا پھر کسی کو بھی معتبر نہ مانیئے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت شان سب کے نزدیک مسلم ہے مگر ان کی صحیح بخاری کے راویوں کو مجروح کئے بغیر نہیں چھوڑا گیا۔ یقین نہ ہو تو ایک مختصر سا نقشہ اس کا بھی ملاحظہ ہو۔

(۱) احمد بن بشير الكوفي ابو بكر مولى عمرو بن حريث المخزومي "قال النسائي ليس بذالك القوى وقال عثمان الدارمي متروك"

(۲) احمد بن شبيب بن سعيد الحبطي "قال ابو الفتح الازدي منكر الحديث" مقدمه فتح الباري ج ۲ ص ۱۲

(۳) احمد بن عاصم البلخي "قال ابو حاتم الرازي مجهول (قلت) روى عنه البخاري حديثا واحدا في كتاب الرقاق وهو في رواية المستملي وحده۔ مقدمه فتح الباري ج ۲ ص ۱۱۳

(۴) اسماعيل بن ابى اويس عبد الله بن عبد الله بن اويس بن مالك بن ابى عامر الاصبحي روى له الباقون سوى النسائي فانه اطلق القول بضعفه وروى عن سلمة بن شبيب ما يوجب طرح روايته واختلف فيه قول ابن معين فقال مرة لا بأس به وقال مرة ضعيف وقال مرة كانه يسرق الحديث هو وابوه (ص ۱۱۷)

(۵) اسيد بن زيد الجمال قال النسائي متروك، وقال ابن معين حديث باحاديث كذب و ضعفه الدار قطني، وقال ابن عدى لا يتابع على روايته، وقال ابن حبان يروى عن الثقات المناكير ويسرق الحديث، وقال البزار احتمل حديثه مع شيعية شديدة فيه، وقال ابو حاتم رايتهم يتكلمون فيه، قلت لم ارلا حد فيه توثيقا (ص ۱۱۷)

(۶) اوس بن عبد الله الربعي ابو الجوزاء، ذكره ابن عدى في الكامل و حكى عن البخارى انه قال في اسناده نظر و يختلفون فيه ثم شرح ابن عدى مراد البخارى فقال يريد انه لم يسمع من مثل ابن مسعود و عائشة وغيرهما لانه ضعيف عنده قلت اخرج البخارى له حديثا واحدا من روايته

عن ابن عباسٍ قال کان اللات رجلایلت السویق وروی له الباقون (ص ۱۱۷ ج ۲)

(۷) زکریا بن یحیٰی بن عمر بن حصین بن حمید بن منهب الطائی ابو السکین من شیوخ البخاری تکلم فیه الدار قطنی فقال مرة لیس بالقوی وقال مرة متروک وقال الحاکم یخطئی فی احادیث وقال الخطیب ثقة (ص ۱۲۸) مقدمه فتح الباری ج ۲

(۸) سلمة بن رجاء التمیمی ابو عبد الرحمٰن الکوفی قال ابن معین لیس بشیء وضعفه النسائی (ص ۱۳۱، ج ۲)

(۹) عبد ربه بن نافع الکنانی ابو شهاب الخیاط الکوفی نزیل المدائن قال یعقوب بن شیبة تکلمو فی حفظه وقال النسائی لیس بالقوی (ص ۱۴۰ ج ۲)

(۱۰) یحیٰی بن ابی زکریا الغسانی الواسطی ابو مروان ضعفهٗ ابو داؤد وقال ابن معین لا اعرف حالهٗ وقال ابو حاتم لیس بالمشهور وبالغ ابن حبان فقال لا تجوز الروایة عنهٗ (قلت) اخرج له البخاری حدیثاً واحداً عن هشام عن ابیه عن عائشة فی الهدیة وقد توبع علیه عنده (ص ۱۷۱، ج ۲)

(۱۱) الحرث بن عبید ابو قدامه مشهور بکنیته وباسمه ضعفهٗ ابن معین

(۱۲) الحرث بن عمیر المکی اصلهٗ من البصرة وثقه الجمهور وشذ لازدی فضعفهٗ وتبعه الحاکم وبالغ ابن حبان فقال ان احادیثه موضوعة ولیس له فی الصحیح سوی موضع واحد فی اواخر الحج الخ (ص ۱۷۶ ج ۲)

☆ اس میں شک نہیں کہ بعض محدثین نے ان کی توثیق بھی کی ہے اور ہمارے نزدیک وہ توثیق بالکلیہ ساقط الاعتبار نہیں مگر ان غیر مقلدین پر سخت تعجب اور افسوس ہے جو صحیح بخاری کے مجروح رواۃ کو معتبر نہیں مانتے ہیں مگر امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اسانید اور ان کے مذہب کی مؤیداحادیث کے راویوں کے حق میں خفیف جرح اور معمولی کلام کو بھی توثیق پر مقدم رکھ کر زبان طعن و تشنیع دراز کرتے اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم گروہ احناف اور جمہور امت مسلمہ کی دل آزاری کرتے ہیں۔